بڑی زبان کا زندہ رسالہ

ذہنِ جدید

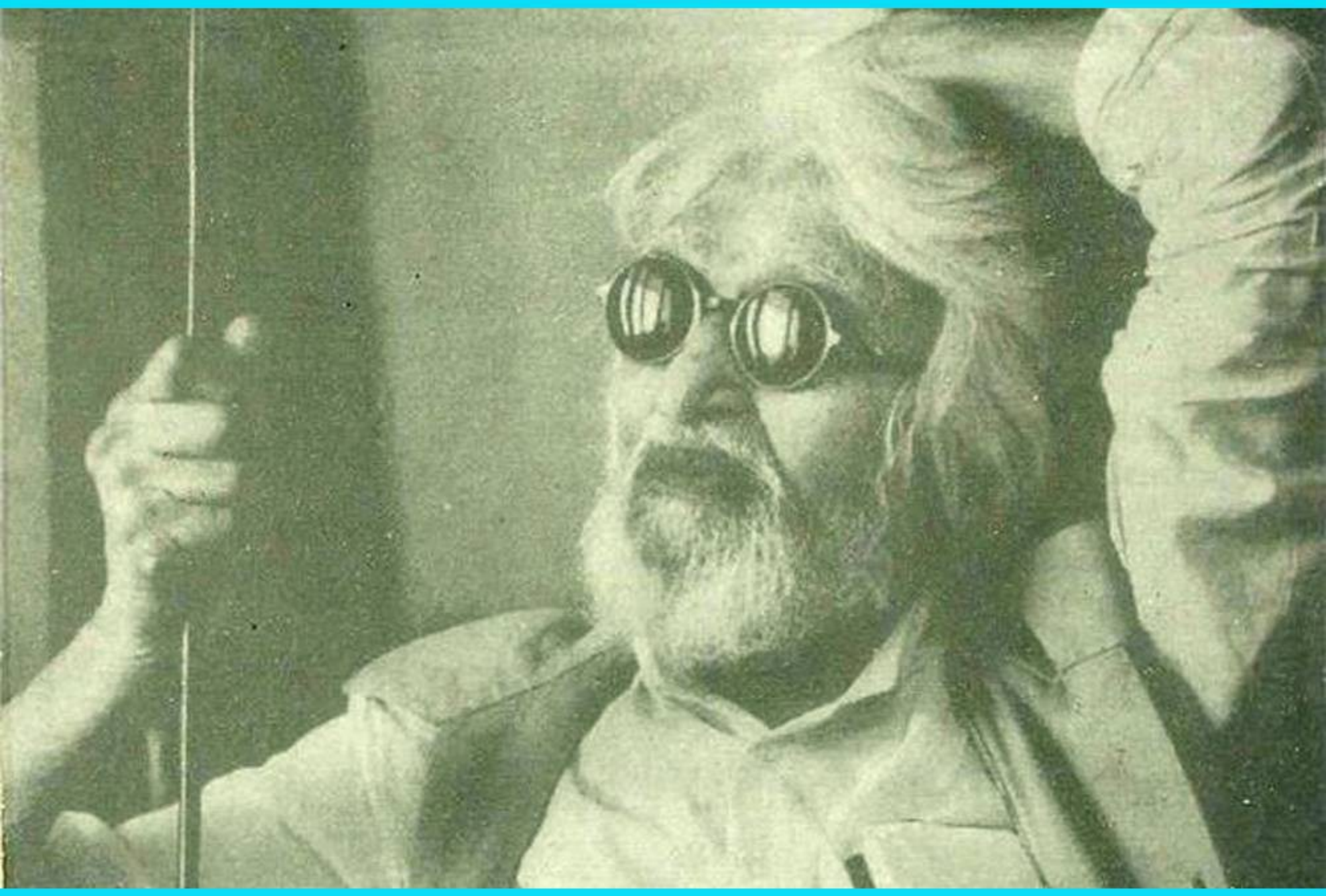

- اس بار خصوصی پیش کش 'اردو شاعروں کا البم' امیر خسرو سے جانثار اختر تک پچاس شاعروں کے سوانحی احوال اور نمونہ کلام محفوظ رکھنے لائق ادبی دستاویز
- فراق گورکھپوری کا اہم اور تاریخ ساز 'اردو غزل گوئی' والا مضمون
- مایہ ناز پینٹر ایم ایف حسین پر خصوصی گوشہ

اور استاد علی اکبر سرود نواز اور گنگو بائی ہنگل پر مضامین

مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

سہ ماہی **ذہنِ جدید** ترتیب • زبیر رضوی

ZEHNE JADID
C-2, AB Complex,
179/8, Zakir Nagar,
New Delhi - 110025 INDIA
Ph. 0091-11-26983804
e-mail: zehnejadid@gmail.com
Editor: Jamshed Jahan

Jun. 09 to Aug. 09
ISSUE 54 Vol XIX
Four Issues: Rs. 180/- 25$ US
Library Edition:Rs. 220/-
(For Four Issues)

مدیر • جمشید جہاں
• قانونی مشیر: سیّد کامران رضوی ایڈوکیٹ

جلد:۱۹ شمارہ:۵۴
جون ۲۰۰۹ تا اگست ۲۰۰۹ء

• قیمت
فی پرچہ • ۴۵/روپے
چار شمارے • ۱۸۰/روپے
لائبریریوں سے • ۲۲۰/روپے
(مجلد چار شمارے)
• بیرونی ممالک سے
فی پرچہ • چھ ڈالر امریکی
چار شمارے • پچیس ڈالر امریکی

• کمپوزنگ و ڈیزائنگ • روح اللہ فرہاد

• ترسیل زر اور رجسٹرڈ ڈاک کے لیے پتہ:
C-2, AB Complex, 179/8, Zakir Nagar, New Delhi- 110025
• سادہ ڈاک کے لیے: پوسٹ بکس 9789، نیو فرینڈس کالونی نئی دہلی-۲۵

• 'ذہنِ جدید' کے لیے بیرونِ ہند ترسیل زر اور رابطے:

• Dr. Bedar Bakht
21-Whiteleaf cresecent
Scarborough, ONTARIO
Canada MIV 3G1
e-mail:bbakht@rogers.com

• Dr. Fareha Razvi
2224-U Street
UNL Family Housing
Linclon 68503 NE - U.S.A.
e-mail: rfareha@yahoo.com
R N 50779/90

U
070
29Z54
2009

www.taemeernews.com

فہرست

• **الف**	مرتب	5
• **اردو شاعروں کا البم**	خصوصی پیشکش	6
(امیر خسرو سے جاں نثار اختر تک		
شاعروں کے احوال اور نمونہ کلام)	ترتیب/زبیر رضوی	7-70
• **افسانے**		
بھوت	عبدالصمد	71
سوفوکلس	یراحمد	85
پنوتھئی (تامل کہانی)	بلقیس ظفیر الحسن	96
• **مضمون**		
منیب الرحمٰن کی شاعری کی کچھ جہات	زاہدہ زیدی	103
• **نظمیں**		
تالی اور ایک سوال	محمد یحییٰ جمیل	110
طویل نظم صادقہ کے تازہ حصے	زبیر رضوی	111
• **غزلیں**		114-118
امین اشرف، شکیب ایاز، رونق شہری، طارق متین، راشد طراز، فہیم جاوید		
ارشد کمال، شاہد اختر، فاطمہ تاج، حنیف ساحل		
• **بازخواں**		
اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	119-175

www.taemeernews.com

• عالمی ادب

ادب کا نوبل انعام	ذ۔ج	176
مین بوکر انعام	ذ۔ج	177

• تراشے 179-189

سنگیت کا عالمی دن، تعلیمی نظام میں آرٹ کو ترجیح، مصوری سنگیت اور صوفی ازم، ہم جنس پرستی، مرقع چغتائی کی اشاعت، امرتا پریتم اور امروز، مغل عہد تہذیبی سنگم، ہندستانی میوزیم کی سالگرہ منفرد ڈانس فیسٹول، فارسی ادب کا مرکز ہندستان، گورو۔شیشو پرمپرا، دلی کتاب میلہ، امن پسندوں کا مارچ، ٹیگور کا نوبل میڈل چوری

• مصوری

گوشۂ ایم ایف حسین	ذ۔ج	190
طیب مہتہ نے ہندستانی آرٹ کو توقیر دلائی	ذ۔ج	196

• موسیقی

استاد علی اکبر سراپا سنگیت تھے	ذ۔ج	198
گنگوبائی ہنگل	ذ۔ج	202

• فلم

لتاجی کی ۸۰ ویں سالگرہ (انٹرویو)	زبیر رضوی	204
مناڈے کو پھالکے ایوارڈ	ذ۔ج	214
فلم ناسٹلجیا۔دیوداس	ذ۔ج	216

• رفتگاں	ذ۔ج	219
• رد عمل	خطوط	221
• سلسلۂ روز و شب (نوٹ بک)	ذ۔ج	237

www.taemeernews.com

الف

● 'ذہن جدید' اگلے شمارے کے بعد اپنی اشاعت کے بیسویں برس میں قدم رکھے گا کسی ادبی رسالے کا کسی بھی طرح کی آہ و بکا کئے بغیر اور اپنی زبان والوں کی بے حسی کا رونا روئے بغیر دو دہائیوں تک روش عام سے ہٹ کر تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہنا ہمارے خیال میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں دراصل سارا مسئلہ نیت کے کھرے پن اور آپ کے بے لوث ہو کے کمیٹڈ انداز میں تنوع سے بھرپور رسالہ ترتیب دیتے رہنے کا اور اتنے برسوں تک قاری کے لئے اس کو بامعنیٰ بنائے رکھنے کی کامیابی کا ہے

ایک سو برس سے زائد عرصے پر محیط اردو کی ادبی صحافت کے زمانی سلسلے کو ہم نے ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا اور ماضی کے روشن خیال اور روشن ضمیر ادبی رسالوں کے مدیروں کی ادارتی پالیسی سے یہ بات سیکھی کہ اگر رسالہ اپنے مواد کے بل بوتے پر پڑھنے والے کے لئے 'جام جہاں نما' اور 'سمتِ نما' اور بیکراں زندگی کے کھلے پانیوں پر بادبان کھولنے کا اضطراب پیدا نہ کر سکے تو اس سے بہتر ہے کہ سفر کے ارادے سے موج خیز پانیوں میں پاؤں نہ رکھے جائیں

ذہن جدید نے اپنی کئی طرح کی پیش رفتیوں سے قطع نظر اُس ایک راہ کو خاصا روشن کیا ہے جو اپنی بے پناہ رونقوں اور سرگرمیوں کے باوجود اردو قاری کے لئے اندھی گلی تھی ذہن جدید نے اس اندھی گلی کو ایک 'سرو چراغاں' والے چوک سے جا ملایا جو فنون کی رنگا رنگی والا چوک تھا یہ اس لئے بھی ممکن ہوا کہ اردو زبان کا لسانی کردار اس نوعیت کے تنوع کے لئے اگر پوری طرح آمادہ رہا ہے تو ہم بھی اس تنوع کی باغبانی کرنے کی بھرپور استعداد رکھتے تھے

ڈاک میں ملنے والے ڈھیر سارے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذہن جدید پڑھتے ہوئے قاری نے اپنے اندرون میں روشندانوں کو کھلتے ہوئے محسوس کیا ہے اس کے اندرون میں ادراک و عرفان کے اس اڈتے ہوئے سیلِ نور نے ذہن جدید کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ ہم ذہن جدید کی اشاعت کی تیسری دہائی کا سفر اسی سیلِ نور کے حوالے سے طے کریں گے اس بار کی پیش کش میں ہم نے دو نایاب کتابوں کا مواد آپ کی نذر کیا ہے!

● مرتب

www.taemeernews.com

اردو شاعروں کا البم

اس البم میں امیر خسرو سے جاں نثار اختر تک کے
اہم شاعروں کے احوال
اور نمونۂ کلام شامل ہے
یہ ایک اہم دستاویز ہے
اور حوالوں کے لئے بے حد اہم ہے
اسے محفوظ رکھیئے

اس البم میں ۱۹۵۲ء میں شائع زیدی والا البم بھی شامل ہے

ترتیب ● زبیر رضوی

www.taemeernews.com

فہرستِ شعراء

نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر	صفحہ	نام شاعر	پیدائش	وفات	عمر	صفحہ
امیر خسرو دہلوی	۱۲۵۳ء	۱۳۲۴ء	۷۱		خواجہ حالی	۱۸۳۷ء	۱۹۱۴ء	۷۷	
محمد قلی قطب شاہ	۱۵۶۳	۱۶۱۱	۴۸		اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶	۱۹۲۱	۷۵	
ولی دکنی	۱۶۶۸	۱۷۴۴	۷۴		شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶	۱۹۲۷	۸۱	
میرزا رفیع سودا	۱۷۱۳	۱۷۸۰	۶۷		ریاض خیرآبادی	۱۸۵۳	۱۹۳۴	۸۱	
میر درد	۱۷۲۰	۱۷۸۴	۶۴		صفی لکھنوی	۱۸۶۲	۱۹۵۰	۸۸	
میر تقی میر	۱۷۲۲	۱۸۱۰	۸۸		سائل دہلوی	۱۸۶۸	۱۹۴۵	۷۷	
میر حسن	۱۷۲۷	۱۷۸۶	۵۹		امجد حیدرآبادی	۱۸۶۸	—	۸۲	
نظیر اکبرآبادی	۱۷۳۵	۱۸۳۰	۹۵		فصاحت جنگ جلیل	۱۸۶۹	۱۹۴۶	۷۷	
مصحفی	۱۷۵۰	۱۸۲۴	۷۴		سرور جہان آبادی	۱۸۷۳	۱۹۱۰	۳۷	
سید انشا	۱۷۵۶	۱۸۱۷	۶۱		علامہ اقبال	۱۸۷۳	۱۹۳۸	۶۵	
خواجہ آتش	۱۷۷۸	۱۸۴۶	۶۸		حسرت موہانی	۱۸۷۸	۱۹۵۱	۷۳	
ناسخ	۱۷۸۷	۱۸۳۸	۵۱		فانی بدایونی	۱۸۷۹	۱۹۴۰	۶۱	
ابراہیم ذوق	۱۷۸۹	۱۸۵۴	۶۵		سیماب اکبرآبادی	۱۸۸۰	۱۹۵۱	۷۱	
مرزا غالب	۱۷۹۶	۱۸۶۹	۷۳		برج نرائن چکبست	۱۸۸۲	۱۹۲۶	۴۴	
مومن	۱۸۰۰	۱۸۵۱	۵۱		عزیز لکھنوی	۱۸۸۲	۱۹۳۵	۵۳	
میر انیس	۱۸۰۱	۱۸۷۴	۷۳		اصغر گونڈوی	۱۸۸۴	۱۹۳۶	۵۲	
میرزا دبیر	۱۸۰۳	۱۸۷۵	۷۲		جگر مرادآبادی	۱۸۹۰	—	۶۲	
دیا شنکر نسیم	۱۸۱۱	۱۸۴۳	۳۲		جوش ملیح آبادی	۱۸۹۴	—	۵۸	
امیر مینائی	۱۸۲۸	۱۹۰۰	۷۲		رضا علی وحشت	۱۸۹۴	—	۵۸	
فصیح الملک داغ	۱۸۳۱	۱۹۰۵	۷۴		حفیظ جالندھری	۱۹۰۰	—	۵۲	

اختر شیرانی	۱۹۰۵ / ۱۹۴۸	معین احسن جذبی	۱۹۱۲ / ۲۰۰۵
آرزو لکھنوی	۱۲۸۹ھ / -	مجروح سلطان پوری	۱۹۱۹ / ۲۰۰۷
یگانہ چنگیزی	۱۸۸۴ / ۱۹۵۶	علی سردار جعفری	۱۹۱۳ / ۲۰۰۰
فراق گورکھپوری	۱۸۹۶ / ۱۹۸۲	مخدوم محی الدین	۱۹۰۸ / ۱۹۶۹
احمد ندیم قاسمی	۱۹۱۶ / ۲۰۰۶	اسرار الحق مجاز	۱۹۱۱ / ۱۹۵۵
فیض احمد فیض	۱۹۱۱ / ۱۹۸۳	جاں نثار اختر	۱۹۱۴ / ۱۹۷۶

www.taemeernews.com

ذہن جدید

www.taemeernews.com

امیر خسرو دہلوی

ابوالحسن نام، خسرو تخلص ۱۲۵۳ء/۶۵۱ھ میں مقام پٹیالی (صوبہ آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد امیر سیف الدین محمود شمسی ترکوں کے ایک قبیلے لاچین سے تھے۔ چنگیز خاں کے حملہ ۱۲۱۹ء/۶۱۶ھ کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے عہدِ سلطنت میں بلخ سے ہندوستان آئے اور شاہی اعزاز و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ امیر خسرو کے نانا عماد الملک شاہ بلبن کے وزیر جنگ تھے۔ امیر خسرو کی عمر نو سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نانا کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، انیس سال تک کا فارسی کلام "تحفۃ الصغر" میں موجود ہے۔ بیس سال کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہو گئے۔ خوش قسمتی سے شاہزادہ محمد ولی عہد سلطان غیاث الدین بلبن جیسا مربی مل گیا۔ اور اسی وسیلے سے دربارِ شاہی میں باریابی حاصل ہوئی۔ امیر خسرو نے بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے درباروں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے اُن کے علم و فضل کی اس درجہ قدردانی کی کہ انہیں "ندیم خاص" بنایا، اور "مصحف داری" اور "امارت" کا عہدہ دیا۔ اور "امیر لاچین" کا موروثی فوجی منصب بھی عطا کیا جس کے سبب خسرو کو "امیر" کا خطاب ملا۔

امیر خسرو ایک جید عالم، بے مثل ادیب اور بے بدل شاعر تھے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں پر پوری قدرت اور فنِ موسیقی میں خاص مہارت تھی۔ طبیعت بلا کی موجد اور مخترع پائی تھی۔ راگ راگنیوں میں ان گنت اختراعیں کیں۔ فارسی شاعری میں ایسا کمال دکھایا کہ "طوطیِ ہند" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:-

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند　　زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اُردو الفاظ کے استعمال اور انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی سب سے پہلے امیر خسرو نے کوشش کی۔ اُن کے ہاں ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جن کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا اُردو ہے۔ امیر خسرو کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ اُن کے فارسی اشعار کا اندازہ لاکھوں تک کیا گیا ہے۔ اُن کا ہندی کلام بھی فارسی کے کلام سے کم نہ تھا، لیکن ہم تک نہ پہنچ سکا۔ اُنہوں نے جملہ اصنافِ سخن یعنی غزل، مثنوی، قطعہ، مرثیہ، مکرنیاں، انمل، دو سخنے اور قسم قسم کے گیتوں اور پہیلیوں میں اپنے کمال کے جوہر نمایاں کئے ہیں۔

امیر خسرو کے نانا اور والد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی آٹھ سال کی عمر میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے دامن میں پناہ لی۔ مرشد کو اپنے پیر سے یہ لگاؤ تھا کہ اکثر فرمایا کرتے "اے ترک من از وجودِ خود برنجم لیکن از تو نرنجم"۔ امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ خود سلطان الاولیا حضرت محبوب الٰہی نے اُن کی مدح فرمائی ہے۔

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست　　ملکیتِ ملکِ سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست، نامِ خسرو نیست　　زیرا کہ خدائے ناصر آں خسرو ماست

www.taemeernews.com

۱۳۲۴ء ۷۲۵ھ میں جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے رحلت فرمائی تو امیر خسرو محمد تغلق کے ہمراہ بنگال کی مہم پر گئے ہوئے تھے کسی خاص کیفیت کے ماتحت بادشاہ سے اجازت لے کر یکایک دہلی پہنچے اور مرشد کے وصال کی خبر سنی۔ اسی وقت تمام دولت و ملکیت مرشد کے ایصالِ ثواب کے لئے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دی۔ ماتمی لباس پہن کر مزار پُر انوار پر پہنچے آستانہ سے سر ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ "سبحان اللہ آفتاب در زیرِ زمین و خسرو زندہ" یہ کہہ کر بیہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا اور روح پرواز کر گئی۔

گوری سوے سیج پر مکھ پر ڈارو کیس　　چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حضرت محبوب الٰہیؒ کی پائنتی دفن کئے گئے۔ مہدی خواجہ نے سب سے پہلے ۱۴۹۱ء ۸۹۷ھ بعہد بابر بادشاہ مقبرہ تعمیر کرایا

(چھڑی) سب کوئی اُس کو جانے ہے پر ایک نہیں پہچانے ہے　　آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے، فکر کیا آن دیکھا ہے

(اردو کی سب سے پہلی غزل)

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں　　کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف، و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ　　سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم ببرد تسکیں　　کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں ماہ گشتم آخر　　نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد ما را فریب خسرو　　سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی　　آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد　　ہرگاہ بگوئی کہ دہی بیہو دہی

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من　　بے گنہ ہم ساتھ عجب رونہ ہے　(روٹھا ہے)

روئے تو رونق شکنِ آفتاب　　سرو بہ پیشِ قدِ تو بونہ ہے　(بوٹا ہے)

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا　　آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

(پہیلی)

سر کاٹوں تو امن بنے اور پاؤں کاٹوں تو پیالا　　امیر خسرو یوں کہے رنگ ہے اُس کا کالا

(جامن)

جیوں کا سر کاٹ لیا　　نا مارا نا خون کیا　(ناخن)

(دو سخنے)

انار کیوں نہ چٹکا　　وزیر کیوں نہ رکھا　(دانا نہ تھا)

گوشت کیوں نہ کھایا　　ڈوم کیوں نہ گایا　(گلا نہ تھا)

www.taemeernews.com

محمد قلی قطب شاہ

نظر ہے ساقی پر ہوئی کیا نظر
خبر سب گنوا کر ہوا بے خبر

پیا باج پیالا، پیا جائے نا
پیا باج تکیل جیا جائے نا

خورشید مکھ اُپر دسے ابرو ہلالِ عید
اس ابروان کو سجدہ کیا ہے وصالِ عید

سدا تو مدح نبیؐ و علیؑ کی کہنا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

سلطان محمد قلی قطب شاہ، والی گولکنڈہ ۱۵۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۵۸۰ء میں اپنے والد محمد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر (بعہد اکبر بادشاہ) تخت نشین ہوئے اور ۱۶۱۱ء میں انتقال کیا۔ یوں تو دکن میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز آٹھویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا لیکن شاہانِ گولکنڈہ کا دور، اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً سلطان محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے اس دور کے مشہور شعراء و ادباء اُن کے دربار میں جمع تھے۔ قلی قطب شاہ کو شعر و شاعری کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر سے بھی خاص شغف تھا۔ دکنی، تلنگی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ قطب شاہ معانی تخلص تھا۔ ایک ضخیم دیوان اُن کی یادگار ہے جس کا سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ اُن چند شاعروں کے جن کا رتبہ دنیائے شاعری میں بہت بلند ہے۔ قلی قطب شاہ کا کلام بجز زبان کے تغیر و شستگی کے کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں۔ عشق، مستی اور تصوف سے کلام معمور ہے۔ اُن کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت جو زمانہ مابعد کے شعراء میں سودا اور نظیر کے سوا کسی دوسرے کے یہاں نظر نہیں آتی، یہ ہے کہ وہ نہ صرف اردو شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ لکھا، بلکہ اس محدود دائرے سے نکل کر آزادی اور جدت کا مسلک اختیار کیا۔ اپنے مشاہدات کو کام میں لا کر انسانی معاشرت اور مناظرِ قدرت پر بھی نظر ڈالی۔ اُن کی مثنویوں میں جہاں پھولوں میووں، سبزی ترکاری اور شکاری پرندوں کا بیان ہے، وہاں شاہی محلوں، شادی بیاہ، سالگرہ کی تقاریب شب برات عید، ہولی، دیوالی وغیرہ تہواروں کا بھی ذکر موجود ہے۔ وہ اگر ایک طرف فارسی اور عربی کے الفاظ اور تراکیب بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف اُن کے کلام میں ہندی کا عنصر بھی شامل ہے۔ اور ہندی الفاظ، ترکیبیں استعارے اور تشبیہیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے وسیع النظری سے کام لے کر اردو کو ایک ادبی زبان بننے کے قابل بنایا

www.taemeernews.com

ولی دکنی

خال بھی مکھ پر ترے جو یوں دسے
جیوں کہ بیٹھا زاغ آ گلشن بھیتر

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو
کرتی ہے نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی
کہ دل سے تاب جی سے صبر سے ہوش لے جاوے

ولی اُس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

تری یہ زلف ہے شامِ غریباں
جبیں تیری مجھے صبحِ وطن ہے

طاقت نہیں کسی کو جو اک حرف سن سکے
احوال گر کہوں میں، دلِ بے قرار کا

ترک کر اے رقیب! فرعونی
آہ، میری، عصائے موسیٰ ہے

اُردو زبان کے محسن، ولی محمد المتخلص بہ ولی ۱۶۶۸ء/۱۰۷۹ھ میں بمقام اورنگ آباد، دکن پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۴۷ء/۱۱۵۵ھ میں احمد آباد (گجرات) میں وفات پائی۔ بیس برس کے سن میں تحصیلِ علم کے لئے گجرات گئے جو اُس زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں تعلیم پائی وہیں شاہ نورالدین صدیقی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پیر سیاحت کے سلسلے میں دو مرتبہ دلی آئے پہلی بار اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد ۱۷۰۰ء/۱۱۱۲ھ میں اور دوسری دفعہ محمد شاہ کے دورِ سلطنت ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ میں۔ پہلی بار شاہ سعداللہ گلشن، دہلی کے مشہور شاعر درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے انھوں نے ولی کو مشورہ دیا کہ ریختہ میں فارسی کے مضامین رنگین استعمال کریں جب دوسری مرتبہ دلی آئے تو اپنا دیوان ساتھ لائے چونکہ شاہ گلشن کے مشورے سے پورا استفادہ کر چکے تھے اُن کا کلام دلی میں مقبول ہوا۔ ولی کے اُردو شعرا کے کلام میں فارسیت غالب تھی، لیکن ولی نے فارسی کے ساتھ بھاشا الفاظ کو اپنے کلام میں سمو کر ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن اور مختلف زمینوں اور بحروں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کے کلام میں تغزل کا رنگ غالب ہے۔ اُن کا دور اُردو زبان کا ایک عبوری دور ہے اہلِ دکن اور اہلِ شمال کے میل جول سے نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہونے لگے۔ ولی نے اس دور کی زبان کو اپنے کلام میں محفوظ کر کے ایک تاریخی فرض انجام دیا۔ الفاظ کی موزونی، اُن کا برمحل استعمال، اچھوتے استعارے اور تشبیہیں، جاذبِ نظر ترکیبیں اور رعایاتِ لفظی کلامِ ولی کی جان ہیں۔

www.taemeernews.com

میرزا رفیع سودا

(تقسیم)

آپ جو گردِ چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے، جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

نسبت اس فصل کو، پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے فضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل

اے لالہ، گو فلک نے دیئے، تجھ کو چار داغ
چھاتی مری سراہ! کہ اک دل ہزار داغ

رنگِ گل کچھ بے طرح دیکھے ہے اے ابرِ بہار
آشیاں میرا جھڑک لگتی ہے اب گلشن میں آگ

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا!

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

میرزا محمد رفیع نام، سودا تخلص، ۱۷۱۳ء/۱۱۲۵ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد مرزا محمد شفیع بسلسلۂ تجارت کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ سودا نے لائق استادوں سے تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ پہلے سلیمان قلی داؤد، پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ خانِ آرزو سے بھی کسبِ فیض کیا، اور انہی کے مشورے سے اردو میں مشقِ سخن شروع کی۔ طبیعت میں شوخی اور جودت تھی، بہت جلد شہرت کا غلغلہ بلند ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے طلب کرنے پر ۱۷۷۱ء/۱۱۸۵ھ میں فیض آباد گئے، نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ نے بڑی قدر کی۔ سودا ۱۷۷۹ء/۱۱۹۳ھ میں آصف الدولہ کے ہمراہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے اور وہیں ۱۷۸۰ء/۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔

میرزا سودا نے قریب قریب تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن جس چیز کے سبب وہ زیادہ مشہور ہوئے وہ ان کے قصائد ہیں۔ میرزا کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر غالب تھا اور فطرتاً ہجو گوئی کے لئے مزید تھے۔ غزل کے بھی وہ ایک بڑے استاد ہیں۔ ان کا کلام درد، سوز و گداز اور خستگی سے خالی نہیں ہے، اور یہ وہ صفتیں ہیں جو غزل سرائی کی جان ہیں۔

www.taemeernews.com

میر درد

دین و دُنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے
اِن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
دِل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
دِل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا
سینۂ دِل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس سے جی گھبرا گیا

ارض و سما کہاں تری وُسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دِل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

خواجہ میر نام، درد تخلص، سنہ ۱۷۲۰ء / ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے دادا، بخارا سے عہد عالمگیر میں دِلّی آئے۔ اُن کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب بھی صوفی اور شاعر تھے۔ خواجہ میر درد مشہور عالم اور درویش تھے اُن کو تصوف اور شاعری ورثے میں ملی تھی۔ والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی اور شاعری میں انہی سے اصلاح لی میر درد فن موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے۔ اور موسیقی و شاعری کے امتزاج نے اُن کی طبیعت میں زاہدانہ خشکی کے بجائے ایک خاص قسم کی شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ استغنا اور دنیا سے بے پروائی کی صفت جو لازمۂ تصوف ہے اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جب دِلّی پر تباہی آئی اور علم و فضل اور شعر و سخن کا مرکز لکھنؤ میں منتقل ہوا اُس وقت بھی خواجہ صاحب کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ اس دورِ پُر آشوب میں بھی دِلّی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا اور سنہ ۱۷۸۴ء / ۱۱۹۹ھ میں وہیں انتقال کیا۔

خواجہ میر درد پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اُردو غزل کی بنیاد خالص عشقِ حقیقی پر رکھی اور یہی اُن کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اُردو کا کلام پاکیزہ اور متین ہے تصوف کی چاشنی نے کلام میں گہرائی اور گداز پیدا کر دیا ہے۔ اُن کے مختصر دیوان میں اخلاق، تصوف، کیفیاتِ قلبی، وارداتِ حُسن و عشق سبھی کچھ موجود ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہی ہیں بقول امیر مینائی "پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں" غزلوں کے علاوہ اُن کی رباعیاں بھی اُردو شاعری میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔ اُن میں صوفیانہ، عاشقانہ اور اخلاقی مضامین، مؤثر انداز میں بیان کئے ہیں کلام نامانوس ترکیبوں، ثقیل الفاظ اور دُوسرے معائب سے پاک ہے۔

www.taemeernews.com

ذہن جدید

www.taemeernews.com

میر تقی میر

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مصائب اور تھے، پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہوئے خاک انتہا ہے یہ

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی، زنجیر نظر آئی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے، اس آرام طلب کو

پاس ناموس عشق تھا، ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال ہوں کہ اگا اور جل گیا

ہم سے دیوانے رہیں شہر میں سبحان اللہ!
دشت میں قیس رہے، کوہ میں فرہاد رہے

دامان و جیب ٹکڑے ہوئے مل کے ایک جا
اب کے یہ کام ہاتھ سے میرے سمٹ گیا

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

محمد تقی نام، میر تخلص، پردادا حجاز سے دکن آئے۔ وہاں سے احمد آباد (گجرات) میں آکر قیام کیا۔ آخر اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میر تقی ۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی تھا۔ علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امان اللہ سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، اس لئے اپنے سوتیلے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس دلی چلے آئے اور انہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ دلی میں آئے دن کی خانہ جنگیوں اور بدامنیوں نے میر صاحب کو دل برداشتہ کر دیا تھا۔ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ۱۷۸۲ء/۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ گئے۔ کسی بات پر نواب سے ان بن ہو گئی اور دربار کا تعلق منقطع ہو گیا۔ ۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ نکات الشعرا (۱۷۵۱ء) اور ذکر میر (۱۷۸۲ء) (فارسی) اور کلیات میر ان سے یادگار ہیں۔

میر کا کلام سوز و گداز اور درد و اثر کا بے مثال مرقع ہے۔ ان کے بہتر نشتر اردو شاعری میں کوئی جواب نہیں رکھتے۔ حد یہ ہے کہ میرزا غالب جیسے ہمہ گیر اور جامع الکمالات شاعر سے بھی اس کی تقلید نہ ہو سکی

www.taemeernews.com

میر حسن

(مثنوی)

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر
وہ براق ساہر طرف دشت و دَر
وہ اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت
اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

(تغزل)

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
نہ تھمتی تھیں آہیں، نہ رُکتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

جب قفس میں تھے تو تھی یادِ چمن ہم کو حسن
اب چمن میں ہیں، تو پھر یادِ قفس آتی ہے
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
بس اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے
تو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

میر غلام حسن نام، حسن تخلص، ۱۷۲۷ء (۱۱۴۰ھ) میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا۔ جدِ امجد میر آمامی ایران سے دہلی آئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ میر حسن فطری شاعر تھے شروع میں والد سے اصلاح لیتے رہے بعد میں خواجہ میر درد سے استفادہ کیا۔ آغازِ شباب میں والد کے ہمراہ فیض آباد گئے بعد میں لکھنؤ آئے اور ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے لیکن میر و سودا کا رنگ مرغوب تھا۔ شاعری بزرگوں سے میراث میں پائی تھی۔ زندگی ہی میں بامِ شہرت پر پہنچ گئے اور بقول آزاد "زمانے نے اُن کی سحر البیانی پر تمام تذکرہ نویسوں سے محضرِ شہادت لکھوایا"۔ ۱۷۸۶ء (۱۲۰۰ھ) میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ "شاعرِ شیریں زبان" سے مصحفی نے تاریخِ وفات نکالی ایک دیوان جو جملہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے۔ گیارہ مثنویاں اور فارسی زبان میں "تذکرہ شعرائے اُردو" جو ۱۷۷۸ء (۱۱۹۲ھ) کے درمیان لکھا "یادگار" ہیں۔

میر حسن کا کلام سادہ، زبان شستہ اور مضامین عاشقانہ ہیں مثنویوں میں "سحر البیان" اور "گلزارِ ارم" قابلِ ذکر ہیں۔ خصوصاً "سحر البیان" کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اردو زبان کی کسی مثنوی کو نہیں ہوئی اُس کی بدولت اُن کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھا گیا۔ یہ مثنوی ۱۷۸۵ء (۱۲۰۰ھ) میں مکمل ہوئی میر حسن کی خصوصیت منظر نگاری اور جذبات کی ترجمانی ہے مضمون کی شوخی، بیان کی صفائی اور محاورہ کا لطف قابلِ دید ہے زبان ایسی پاکیزہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی آج کی زبان معلوم ہوتی ہے صدہا شعر ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہیں۔

www.taemeernews.com

نظیر اکبر آبادی

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا
اس کے شرار حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانہ کو ہم

ولی محمد نام، نظیر تخلص، سنہ ۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ سنہ ۱۷۶۱ء (۱۱۷۵ھ) میں احمد شاہ ابدالی نے جب دلی پر حملہ کیا تو نظیر آگرہ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے سنہ ۱۸۳۰ء (۱۲۴۶ھ) میں آگرہ میں انتقال کیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نظیر کا کلام کتنا تھا کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی اپنا کلام جمع نہیں کیا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور فارسی نثر میں بھی نو کتابیں لکھیں۔ نظیر ایک نغز گو، بذلہ سنج اور رمز شناس شاعر تھے۔ شاعری میں کسی کے مقلد یا پیرو نہ تھے بلکہ خود ہی اپنے رنگ کے موجد تھے۔ ان کا موضوع انسان اور اس کی معاشرت ہے۔ انسانی ہمدردی، جزئیات کا مطالعہ اور ہمہ گیر تخیل ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ زبان پر قدرت، معاشرتی حالات پر عبور، فطرت کی رمز شناسی، مناظر قدرت کی مصوری، مختلف فنون کا وقوف، سیاسی بصیرت، رفتار زمانہ سے دلچسپی، صنعت و حرفت سے واقفیت، اختراع الفاظ کا سلیقہ، ظرافت، سوز و گداز، ترنم غرض کہ نظیر میں شاعری کے سارے لوازم و محاسن موجود ہیں۔ ان کا کلام صنائع و بدائع سے مالا مال ہے۔ نظیر نے اردو زبان میں نئی بندشوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ کیا اور قدیم فرسودہ استعارے اور تشبیہیں چھوڑ کر جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند سب سے پہلے انہی نے لگایا۔ ادنیٰ سے ادنیٰ گھریلو واقعہ اور سادہ سے سادہ منظر کو باتوں باتوں میں کھیل کود کی آڑ لے کر ظرافت اور تفنن طبع کے طور پر جس طرح نظیر نے بیان کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نظیر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت اور معاشرت کا کوئی انداز، احساسات و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو کلیات نظیر میں نہ ملتا ہو۔ البتہ جوانی کا کچھ کلام فحش ہے۔ ڈاکٹر فیلن کا قول ہے "نظیر ہی اردو کا اکیلا وہ شاعر ہے جس کی شاعری اہل فرنگ کے معیار کے مطابق سچی شاعری ہے۔"

www.taemeernews.com

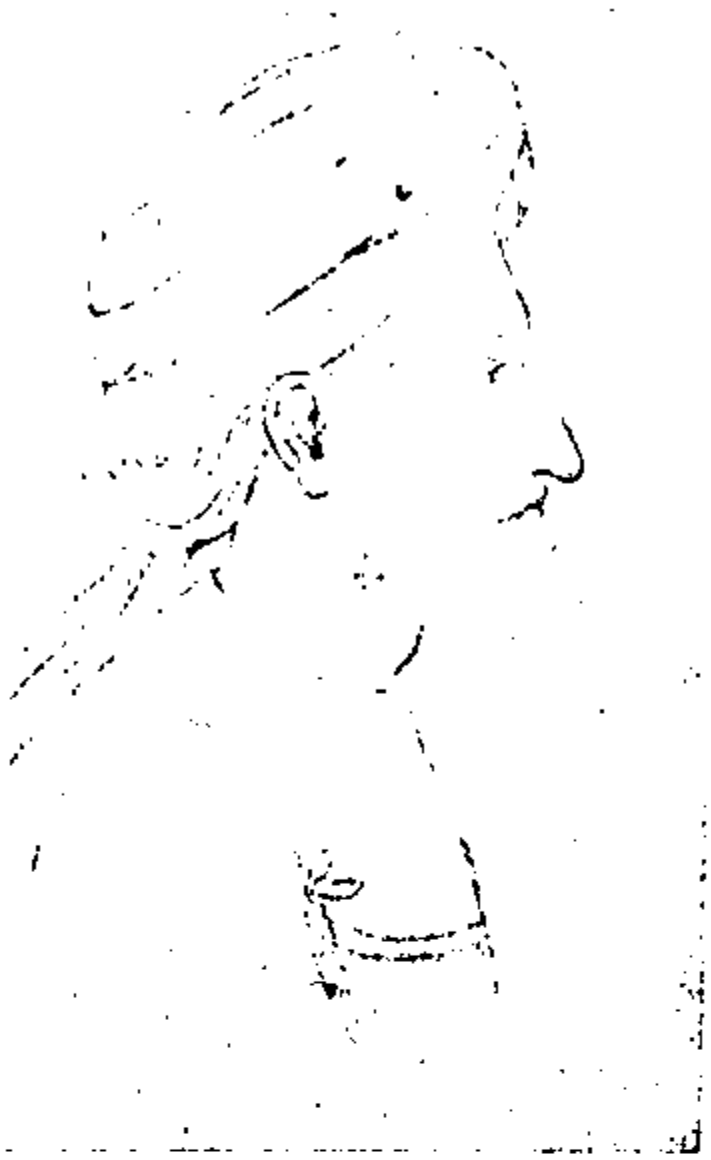

مصحفی

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دِل میں تو بہت کام رفو کا نِکلا

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

آنے دو اُسے جس کے لئے چاک کیا ہے
ناصح سے گریباں کو سِلانے کے نہیں ہم

کُنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار، باغ میں دُھومیں مچا گئی

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

فصلِ گُل فصلِ خزاں دونوں گئیں اے صیاد
مُرغِ دل کون سے موسم میں رِہا ہووے گا

غم کھاتا ہوں جتنا، مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مرنے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

کوچہ سے نکل کر ترے، میں نالہ کروں گا
معلوم ہوا، اب مجھے، تاثیر نہیں یہاں

شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص، سنہ ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ میں بمقام امروہہ ضلع مراد آباد پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ ولی محمد تھا۔ جوانی ہی میں تحصیل علم کا شوق دِلّی کھینچ لایا۔ بزرگوں کی صحبتوں سے مستفیض ہوئے۔ دُوسرے شعراء کی طرح یہ بھی دِلّی کو خیرباد کہہ کر نواب آصف الدولہ کے زمانے سنہ ۱۷۸۳ء/۱۱۹۸ھ میں لکھنؤ گئے۔ مصحفی "تذکرۂ ہندی" میں لکھتے ہیں کہ "سید انشا شہزادہ سلیمان شکوہ (بن شاہ عالم ثانی) کے دربار میں پہلے سے موجود تھے۔ وہی شہزادہ کے حکم سے مجھ کو دربار میں لے گئے" لیکن آخر میں سید انشا مصحفی کے لئے وبالِ جان بن گئے۔ شعر و شاعری میں خوب خوب معرکے رہے۔ اپنے پیش رُوں کی طرح دِلّی کی یاد اُنہیں بھی ستاتی رہی۔ سنہ ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اچھے شاعر کی حیثیت سے مصحفی سنہ ۱۷۷۸ء/۱۱۹۳ھ میں دِلّی میں مشہور ہو گئے تھے۔ سنہ ۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ سے پہلے فارسی کے دو دیوان ترتیب دے چکے تھے۔ دو تذکرے اُردو گو شعراء کے تذکرۂ ہندی (ریاض الفصحاء) اور ایک تذکرہ فارسی گو شعراء کا (عقدِ ثریا) فارسی زبان میں ترتیب دیا۔ چونکہ اُنھوں نے طویل عمر پائی تھی اس لئے بیشتر شعراء کے حالات بڑی حد تک معتبر اور مستند ہیں۔ آٹھ دیوان اُردو کے اور بیس مثنویاں (جو اب تک مل سکی ہیں) یادگار چھوڑیں۔ مصحفی کی استادی کا لوہا تقریباً سبھی نے مانا۔ بڑے پُرگو استاد ہونے کے باوجود اُن کے کلام میں صفائی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ناہمواری اور فحاشی نہیں ہے۔ بقول آزاد "سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں" اُن کے ہاں تغزّل، معاملہ بندی، تصوف، اخلاق، فلسفہ سبھی کچھ موجود ہے۔

www.taemeernews.com

سیّد انشاؔ

اُس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دِن کے عرشِ کبریائی مانگتا
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا
جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وُہ شے لا
ہُوئے ہیں خاکِ سرِ راہ، اُس کی ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے، جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے
گر یار مے پلائے، تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

سیّد انشاء اللہ خاں نام انشاؔ تخلص، ۱۷۵۶ء (۱۱۷۰ھ) اور ۱۷۵۸ء (۱۱۷۲ھ) کے درمیان مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگ نجفِ اشرف سے آکر دِلّی میں بس گئے تھے۔ انشاؔ کے والد میر ماشاء اللہ خاں بڑے عالم و فاضل اور حاذق طبیب تھے۔ باپ کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر انشاؔ بھی عالم، فاضل، طبیب اور شاعر ہوئے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ ابتدا میں والد سے اصلاح لی۔ عربی، فارسی، اُردو اور ہندی زبانوں میں نظم کی یکساں قدرت رکھتے تھے ہندوستان کی متعدد زبانوں پر عبور تھا۔ مُرشد آباد سے دِلّی آئے اور شاہ عالم ثانی کے درباریوں میں جگہ پائی۔ شعراء کی چشمک اور حالات کی ناسازگاری سے بددِل ہو کر ۱۷۹۱ء (۱۲۰۶ھ) میں لکھنؤ چلے گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے پھر نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ظرافت، بذلہ سنجی، اور شوخ مزاجی سے نواب کو اپنا اِس قدر گرویدہ بنا لیا کہ اُن کے بغیر اُسے ایک دم چین نہ آتا تھا۔ آخر میں نواب سے کسی بات پر اَن بَن ہو گئی اور عمر کا آخری زمانہ گوشہ نشینی اور کس مپرسی کی حالت میں گذار کر بمقام لکھنؤ ۱۸۱۷ء (۱۲۳۳ھ) میں وفات پائی۔

فطری ظرافت اور درباری زندگی نے ہزل اور تمسخر کو انشاؔ کی شاعری کا جُزو لازم بنا دیا تھا۔ اُن کو زبان پر جو حیرت انگیز قدرت حاصل تھی اگر وہ صحیح طور پر استعمال ہوتی تو اُن کا جواب اُردو شاعری میں مشکل سے ملتا۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے قصیدے نسبتاً متین اور سنجیدہ انداز میں کہے ہیں۔ ریختی یعنی عورتوں کے جذبات و خیالات عورتوں کی زبان میں بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں "میں تیرے صدقے نہ رکھ میری پیاری رُوزہ۔ بندی لگ لیگی تیرے بدلے ہزاری رُوزہ"۔ شاعری کے علاوہ انشاؔ کی دو تصنیفیں یادگارِ زمانہ ہیں۔ "دریائے لطافت" جو اُردو قواعد کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ "رانی کیتکی" کی داستان جس میں یہ کمال ہے کہ عربی یا فارسی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں پایا۔ ۱۸۰۳ء

www.taemeernews.com

خواجہ آتش

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیبِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تکلف سے بَری ہے حُسنِ ذاتی
قبائے گُل میں، گُل بوٹا کہاں ہے

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دِل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

حسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہُشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص، دِلّی کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے گئے تھے وہیں ۱۷۷۸ء/۱۱۹۲ھ میں آتش پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے معقول تعلیم سے محروم رہے۔ جوانی کی ترنگ، مزاج میں شوریدہ سری اور انداز میں بانکپن ساتھ لائی۔ ضعیفی تک بانکپن اور سپاہیانہ وضع کو بڑی خوبی سے نباہا۔ انشا اور مصحفی کے معرکوں نے شعر و شاعری کا شوق دلایا۔ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور صاحبِ طرز اُستاد کہلائے۔ ساری عمر خودداری اور فقیرانہ انداز سے گذار دی، ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شعر گوئی میں ناسخ سے خوب خوب معرکے رہے

خواجہ آتش اور شیخ ناسخ چونکہ صاحبِ طرز ہیں اس لئے لکھنؤ میں دونوں کے اسکول قائم ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ آتش اور ناسخ کے کلام میں اکثر خصوصیات مشترک ہیں لیکن چند خصوصیات ایسی ہیں جن کی وجہ سے آتش کا کلام ناسخ کے مقابلہ میں زیادہ دلآویز اور مؤثر ہے۔ بقول غالب "ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر تیز نشتر ہیں"۔ آتش کی زبان صاف اور شستہ ہے مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی ہے۔ بندش چُست اور الفاظ دلکش ہیں تشبیہات میں لطافت آمیز سادگی پائی جاتی ہے منتخب محاورات کا برمحل استعمال سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے آتش کی شاعری اگر ایک طرف اسرارِ محبت کی آئینہ دار ہے، تو دوسری طرف اُس میں فقیری کی شان بھی جھلکتی ہے۔

www.taemeernews.com

ناسخ

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مُردہ دِل خاک جیا کرتے ہیں

بُتوں کے پردہ میں ہم دیکھتے ہیں نُورِ خدا
خدا کے دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھکر
قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دِل کا بیاباں، رہ گیا

تاب سُننے کی نہیں، بہرِ خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، ناسخ تری فریاد سے

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو آساں ہوتا

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی، روزِ انتظار آیا

امام بخش نام، ناسخ تخلص، ۱۷۸۷ء/۱۲۰۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اِن کے خاندانی حالات تاریکی میں ہیں۔ کہتے ہیں کسی دولت مند سوداگر نے اِنہیں متبنیٰ کر لیا تھا۔ اُسی نے تعلیم و تربیت دی فارسی اور عربی کی تعلیم علمائے فرنگی محل سے پائی اور لکھنؤ کو وطن بنا لیا۔ شاعری میں کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی "ولا شعر گوئی الحی لکھنؤ سے"۔ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ تین دیوان اُن کی یادگار ہیں۔ پہلا دیوان الہ آباد میں، دُوسرا اور تیسرا لکھنؤ میں مرتب کئے۔

ناسخ اسم بامسمیٰ ہیں۔ اُنھوں نے قدما کا سادہ طرزِ کلام بدلا ہے۔ فحاشی اور ہجو سے زبان کو پاک کیا ہے الفاظ فارسی عربی استعمال کئے ہیں سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ کو چھوڑ دیا ہے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کی تذکیر و تانیث کے قواعد مقرر کئے ہیں بندش کا طرز فارسی کے طرز پر قائم کیا ہے جس سے مضامین میں وسعت پیدا ہوئی اور شعر کے ظاہری حُسن میں اضافہ ہو گیا۔ مضامین میں عاشقانہ طرز کو کم کر کے ہر قسم کے مضامین غزل میں شامل کئے ہیں زبان کی اصلاح کی ہے خیال بندی کو رائج کرنے اور غزل کی سلیس زبان کو چھوڑ دینے کے باعث، واردات قلبیہ سے اُن کی غزلیں خالی ہو گئی ہیں اور اُن میں بہت سے ایسے مضامین داخل ہو گئے ہیں جو احاطۂ غزل سرائی سے باہر تھے۔ بااینہمہ اُن کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں صفائی، شستگی اور کیف و اثر پایا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

ابراہیم ذوق

سرتاقدم ہیں شوق تری طالب جمال
مشتاق روزہ دار ہیں گویا ہلال کے

(قصیدہ)

واہ وا! کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دارالشفا
سر پر آرائے گردوں جب تلک سلطانِ خاور ہو
قمر دستورِ اعظم صدرِ اعلیٰ سعدِ اکبر ہو
عطارد میرِ منشی، زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میرِ عمارت تیرا گردوں میرِ لشکر ہو
سرِ ہفت آسماں جب تک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ، شاہِ ہفت کشور ہو

(غزل)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے
خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوئے پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں
سب کو دیکھا اس نے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں، اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

محمد ابراہیم نام، ذوق تخلص، ۱۷۸۹ء (۱۲۰۴ھ) میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جو ایک غریب سپاہی تھے ابتدائی تعلیم اگرچہ معمولی ہوئی تھی مگر کثرتِ مطالعہ نے اُن کی فطری صلاحیتوں کو ابھار دیا شروع میں حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لی بعد میں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے تمام عمر دلی میں رہے اور وہیں ۱۸۵۴ء (۱۲۷۱ھ) میں انتقال کیا۔ اکبر شاہ ثانی نے "خاقانی ہند" کا خطاب عطا کیا۔ بہادر شاہ ظفر شہزادگی کے زمانے ہی سے ذوق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

ذوق کا پایہ قصیدہ گوئی میں بہت بلند ہے۔ اُردو ادب میں قصیدہ میرزا سودا سے شروع ہوا اور ذوق پر ختم ہو گیا۔ اس صنفِ سخن کو انہوں نے جس عروج پر پہنچایا اُس سے آگے لے جانا اب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات سے اُن کے قصائد بھرے پڑے ہیں جن سے اُن کے تبحرِ علمی اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے اُن کی غزلیں بھی سادگی اور صفائی کے اعتبار سے اُردو ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ جو گو شعراء کے کلام میں لطف و یکسانی بہت ہوتا ہے جو اُن کے ہاں کم ہے اور تمام اصنافِ سخن پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ محاورات و امثال کا استعمال برمحل کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

ذہنِ جدید

www.taemeernews.com

مرزا غالب

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو،
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا، جامِ سفال اچھا ہے

مَیں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے، ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

چاک مت کر جیب، بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا، یہ بھی میرے دل میں ہے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اسداللہ خاں نام، غالب تخلص، مرزا نوشہ لقب، نجم الدولہ، دبیر الملک، نظامِ جنگ خطاب۔ ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ خاں تھا۔ سلسلۂ نسب تورانی فریدوں، شاہ ایران تک پہنچتا ہے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور اساتذہ سے پائی۔ مرزا صاحب کی زندگی دہلی میں گذری۔ اُستاد ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اُنہی کو اپنا کلام دکھایا۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں دہلی میں وفات پائی۔

شعر و سخن کی تاریخ میں مرزا غالب جیسے نکتہ سنج، نغز گفتار، کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ اُن کو فارسی نثر و نظم میں ایسا کمال تھا کہ قدما کی پختگی معلوم ہوتی ہے اور تقلیدِ کامل میں اجتہاد کا جلوہ نظر آتا ہے اُردو قطعات اپنی جدت، دلفریبی اور طرزِ ادا کے لئے مشہور ہیں۔ اردو شاعری میں کیا غزل کیا قصیدہ، کیا مثنوی، ہر صنف جدت اور اجتہاد، تازگی اور شگفتگی کا مرقع ہے۔ خیال کی لطافت اور بلندی، روزمرہ اور محاورات کا لطف، طرزِ ادا کی شوخی، اجزائے کلام کی ترتیب، سلاست اور روانی، ترنم اور موسیقی نے اُن کے کلام کو سہل ممتنع بنا دیا ہے۔ اُن کا مختصر مگر دلکش کلام آرٹ اور فلسفہ کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ بلا تکلف بین الاقوامی ادب میں جگہ پا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

مومن

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تا نہ کہیں خلل پڑے آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

تابِ نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل، کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

آخر تو دشمنی ہے، اثر کو دُعا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجر یار کی

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھکو اپنی نظر نہ ہو جائے

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل، خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

مومن خاں نام، مومن تخلص، سنہ ۱۸۰۰ء / ۱۲۱۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی تھا دادا حکیم نامدار خاں شاہ عالم کے عہد میں کشمیر سے دلّی آئے اور شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مومن نام رکھا ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اُس کے بعد شاہ عبدالقادر دہلوی سے تعلیم حاصل کی شاہ ولی اللہؒ کا خاندان مدتوں دلّی میں اپنے علم و فضل کے لئے مشہور رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے مومن بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں ایسے گھرانے میں تحصیلِ علم کا موقع ملا۔ والد اور چچا سے فنِ طب کی تکمیل کی۔ نجوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ مومن کو طبابت ورثہ میں ملی۔ بے چین طبیعت نے اختر شناسی سے روشناس کیا۔ مزاج کی رنگین اُفتاد نے عاشق مزاج بنایا اور حسن و عشق کی گود میں پلی ہوئی زندگی نے اُن کی شاعری کو رنگین تغزل سے سرفراز کیا۔ تصنیفات میں کلیاتِ اُردو، دیوانِ فارسی، انشائے فارسی اُن کی یادگار ہیں۔ سنہ ۱۸۵۱ء / ۱۲۶۸ھ میں دہلی میں انتقال کیا۔

مومن کا شمار اُردو کے اچھے غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ واقعاتِ حسن و عشق کو دل فریب بندشوں اور نرالی ترکیبوں سے ادا کرتے ہیں۔ اُن کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کا آئینہ دار ہے۔ اکثر مواقع پر مضمون کے اجزاء چھوڑ جاتے ہیں (اور یہ کام مخاطب کے سپرد کرتے ہیں کہ اُن کو پورا کرے) جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے طرزِ بیان میں سلاست اور کہیں کہیں جدت بھی ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کے ساتھ ساتھ فارسی ترکیبیں بھی استعمال کرتے ہیں

www.taemeernews.com

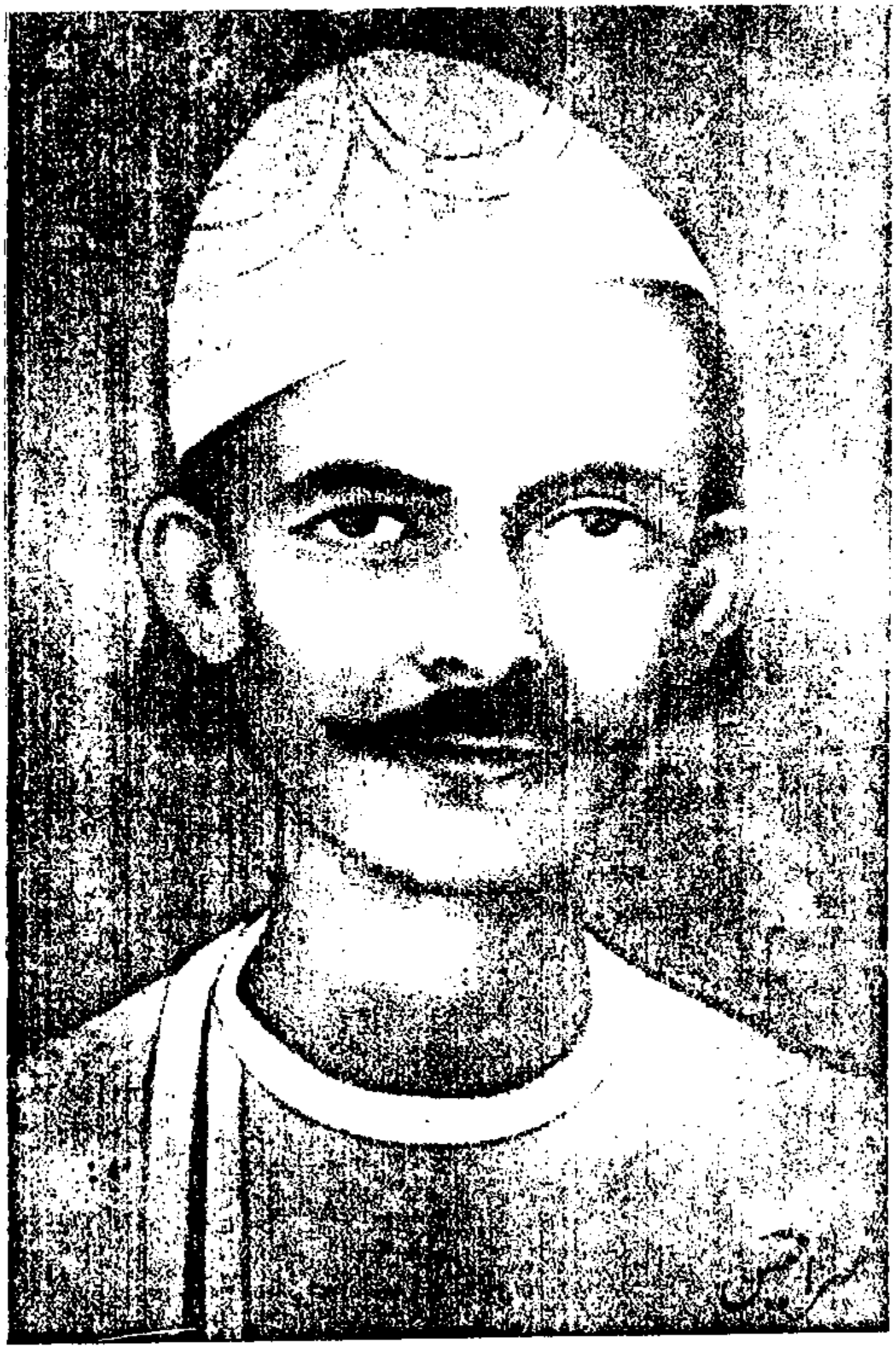

ذہن جدید

www.taemeernews.com

میر انیس

طاقت دکھاؤں میں جو رسالت مآب کی — رکھ دوں زمیں پہ چیر کے، ڈھال آفتاب کی
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں — جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخ لاجورد — مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
پرتو فگن تھا نور، رسالت مآب کا — سر پر لگا تھا، چتر زری آفتاب کا
کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو — سب دشت گونجتا ہے، یہ غصہ ہے شیر کو
یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں — مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں
لرزہ تھا رعبِ حق سے ہر اک نابکار کو — روکے تھا ایک شیرِ جری، دس ہزار کو
تھا ہمہمہ یہی اسدِ کردگار سے — نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم، کچھار سے
دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اس کی بڑی تھی — برچھی تھی، کٹاری تھی، سر وہی تھی، چھری تھی
چم خم کا جدا رنگ تھا، کس بل کا جدا رنگ — لب سرخ، دہن صاف، بدن گول، ہزار رنگ
مرحب تھا کفر و شرک میں، طاقت میں گیو تھا — گھوڑے پہ تھا شقی، کہ پہاڑی پہ دیو تھا
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا، جو آب کے — شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے
چنگاریاں اڑیں جو سناں سے لڑی سناں — دو اژدہے گتھے تھے، نکالے ہوئے زباں
دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے — پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

میر ببر علی نام، انیس تخلص ۱۸۰۱ء/۱۲۱۶ھ میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن دہلوی صاحب مثنوی سحر البیان کے پوتے تھے۔ جدِ امجد میر اماں ایران سے دلی آئے۔ لیکن زمانہ کی نامساعدت نے میر حسن کو ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ پہلے فیض آباد گئے پھر لکھنؤ آکر بود و باش اختیار کی۔ میر انیس کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں والد کے ارشاد پر مرثیہ گوئی کی طرف توجہ فرمائی اور اس میں چار چاند لگا دیے۔ میر انیس نے ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مرثیہ گوئی ورثہ میں ملی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں — پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

میر انیس نے مداحِ آلِ رسولؐ کی حیثیت سے اردو شاعری میں وہ نام آوری حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے اردو زبان میں منظر نگاری کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ فارسی تراکیب کی دل نشینی، زبان کی صفائی، بیان کی سادگی اور خیالات کی نفاست و نزاکت اُن کی شاعری کے نمایاں اجزاء ہیں۔ وہ اپنے کلام میں تازہ تشبیہات و استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے دنیا کے مشہور شعراء کی صف میں اپنا مقام تلاش کیا ہے۔

www.taemeernews.com

میرزا دبیر

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زہرہ نقب ہوئی
مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی
فکرِ رفو تھی، چرخِ ہنر مند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسف غریق چاہِ سیہ، ناگہاں ہوا
یعنی غروب، ماہِ تجلی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا
یعنی طلوع، نیّرِ مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے، معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم، اور یدِ بیضا تھا آفتاب
تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ چرخ کا اشکِ چکیدہ تھا
یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیے نہ مہر، صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلِ بیت کا گھر، بے چراغ تھا

میرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی نثار تھے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ دبیر ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے اور فارسی و عربی کی کتابیں وہاں کے نامور علماء سے پڑھیں۔ علمی استعداد فاضلانہ رکھتے تھے۔ شعر و شاعری سے قدرتی مناسبت تھی۔ مرثیہ میں مظفر حسین ضمیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے انہی نے دبیر تخلص رکھا

میرزا دبیر نے پندرہ سال کی عمر سے مرثیہ گوئی شروع کی جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بقول آزاد "بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا"۔ بیان کرنے کے نئے اسلوب اُردو شاعری میں بکثرت پیدا کئے۔ ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کیلئے نیا میدان صاف کر دیا۔ وہ ساری عمر لکھنؤ میں رہے آخری عمر میں آنکھوں کے علاج کیلئے واجد علی شاہ کے ایماء پر کلکتہ گئے اور مرشد آباد عظیم آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ واپس آئے اور وہیں ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں وفات پائی

مرثیہ گوئی میں انیس اور دبیر کے طرز جدا جدا ہیں دبیر کے ہاں درد خیز کنایات تشبیہات و استعارات شاعرانہ استدلال شوکتِ الفاظ، خیال آفرینی، دقت پسندی، مضمون بندی پر زیادہ زور ہے اس کے ساتھ مناظر کی تصویر کشی، جذبات نگاری، الفاظ کی سلاست اور فصاحت و بلاغت کی بھی کمی نہیں ہے۔

www.taemeernews.com

دیا شنکر نسیم

(مثنوی)

(گل بکاؤلی) جاگی مرغِ سحر کے غُل سے
اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
مُنھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پُرآب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
کرتی تھی، بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

صُورت میں خیال رہ گئی وُہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وُہ

(غزل) لائے اُس بُت کو التجا کر کے — کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ساقی قدحِ شراب دے دے — مہتاب میں آفتاب دے دے

عشق کے رُتبے کے آگے آسماں بھی پست ہے — سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

بہارِ رفتہ پھری اب ترے تماشہ کو — چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

پنڈت دیا شنکر نام نسیم تخلص، ۱۸۱۱ء/۱۲۲۶ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول۔ نسیم ایک معزز کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اُردو اور فارسی کی اچھی تعلیم پائی تھی۔ بعہدِ امجد علی شاہ فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آتش کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ نسیم کو یہ طرز کچھ ایسا پسند آیا کہ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں (میر حسن کی تصنیف کے نصف صدی بعد) گُل بکاؤلی کے مقبولِ عام قصّہ کو نظم کا جامہ پہنایا۔ اور "مثنوی گلزارِ نسیم" نام رکھا۔ عالمِ شباب میں بمقام لکھنؤ ۱۸۴۳ء/۱۲۵۹ھ میں انتقال کیا۔ اُردو زبان میں اَن گنت مثنویاں لکھی گئیں لیکن جو شہرت اور قبولِ عام مثنوی "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کو حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ مثنوی گلزارِ نسیم ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں واقعہ نگاری، جذبات نگاری، ایجاز و اختصار، رمز و اشارہ، تشبیہ و تمثیل، صنائع و بدائع غرض تمام شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ بیان کے اعتبار سے نظم اتنی مربوط ہے کہ اگر ایک شعر بیچ میں سے نکال لیجئے تو ساری داستان درہم برہم ہو جاتی ہے۔ غزل میں بھی نسیم کا رنگ عاشقانہ اور سادہ ہے۔

www.taemeernews.com

امیر مینائی

مبارک اشکِ سلگی قسمت مسلماں ہو گئے
خاتمِ اسلام ہاتھ آئی سلیماں ہو گئے

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب، وطن سے نکل گیا

ہر جگہ، جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا

مرغانِ باغ! تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں، سو چمن سے نکل گیا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم
آج کعبہ بن گیا، کل تک یہی بت خانہ تھا

دیکھ اے درد، جدا ہو نہ دلِ محزوں سے
اور الجھے گا یہ بیمار، جو تنہا ہوگا

نہ کر اے یاس، یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے، چراغِ آرزو برسوں

دنیا ہے، طرفہ میکدۂ بے خودی امیر
سب مست ہیں، کسی کو کسی کی خبر نہیں

زاہد، امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

منشی امیر احمد مینائی نام، امیر تخلص، لکھنؤ وطن، مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ہیں۔ مولوی کرم احمد کے صاحبزادے ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مفتی محمد سعد اللہ وغیرہ سے تعلیم حاصل کی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے اصلاح لی۔ جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ "ارشاد السلطان" اور "ہدایۃ السلطان" کتابیں اُن کے دربار میں پیش کیں، اس پر خلعتِ فاخرہ عطا ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور گئے۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے قدر دانی کی، اور اپنا کلام دکھایا۔ اُس وقت رام پور میں اہلِ کمال کا جمگھٹا تھا۔ نواب کے انتقال کے بعد سب سے پہلے مرزا داغ حیدر آباد دکن گئے۔ پھر امیر مینائی بھی پہنچے لیکن چند روز کے بعد سنہ ۱۹۰۰ء/۱۳۱۸ھ میں وہیں وفات پائی۔ "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" کلام کے مجموعے ہیں "امیر اللغات" کی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ امیر و داغ، دورِ آخر میں آسمانِ شاعری کے مہر و ماہ تھے۔ امیر کا رجحان مضمون آفرینی کی طرف تھا۔ وہ نازک خیالی کے ساتھ ساتھ شکوہِ الفاظ سے بھی دست بردار نہیں ہوتے تھے۔ اگرچہ وقت پسندی کو جائز نہیں رکھتے تھے۔ اُن میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جیسے جیسے بوڑھے ہوتے گئے کلام میں جوانی کی امنگیں اُبھرتی گئیں۔

www.taemeernews.com

فصیح الملک داغ

اُمیدِ کرم ہو کہ ہم مے سے کریں توبہ
دوزخ میں پڑے زاہدِ بے لطف ثواب ایسا

خدا کریم ہے یوں تو، مگر ہے اِتنا شک
کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

عمر کیوں کر نہ بسر کیجیے مے غافل ہو کر
کہ ملا ہے ہمیں، اک قطرۂ مے دل ہو کر

دل میں سما گئی ہیں، قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا، کسی کی نگاہ میں

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اِس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

دُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر، وہ یہ کہتے ہیں
تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر

اُدھر جاتا ہے دیکھیں، یا اِدھر پروانہ آتا ہے
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی، غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

سو حُسن اُبلتے ہیں، سو ناز برستے ہیں
اے صہلِ علی تجھ میں کیا شان نکلتی ہے!

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں!

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان، جہانِ استاد وغیرہ خطابات۔ نواب شمس الدین خاں (خاندانِ لوہارو) کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ اُن کی والدہ نے شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) سے نکاح کر لیا۔ اور "شوکت محل" کا خطاب پایا۔ اسی بنا پر داغ کی تعلیم و تربیت لال قلعہ میں ہوئی۔ شعر و سخن میں ذوق کے شاگرد ہوئے، کیونکہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا فخرو دونوں انہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا تو داغ کو بھی لال قلعہ چھوڑنا پڑا۔ یہ مصیبت کیا کم تھی کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ اس ہنگامے کے بعد رام پور آئے۔ نواب کلب علی خاں نے بڑی قدر کی۔ اُن کے انتقال کے بعد حیدر آباد دکن گئے۔ اور خسرو دکن میر محبوب علی خاں نے مشورۂ سخن سے اعزاز بڑھایا۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں بلبلِ ہندوستان کی شیوا بیانی ختم ہو گئی۔ داغ اپنے رنگ کے موجد، خوش طبع اور رنگین مزاج تھے۔ اُن کی شاعری میں یہ تمام خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ زبان میں فصاحت اور برجستگی اور بیان میں شوخی اور بانکپن موجود ہے۔ پورے کلام میں محاورے کا دریا موجیں مار رہا ہے۔

www.taemeernews.com

خواجہ حالی

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

رہا ہوں رند بھی اے شیخ، پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں، رند و پارسا، اک ایک

تعزیرِ جرمِ عشق ہے، بے صرفہ، محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ، یاں سزا کے بعد

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیئے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
(مسدس حالی) ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

وہ جہل کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

خواجہ الطاف حسین نام، حالی تخلص، ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاری سے ملتا ہے۔ آبا و اجداد شاہ بلبن کے عہد میں ہرات سے آکر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ خواجہ حالی بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے دہلی چلے گئے اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا اور ان کے فیضِ صحبت میں حالی کی شاعری چمکی۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت کی۔ یہاں ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنی پڑتی تھی اس سے ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرزِ ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔ لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس ہو کر چلے گئے اور وہیں ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ میں پانی پت میں وفات پائی۔

مولانا حالی عصرِ اصلاح کے علمبرداروں اور تحریکِ جدید کے حامیوں میں ایک سرگرم رکن ہیں۔ وہ ان مشہور لوگوں میں تھے جنہوں نے پرانے مدرسہ میں تعلیم پاکر ایسے کارہائے نمایاں کئے جن کی مثال تعلیمِ جدید ابتک پیدا نہیں کر سکی۔ ان کا مسدس جو سرسید کی تحریک سے لکھا گیا تھا ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اردو دیوان کا مبسوط مقدمہ دیکھنے کے قابل ہے، یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے۔ وہ اردو میں سیرت نگاری، تنقید، قومی شاعری اور نیچرل شاعری کے موجد ہیں

www.taemeernews.com

اکبر الٰہ آبادی

ہر رگِ گل پر فلک کے برچھے ہر اک جانب تنے ہوتے ہیں
یہی سب ہے جنت اگر جو طفل یا دل بنے ہوتے ہیں

ہم آدمی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے
غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

وک مکس ناتمام پہ، عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اتنا
اُسے کشتی نہیں ملتی، اِسے ساحل نہیں ملتا

بہت آساں ہے یاروں میں، معاذ اللہ کہہ دینا
ڈور کو سلجھا رہا ہے، اور سرا ملتا نہیں

ورز لیوشن کی شورش ہے مگر اُس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

بہت مشکل ہے بچنا، بادۂ گلگوں سے خلوت میں
فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، لسان العصر لقب، خان بہادر خطاب۔ ولادت ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ وطن الٰہ آباد والد کا نام سید تفضل حسین رضوی تھا۔ مورثِ اعلیٰ سید علی عرب، نیشاپور (ایران) سے ۱۲۳۴ء/۶۳۲ھ میں ہندوستان آئے تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم اُن کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اِس لئے فلسفہ اور تصوف کا غلبہ ہو گیا۔ انگریزی کی استعداد انہوں نے خود پیدا کر لی تھی ۱۸۶۶ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اس کے بعد نائب تحصیلدار ہوئے ۱۸۸۱ء میں منصف ہو گئے پھر ۱۸۸۸ء میں سب جج پر ترقی دی گئی ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہوئے ۱۹۰۷ء میں پنشن لی اور ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں الٰہ آباد میں انتقال کیا۔ لسان العصر سید اکبر حسین، بذلہ سنج اور ظریف تھے شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی وحید الدین وحید شاگرد مصحفی سے تلمذ تھا۔ اکبر اُردو شاعری میں ایک نئی طرز کے مُوجد تھے وہ اِس رنگ کے بانی بھی تھے، اور خاتم بھی ادب اور سوسائٹی کے نقاد اور حکومت و سیاست کے نکتہ چیں تھے اُن کی شاعری اُن تمام ادبی اور معاشرتی رجحانات کی حامل ہے جو ہندوستان میں مغرب کے اوّلین اثرات کے ردِ عمل سے پیدا ہوئے۔ اگر ایک طرف وہ حالی اور شبلی کی طرح حال کے شاعر تھے تو دوسری طرف وہ اقبال کی طرح استقبال کے شاعر بھی تھے۔ اکبر کی شاعری کا مطالعہ ہماری سوسائٹی کی ذہنیت کا ایسا زندہ مرقع پیش کرتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اُن کی شاعری محض گل و بلبل ہی کی شاعری نہ تھی۔ بلکہ اِس کا ایک نصب العین تھا وہ طنز اور ظرافت کے بادشاہ تھے ہم اُن کی شاعری کے اندر ایک وسیع کائنات پاتے ہیں

www.taemeernews.com

شاد عظیم آبادی

اب اپنی عمر شیشۂ نازک کا جام ہے
بس اک ذرا سی ٹھیس میں قصہ تمام ہے

شاد ایسے میں نہ توڑا تھا بھلے کو میں نے
پھول پر ہاتھ بڑھایا تھا کہ دل یاد آیا

چشمِ بینا میں کہاں ٹکتی ہے دو دن کی بہار
گل جو کھلتے ہیں تو ہنس دیتا ہے شیدا اُس کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

میں اور سیرِ لالہ و گل، ہجرِ یار میں
کیسی بہار، آگ لگا دو، بہار میں

تکیہ وعدہ پہ ہے اب چپکے پڑے ہیں تہِ خاک
ہزاروں شکر ترے دیدار میں بتلائے گئے

یہ بزمِ مے ہے۔ یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا خود تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل شب کو وہ قیدی چھوٹ گیا

جب کسی نے حال پوچھا، رو دیا
چشمِ تر، تو نے تو مجھ کو کھو دیا

حشر کا دن جو نہ آیا، تو قیامت ہوگی
کہیں کا میں نہ رہا تھا، اگر یقیں ہوتا

سید علی محمد نام، شاد تخلص ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے نادر شاہ کے حملہ کے بعد ان کے بزرگ دہلی سے پٹنہ چلے گئے تھے۔ والد کا نام سید عباس مرزا تھا۔ ادبی تربیت میر سید محمد کے ذمہ تھی جو اُردو زبان کے محقق تھے۔ انہی کی تربیت کا اثر تھا جس نے آئندہ چل کر شاد کی زبان کو اس قدر فصیح و بلیغ کر دیا۔ شاد کی شاعری کا دور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ کلام کی اصلاح شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی نے کی جو انشا کے شاگرد تھے اور اُن کو خواجہ میر درد دہلوی سے تلمذ تھا۔ شاد نے اپنی تمام عمر اردو ادب کی خدمت میں گذاری خان بہادر کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ گورنمنٹ سے ملتا رہا۔ ۴۲ سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے ۱۹۲۷ء/۱۳۴۶ھ میں پٹنہ میں انتقال کیا

شاد کے کلام میں اخلاق فلسفہ اور توحید کا عنصر غالب ہے۔ چونکہ بہت سے کہنہ مشق استادوں کی صحبت اٹھائی تھی کلام میں پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ میر انیس اور دبیر کی صحبتوں میں رہ چکے تھے اس لئے مرثیے میں زبان و خیال کے اعتبار سے میر انیس کی پیروی کرتے ہیں شاد کا کلام صاف ستھرا ہے مضمون آفرینی کم ہے۔ باتوں ہی باتوں میں مضمون پیدا کر لیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی بات کہہ گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

ریاض خیرآبادی

چھا ما رہا ہے جس کی ادا پر نمود تھی
پہلی ٹھیر کی اٹھی نگہ انتخاب کی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے، تو دُنیا بدل گئی

آتے آتے ترے لب تک جو جشم بن جائے
اِس ادا سے کبھی ہم سے بھی ہو، پیماں کوئی

چھلکائیں، لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

توبہ سے ڈرایا مجھے، ساقی نے یہ کہہ کر
توبہ شکنی کے لیے، اصرار نہ ہوگا

سامنے ڈھیر ہیں، ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دِل کا

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
عالمِ ہُو میں اِک آواز سی آجاتی ہے

بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی
کہ ڈھونڈھتا ہوں مگر آشیاں نہیں ملتا

نشیمن میں گزرے، کئی موسمِ گل
قفس میں جو ٹوٹے تھے، وہ پَر نہ نکلے

کیا حسرت سے رخصت، صبح کے تاروں کو یہ کہہ کر
کہ جن کا شام سے تھا آسرا، اب تک نہیں آئے

ریاض احمد نام، ریاض تخلص، ۱۸۵۲ء (۱۲۷۰ھ) میں خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ بزرگ ایران کے رہنے والے تھے مورثِ اعلیٰ خلجیوں کے عہد میں ہندوستان آئے اور خیرآباد میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید طفیل احمد سے پائی اور شاعری میں اسیر لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور استاد کا نام روشن کیا۔ زندگی کا زیادہ حصہ گورکھپور میں گذارا۔ ۱۹۳۲ء (۱۳۵۲ھ) میں خیرآباد میں وفات پائی۔ ریاض پاک نفس، دریادل اور سچے مسلمان تھے، اُن کا رندانہ رنگ محض اُن کی شاعری تک محدود تھا۔ جو رنگ قال میں دیکھا وہ اُن کا حال نہ تھا، بلا کے پُرگو تھے اُن کی خمریات کا کیا کہنا انہوں نے شراب اور مضامینِ شراب کو جس طرح اشعار میں سمویا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ۱۳۶۶ شعر شراب کے لکھے ہیں اُن میں سے ہر شعر ایک نئے پہلو کا آئینہ دار ہے۔ ریاض عوام الناس کے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے ہر استعداد کا آدمی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک خاص لطف ہے جو زبان، اندازِ بیان کی برجستگی اور جدت طرازی سے پیدا ہوتا ہے۔ ریاض کی شاعری خود اُن کی طرح چلبلی، شوخ، آزاد و بیباک ہے۔ اس پر اُن کے مخصوص اشارے اور کنائے اور بھی مزہ دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

صفی لکھنوی

غزل اُسنے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بیتابیوں سے
ہر انجام میں رنگِ آغاز دینا

حُسنِ مجاز چشمِ حقیقت پسند میں
خوش رنگ ہے ضرور، مگر دیرپا نہیں

دیکھ یوں تھک کے نہ بیٹھ اے دلِ حسرت انجام
قدمِ سعی، ابھی سرحدِ آغاز میں ہے

دنیا کا ورق بیشِ اربابِ نظر میں
اک تاش کا پتّا ہے کفِ شعبدہ گر میں

دل جب پریشاں ہو جمعیت ساماں ہے
ہر غنچۂ نورس کی مٹھی میں گلستاں ہے

دل کے اجزائے پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ جم ہوتا ہے

جونپور! اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ (نظم) تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ
کہہ رہا ہے قلعۂ شاہی یہ با حالِ تباہ مدتوں تک ہند کی ہم بھی رہے ہیں تخت گاہ
ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم ہم سے عبرت کا سبق لو، منظرِ عبرت ہیں ہم

سید علی نقی زیدی نام، صفی تخلص، لسان القوم خطاب، سنہ ۱۸۶۲ء/۱۲۷۹ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب حضرت زید الشہید بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ مورثِ اعلیٰ سید نور الدین شاہ مبارک زیدی بعہد سلطان شمس الدین التمش غزنی سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے لیکن پردادا سید احسان علی دہلی سے فیض آباد چلے گئے۔ والد سید فضل حسین، نواب امجد علی شاہ کے ولی عہد شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ کیننگ کالجیٹ اسکول لکھنؤ سے انٹرنس پاس کیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء سے محکمۂ دیوانی میں مختلف عہدوں پر رہ کر سنہ ۱۹۲۱ء میں پنشن لی اور سنہ ۱۹۵۰ء/۱۳۷۰ھ میں "بزمِ لکھنؤ" کی آخری شمع بجھ گئی۔ صفی ان مبارک ہستیوں میں تھے جنہوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری کا رُخ بدلا اور غزل کیلئے نئی عمارت تیار کی۔ ان کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا لیکن تلمذ کسی سے نہ تھا۔ اُن کی غزلوں میں جدت ضرور ہے لیکن وہ غزل گو شاعر نہیں ہیں اُن کی طبیعت کو نظموں سے زیادہ لگاؤ ہے قومی نظمیں بھی خوب کہتے تھے اُن کی بیانیہ شاعری کے سلسلے میں وہ نظمیں قابلِ ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان اور عمارات کا تذکرہ ہے۔ اُن چیزوں کو وہ دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں اور ہُو بہُو تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

سائل دہلوی

سائل تمہاری شعر کی تعریف کیا کریں
مضموں جو آیا ذہن میں سانچے میں ڈھل گیا

نغمۂ بلبل عجب اک دلگداز آواز ہے
اب یہ صاحب دل سمجھ لیں سوز ہے یا ساز ہے

پروانے مٹ رہے ہیں تری شمع بزم پر
یہ انجمن، اک اور، تری انجمن میں ہے

ایک گلشن میں ہے اک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسر نہیں یکجائی بھی

چارہ گر دل کہیں دیتا تو سمجھتا یہ بات
ہچکیاں ہیں کہ یہ آوازِ شکستِ دل ہے

یہ پانی وہ ہے کہ داغِ گناہ دھوتا ہے
اس خطر سے سارے پیراہن کی کر دیں دھجیاں

اشکِ خوں دامن پہ میرے داغِ رسوائی نہ ہو
ہمیشہ خونِ دل رویا ہوں میں، لیکن سلیقہ سے

نہ قطرہ آستیں پر ہے، نہ دھبا جیب و دامن پر
تیغ نہ تھی، ادا تو تھی، نیتِ قتل کیوں پھری

میں نے یہ کب کہا کہ یوں، میں نے نہیں کہا کہ یوں
شباب کر دیا میرا تباہ، الفت نے

خزاں کے ہاتھ کی، بوئی ہوئی بہار ہوں میں
ہوا ہوں اشکِ ندامت سے پاک دامن میں

نواب سراج الدین احمد خاں نام، سائل تخلص، ابو المعظم لقب، تاریخی نام "مرزا سراج دین خاں" ہے یہ نام مرزا غالب نے نکالا تھا۔ اور تخلص نواب غلام حسین خاں محمود شاگرد مرزا غالب نے قرعہ اندازی کے بعد رکھا تھا سائل صاحب نوابانِ لوہارو کے چشم و چراغ تھے یہ خاندان فضل و کمال کے ساتھ ساتھ دنیاوی وجاہت میں بھی امتیاز رکھتا ہے نواب الٰہی بخش خاں معروف اور نواب مرزا خاں داغ اس خاندان میں نامور شعراء گذرے ہیں مرزا غالب کو بھی اس سے نسبتی تعلق ہے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خاں رخشاں، نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب (سائل کے جدِ امجد و پدر بزرگوار) نواب سعید الدین احمد خاں طالب (سائل کے عمِ محترم) دہلی اور لوہارو کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

سائل صاحب ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۴۵ء/۱۳۶۵ھ میں وہیں وفات پائی۔ عربی، فارسی، سنسکرت، علم عروض و طب میں کافی واقفیت تھی۔ شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ فصیح الملک مرزا داغ کے شاگرد اور داماد تھے خود فرماتے ہیں

ظہیر وارثِ دو غالب کا ہوں جگر گوشہ
جنابِ داغ کا تلمیذ و یادگار ہوں میں

سائل کا کلام دلی کی شاعری کا نمونہ ہے۔ معاملہ بندی اور روزمرہ کی گھلاوٹ ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔

www.taemeernews.com

امجد حیدرآبادی

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی
میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری
تنزّل میں ترقی کر رہا ہوں

امجد ——— مورخہ ۱۸ ماہ ۴ سنہ ۱۹۴۷ء

(رباعیات)

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردہ کے بعد ادراک پردہ نظر آتا ہے

وہ کرتے ہیں سب چھپ کر تدبیر اسے کہتے ہیں
ہم ڈھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

ہیں مستِ مے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعیِ نمود، تو بھی، میں بھی

یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود، تو بھی، میں بھی

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے

ظالم سہی - جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

سید احمد حسین نام، امجد تخلص، سنہ ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد دکن وطن ہے۔ والد صوفی سید رحیم علی بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے جن کا انتقال امجد کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ مکتب کی ابتدائی مذہبی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن میں درس نظامیہ کا درس لیا اور مولانا نادر الدین اور نواب آقا سید علی شوشتری جیسے عربی اور فارسی کے علماء کی صحبتوں میں ادبی مذاق اور بصیرت کی تشکیل ہوئی۔ ریاست حیدرآباد میں ۲۵ سال تک مددگار محاسب رہے اب وظیفہ حسن خدمت حاصل کر کے پُرسکون زندگی گذار رہے ہیں سنہ ۱۹۰۸ء میں رودِ موسیٰ کی طغیانی میں ماں، بیوی اور بچی تہ آب ہوئے اس واقعہ نے امجد کی طبیعت کا رنگ ہی بدل ڈالا اور وہ تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔

امجد ایک کہنہ مشق شاعر ہیں سادگی، تاثیر اور گداز، اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ امجد نے یوں تو نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی مگر اُن کی شہرت کی بنیاد اُن کی رباعیات پر ہے جن میں قرآنی نکات اور حدیثوں کی تضمین ہوتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اُن کی رباعیات حقائق و معارف، توحید و رسالت، عبادتِ الٰہی، اخلاق و فلسفہ اور تصوف پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

www.taemeernews.com

فصاحت جنگ جلیل

آنکھوں میں یوں ہے ابھی نکلی گئی
کسی کی تصویر مرے آشنا روبرو ہے

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

شراب عشق کی مستی، عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش، تو پھر عمر بھر نہیں آتا

تم آکر سیر تو دیکھو، ہمارے دیدۂ تر کی
کہ موجیں لے رہا ہے آج کل دریا محبت کا

پئے تعظیم دردِ دل جو اُٹھا
مرے دل میں ہوا کس کا گذر آج

یار تک پہنچا دیا۔ بے تابیِ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

سیر کا لطف۔ خیالِ گل و گلشن میں رہا
میں قفس میں بھی رہا یوں، کہ نشیمن میں رہا

قاصد پیامِ شوق کو۔ دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ اُن سے کہ، آنکھیں ترس گئیں

وہ اُٹھے، درد اُٹھا، حشر اُٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقیں نہ ہو تو دیکھ لو اُٹھا کے مجھے

آتے آتے آئے گا اُن کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

جلیل حسن نام جلیل تخلص، جلیل القدر فصاحت جنگ خطاب ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں اپنے وطن مانک پور (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی حافظ عبدالکریم تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی و عربی کی استعداد لکھنؤ میں بہم پہنچائی۔ بیس برس کی عمر میں امیر مینائی کے شاگرد ہوئے اور زیادہ تر اُن کے ساتھ رہے ۱۹۰۰ء میں اپنے استاد کے ہمراہ حیدرآباد دکن گئے۔ ۱۹۰۸ء میں میر محبوب علی خاں مرحوم سابق خسرو دکن نے پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور داغ مرحوم کی جگہ اپنی استادی کا شرف بخشا۔ میر عثمان علی خاں نے بھی انہی کو اپنا کلام دکھایا۔

کاروانِ امیر کا یہ آخری مسافر عمر کی ۷۰ منزلیں طے کر کے آخر ۱۹۴۶ء/۱۳۶۶ھ میں دوسری دنیا کو سدھارا۔ اور حیدرآباد دکن میں سپردِ خاک ہوا۔

حافظ جلیل حسن امیر مینائی کے شاگردِ خاص اور جانشین اور اردو شاعری میں اپنے استاد کے رنگ کے حقیقی امانت دار تھے۔ اُن کے کلام میں امیر کی ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں اور زبان کے لطف پر اُن کی شاعری کی عمارت قائم ہے

www.taemeernews.com

سرورؔ جہان آبادی

یہ نسیم ٹھنڈی، ٹھنڈی، یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری، دلِ بے قرار سو جا
محوِ سکوت ہیں، لبِ رنگیں نوائے داغ
پھولوں میں اب ہے داغ کہ بوئے قبائے داغ
شب کہ وقفِ بالشِ تمکیں دلِ بے تاب تھا
عالمِ رؤیا میں، میں سرمستِ ذوقِ خواب تھا
صد چاک تیرے عشق میں جیبِ قبائے گُل
دیوانہ ہوئی، دامن کی ہر کلی میں ہے بُوئے وفائے گُل
آہ، اوفتھے سے کیڑے، نازشِ صحرا ہے تُو
دشت میں، اک سُرخ چھوٹا سا گُلِ رعنا ہے تُو
برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی
جلوۂ گل ہے فضائے وادیِ پُرخار میں
سُرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کُہسار میں
رنگ آمیزی ہے، قدرت کی تری تصویر میں
اک دل آویزی ہے قدرت کی تری تصویر میں
بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے
عالمِ نیرنگِ افسوں، تیرے مے خانے میں ہے
ناز ہے صحرا کو تیری شوخیِ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کُہسار پر

درگا سہائے نام، سرورؔ تخلص، سنہ ۱۸۷۳ء / ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ایک معتبر کائستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام حکیم پیارے لال تھا۔ تھوڑی سی عمر میں شہرت و ناموری کے آسمان پر چمکے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ مولوی کرامت حسین بہار سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد میں بیانؔ و یزدانی کی شاگردی اختیار کی۔ شروع میں وحشتؔ تخلص تھا پھر سرورؔ رکھ لیا۔ ۱۸۹۹ء سے اُن کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہونے لگا۔ سرورؔ نہایت اُمنگ کے ساتھ اشعار میں اپنی خوش دلی کا ثبوت دے رہے تھے کہ دفعتاً اُن کے اکلوتے بیٹے کا جسے اُس کی ماں ایک سال کا چھوڑ کر مر چکی تھی انتقال ہو گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ نے سرورؔ کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اُسی وقت سے غم غلط کرنے کیلئے مے نوشی اختیار کی۔ اور آخر میں اس قدر پینے لگے کہ کئی کئی روز تک مدہوش رہتے تھے۔ آخر سنہ ۱۹۱۰ء / ۱۳۲۸ھ میں بعمر ۳۷ سال انتقال کیا۔ سرورؔ کو اُردو شاعری کے طرزِ جدید کا ایک رکن سمجھنا چاہیئے۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے غزل کی بجائے نظم کہنی شروع کی۔ اور یوں پرانی روش سے ہٹ گئے۔ حُبُّ الوطنی کے مضامین باندھنے کے علاوہ اُن کی شاعری کی ایک خصوصیت جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔ اُن کے کلام میں سوز و گداز پایا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

ذہن جدید

www.taemeernews.com

علامہ اقبال

مسلم خوابیدہ اُٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر! گرمِ تقاضا تو بھی ہو

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ، بال و پرِ روح الامیں پیدا

کوئی اندازہ کر سکتا ہے، اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں، یہ مردوں کی شمشیریں

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے، داستاں میری

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی کچھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

متاعِ بے بہا ہے، درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر، نہ لوں شانِ خداوندی

نہ کر تقلید اے جبریلؑ، میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طوافِ اولیٰ

بجلی ہوں، نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

کافر ہے تو ہے، تابعِ تقدیرِ مسلماں
مومن ہے، تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ترے آزاد بندوں کی، نہ یہ دُنیا، نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

محمد اقبال نام، اقبالؔ تخلص، ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اقبال کو شمس العلماء مولوی سید میر حسن اور پروفیسر آرنلڈ جیسے شفیق استاد ملے جن کے فیضِ تربیت میں اُن کی فطری صلاحیتوں اور ذوقِ علمی کی نشو و نما ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ گئے اور وہاں سے پی ایچ ڈی اور بیرسٹری کی سندیں حاصل کیں۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابتداً ارشد گورگانی سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ بہت جلد اُن کے کلام کا آوازہ بلند ہو گیا۔ دنیا نے "شاعرِ مشرق" "ترجمانِ حقیقت" اور "علامہ" کے خطابات سے نوازا۔ ۱۹۲۳ء میں "سر" کا خطاب ملا۔ اور ۱۹۳۸ء (۱۳۵۷ھ) میں لاہور میں وفات پائی۔

اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت کی وسعتوں کا سمیٹنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی تھے، اور اردو، فارسی کے قادر الکلام اور بالغ نظر شاعر بھی۔ اُن کی شاعری میں جو "قومی" ہے سرود و نغمہ بھی ہے اور آہ و شیون بھی۔ اُن کے کلام میں سبق ہے، پیام ہے، دعوتِ فکر و عمل ہے۔ اُنہوں نے اُردو زبان کو خیالات اور الفاظ و تراکیب کا بڑا سرمایہ عطا کیا اور زبانِ شعر میں وہ حقائق و معارف بیان کئے جن کو بہت سے لوگ محسوس تو کرتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے

www.taemeernews.com

حسرت موہانی

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
تری جنوں خدا سلسلہ دراز کرے

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی جاتی

سید فضل الحسن نام حسرت تخلص "امام المتغزلین" خطاب سید اظہر حسن کے صاحبزادے ۱۲۹۵ھ میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ جدِ اعلیٰ سید محمود نیشاپوری ہندوستان آئے، اور موہان میں سکونت اختیار کی۔ حسرت کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے کیا۔ یہیں اُن کی شاعری پروان چڑھی۔ مئی ۱۹۵۱ء ۱۳۷۱ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ مولانا حسرت کو شاعری میں تسلیم لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ تسلیم کا سلسلہ نسیم دہلوی کے توسط سے حکیم مومن خاں تک پہنچتا ہے لیکن حسرت پر اس سلسلے کے علاوہ اور اساتذہ کا بھی اثر پڑا ہے۔ کہتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت اگر ایک طرف متقدر سیاستدان تھے تو دوسری طرف اُردو کے مایۂ ناز شاعر اور بالغ نظر نقاد۔ انہوں نے متقدمین و متاخرین شعرائے اردو کے کلام کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ایک خاص ترتیب سے اُن کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا۔ انہوں نے تمام عمر جو کچھ کہا غزل کی حدود کے اندر رہ کر کہا۔ وہ خصوصیت سے عاشقانہ، عارفانہ اور فلسفیانہ اشعار کہتے تھے اُن کے کلام میں داخلی رنگ پایا جاتا ہے جو دہلی کا طغرائے امتیاز ہے انکی شاعرانہ فطرت نے انکی زندگی پر اور انکے سوانح حیات نے انکی شاعری پر اثر ڈالا ہے وہ اردو شاعری اور اردو غزل کے لئے مایۂ ناز ہیں اور شاعری کے جدید انقلاب میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے

www.taemeernews.com

فانی بدایونی

اُس کی ہستی سے جُدا میرا وجود اللہ رے وہم
بُلبلہ ہے عینِ دریا، پھر بھی دامن چیدہ ہے
نشانِ مہر ہے ہر ذرہ، ظرفِ مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا، اور کہیں خدا نہ ملا
بس ایک آہِ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خارِ برق، قفس، دامِ آسماں، صیاد
مری حیات ہے، محرُوم مدعائے حیات
وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا
خُدا نے زہر کی تاثیر بخش دی فانی
ترس گئی تھی اثر کو بہت، دوا میری

نہیں ضرور کہ مرجائیں جاں نثار ترے — یہی ہے موت، کہ جینا حرام ہو جائے
بھڑک کے شعلۂ گل، تو ہی اب لگائے آگ — کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا
تجلیاتِ وہم ہیں، مشاہداتِ آب و گِل — کرشمۂ حیات ہے خیال، وہ بھی خواب کا
تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ — بس اب خُدا ہی خُدا ہے، نگاہ والوں کا
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلُوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلُوم

شوکت علی خاں نام، فانی تخلص، ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ میں پیدا ہوئے۔ والد شجاعت علی خاں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے بزرگ کابل سے شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں دہلی آئے۔ جدِ امجد نواب بشارت خاں صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے فانی نے ۱۹۰۱ء میں بریلی سے بی اے کیا پھر علی گڑھ سے وکالت کی ڈگری لی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے اُن کی زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں کی داستان ہے ہمیشہ کشاکشِ حیات سے پریشان رہے ۱۹۴۱ء/۱۳۵۹ھ میں انتقال کیا

فانی ایک وارفتہ مزاج انسان تھے۔ عاشقانہ طبیعت پائی تھی۔ زندگی کی تلخیوں نے انہیں انفرادیت پسند اور حساس شاعر بنا دیا تھا۔ وہ مکمل غزل گو شاعر تھے، لیکن اُن کا اندازِ بیان غزل گو شعرا سے بالکل مختلف ہے۔ اُن کے احساس کی شدت کا اثر اُن کی شاعری کے محاسن پر بھی پڑا جس نے اُن کی شاعری کو عام معیار سے بلند کر دیا۔ فانی کا رنج و غم گہرا اور فلسفیانہ ہے۔ اُن کے کلام میں خواہشِ مرگ کی تکرار، فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش، جنون و حکمت، عقل و دل، علم و عشق، کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ عام روش سے ہٹ کر انھوں نے قدیم و فرسودہ خیالات میں بھی ایک تازگی پیدا کر دی ہے۔

www.taemeernews.com

سیماب اکبرآبادی

باقی ہر فنا کے بعد بھی وہ سیماب
جس کا دنیا میں نام باقی رہ جائے

جب تک غمِ الفت کا عنصر نہ ملا ہوگا
انسان کے پہلو میں، دل بن نہ سکا ہوگا

ہو کتنی ہی خوشگوار، پھر بھی
ہے دل کے لئے بلا، تمنا

نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی
میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا

ہستی و نیستی کی حدیں دُور، رہ گئیں
یہ آگیا کہاں میں، تجھے ڈھونڈھتا ہوا

کبھی پھول بن کر، کبھی اشک بن کر
ہر رنگینیِ دامن و آستیں تم

مرا دل ہے ترے جلووں کی خلوت، میں نہ سمجھا تھا
حقیقت یہ ہے، خود اپنی حقیقت، میں نہ سمجھا تھا

ہر چیز پر بہار تھی، ہر شے پہ حُسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

کہیں پُر شور ہے ساحل، کہیں ہنگامہ زا محفل
قیامت بن کے اک شورش ہے دنیا میں اُتر آئی

وطن کے شیفتہ سرشار، احسانِ وطن سے ہیں
فدا ہیں ملت مرحوم پر، ملت کے شیدائی

عاشق حسین نام، سیماب تخلص، سنہ ۱۸۸۰ء / ۱۲۹۸ھ میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ مولوی محمد حسین صدیقی کے صاحبزادے ہیں۔ عربی ادب، اصول منطق اور فارسی پڑھ کر انگریزی شروع کی۔ ایف اے کے آخری سال میں تھے کہ والد نے انتقال کیا۔ اور سلسلۂ تعلیم بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ ریلوے کے محکمہ میں ملازمت کی۔ پھر فطری ذوق شعری اور خدمتِ زبان و ادب کے شوق میں ملازمت سے مستعفی ہو کر آگرہ چلے گئے اور ۱۹۲۱ء میں "مقصد الادب" کی بنیاد رکھی۔ پیمانہ، ثریا، شاعر اور اخبار تاج کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کی۔ فنِ شعر میں داغ سے تلمذ تھا۔ تلامذہ کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ مولانا ۱۹۴۷ء میں (پاکستان بن جانے کے بعد) آگرہ سے کراچی آئے اور ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔

سیماب غزل گو بھی ہیں اور نظم نگار بھی۔ فنِ شعر و عروض کے ماہر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ مقصدِ شاعری کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں "میں شاعری میں فلسفہ، حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اُس کے متعلقات ہوں۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشقِ محض ہے" اور اُن کی شاعری اُن کے اِس نظریہ کی آئینہ دار ہے۔

www.taemeernews.com

برج نرائن چکبست

دل دہلتے ہیں زنداں میں گرفتاروں کے
بیڑیاں ڈھونڈتے ہیں پاؤں وفاداروں کے

چمکتا ہے شہیدوں کا لہو قدرت کے پردے میں
شفق کا حسن کیا ہے پھول کی رنگیں قبا کیا ہے؟
فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا
یہ رنگِ شفق ہے کہ لہو اہلِ وفا کا
کچھ داغ نظر آتے ہیں دامانِ سحر میں
لئے دریا نے موتی، گل شجر نے، لعل پتھر نے
(اچھا جی) خریدا ہم نے سودا، دردِ اُلفت کا بشر ہو کر

دل کو سنبھالتا ہوا، آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے — گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

پنڈت برج نرائن چکبست، ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد کشمیر سے آئے تھے۔ تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کیا، پھر قانون کے امتحان میں کامیاب ہو کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ) میں ایک مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے تھے، یکایک فالج میں مبتلا ہوئے اور اسٹیشن ہی پر وفات پا گئے۔ محشر لکھنوی نے انہی کے مصرع سے تاریخ نکالی "موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا"۔ اردو ادب کو اُن کی ذات سے بڑی امیدیں تھیں۔ عجب اتفاق ہے کہ خود چکبست ایک شعر میں اپنی جواں مرگی کا افسوس کر گئے ہیں ؎

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب — لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

چکبست کسی کے شاگرد نہیں ہوئے لیکن اساتذۂ قدیم میں سے میر انیس، آتش اور غالب کا اثر اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ بزرگوں کے چمنستانِ سخن کے رنگ و بو سے کسبِ فیض کر کے انہوں نے قومی اور سیاسی نظمیں لکھیں۔ اُن کے ہاں فلسفیانہ خیالات بہت کم ہیں لیکن جو کچھ ہیں ان میں غالب کی تقلید ہے۔ انہوں نے نیچرل شاعری کی طرف پوری پوری توجہ کی۔ چکبست کے ہاں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اُن کی حب الوطنی اور قوم پرستی ہے۔ اُن کا سارا کلام اسی سے بھرا پڑا ہے۔ قوم پرستی کے جذبے سے متاثر ہو کر انہوں نے قومی مرثیے بھی لکھے ہیں۔

www.taemeernews.com

عزیز لکھنوی

میں تو بے ہوش ہوا، ذوقِ نظر سے اپنی
تیری تاثیر تھی، اے جلوۂ جانانہ جدا

اب بھی زیادہ عالمِ اسباب سے ہے وہ
جو کچھ کسی کے اُجڑے ہوئے دل میں رہ گیا

بسکہ تھی وسعتِ آرائشِ گیتی محدود
دونوں عالم کو ترے وصل کا ساماں سمجھا

کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

بے حقیقت دل کی ہستی کو وہ سمجھے تھے مگر
اس لہو کی بوند نے عالم، تہ و بالا کیا

دونوں جہان ہوں گے، اُن کا شباب ہوگا
زمانے بھر کو ہنسائے، ہمیں رُلائے بہار

دل کبھی تھا ہمارے پہلو میں
یہ خدا جانے بات ہے کب کی

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے،
نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے

دیکھ کر نظمِ دو عالم مجھے کہنا ہی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا

میں حشر کی حقیقت، اتنی سمجھ رہا ہوں
یہ اپنا اپنا مقدر، یہ اپنا اپنا نصیب

مرزا محمد ہادی نام، عزیز تخلص، سنہ ۱۸۸۲ء / ۱۳۰۰ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اُن کے والد مرزا محمد علی ایک زبردست عالم تھے۔ اصل وطن شیراز ہے۔ جدِ امجد مرزا محمد جعفر شیراز سے کشمیر آئے۔ کئی پشتوں سے ان کا خاندان لکھنؤ میں متوطن ہے اور اُس کا شمار شہر کے ذی علم خاندانوں میں ہے۔ عزیز نے عربی اور فارسی کی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ شاعری میں صفی لکھنوی سے استفادہ کیا۔ اور اُنیس برس کی عمر میں اچھے شعر کہنے لگے۔ سنہ ۱۹۳۵ء / ۱۳۵۴ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

جدید شاعری کے علمبرداروں اور غزل کے مصلحین نے لکھنؤ کی پرانی شاعری پر اثر ڈالا تھا۔ صفی خود اس انقلاب کے بانیوں میں تھے۔ عزیز پر استاد کا اثر پڑا۔ اور اُنہوں نے لکھنؤ کا رنگ چھوڑ کر دلی کے رنگ میں شاعری شروع کی۔ وہ لکھنؤ کے اس قسم کے شعرا کے پیش رو ہیں اور عام طور پر اُنہی کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔ اُن کی غزل میں میر اور غالب کی تقلید کے ساتھ ساتھ نئے ماحول اور نئے مذاق کا اثر بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ قابلِ قدر نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں۔ لیکن قصائد میں زیادہ کامیاب ہیں۔ نئے نئے موضوعات، حسنِ تخیل، نادر تشبیہات و تلمیحات، شکوہِ الفاظ اُن کے قصائد کی جان ہیں۔

www.taemeernews.com

اصغر گونڈوی

تیری ہنسی، تیری ہنسی، تیری ہنسی، قیامت
میری ہر اک حسرت میں چھپے ہر اک قصور میں

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک
دے مرکے ثبوت زندگی کا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اُسے غمِ جاناں بنا دیا

اے کاش، میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
بس اتنے پر ہوا، ہنگامۂ دار و رسن برپا

آدمی نہیں سنتا، آدمی کی باتوں کو
وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے

ایک ایک تنکے پر، سو شکستگی طاری
شورشِ عندلیب نے، روحِ چمن میں پھونک دی

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
کہ کے کچھ لالہ و گل، رکھ لیا پردہ میں نے

اب لطفِ خواب بھی نہیں، احساسِ خواب میں
کر لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو

پیکرِ عمل بن کر، غیب کی صدا ہو جا
جب مختصر کیا انہیں، انساں بنا دیا

برق بھی لرزتی ہے، میرے آشیانے سے
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

وہ پابندِ قفس، جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

اصغر حسین نام، اصغر تخلص، ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے لیکن اُن کے والد منشی تفضل حسین قانون گو نے ملازمت کے ساتھ سکونت بھی گونڈہ میں اختیار کر لی تھی، اس لئے اصغر گونڈوی کہلائے۔ شاعری میں پہلے وجد بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے پھر چند غزلیں تسلیم لکھنوی کو دکھائیں چونکہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کا شرف حاصل تھا اس لئے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ حکیمانہ ژرف نگاہی میں بادۂ تصوف کی سرمستی نے مل کر اُن کے کلام کو اور غزل گو شعرا کے کلام سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اُن کی شاعری میں جدت کے ساتھ ساتھ درد و اثر بھی پایا جاتا ہے اصغر اُن مبارک ہستیوں میں سے ہیں جنہوں نے غزل کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں الہ آباد میں وفات پائی

www.taemeernews.com

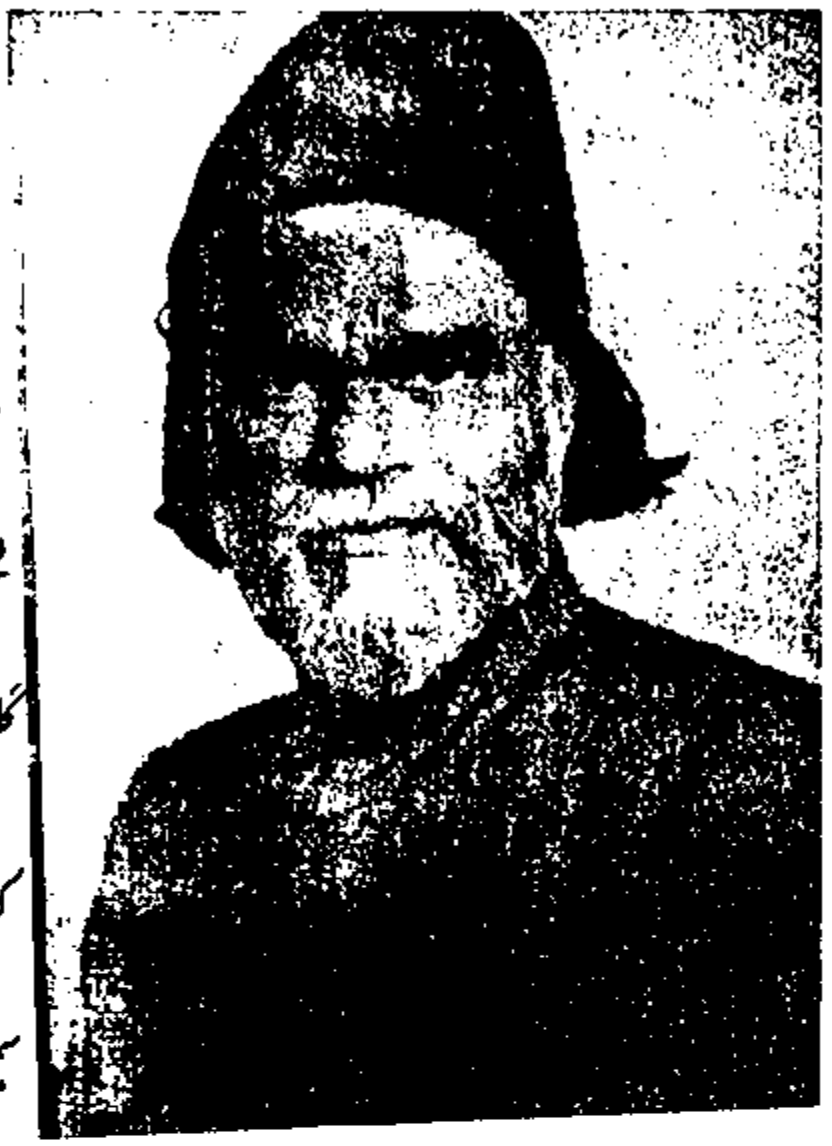

جگر مرادآبادی

مرے درد میں خلش کہاں، مرے سوز میں تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

اے چارہ ساز حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اِک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

گلشن پرست ہوں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

کیا آگیا خیال، دلِ بے قرار میں
خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

سمجھائے کون، بلبلِ غفلت شعار کو
محدود کر لیا ہے، چمن تک بہار کو

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اُٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی

حدودِ کوچۂ محبوب ہیں، وہیں سے شروع
جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں، ڈگمگاتے ہوئے

انہیں آنسو سمجھ کر، یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے، اور آنکھوں کی زبانی ہے

اے کاش، وہ حسرت زدۂ طور کو ملتی
جس آنکھ سے ہم، حسنِ بتاں دیکھ رہے ہیں

جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آگے ہوش کی مستی ہے
موت سے ڈرنا کیا معنی، موت بھی جزوِ ہستی ہے

ہر سُو دکھائی دیتے ہیں، وہ جلوہ گر مجھے
کیا کیا فریب دیتی ہے، میری نظر مجھے

علی سکندر نام، جگر تخلص، "رئیس المتغزلین" خطاب، سنہ ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۸ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام علی نظر تھا۔ اور نظر تخلص کرتے تھے۔ مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے اور شاہجہان کے استاد تھے۔ نشاطِ شاہی کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے مرادآباد چلے گئے۔ جگر نے میٹرک تک انگریزی پڑھی ہے۔ شاعری کا ذوق اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا۔ رسا کے شاگرد ہیں اور داغ کو بھی کلام دکھایا ہے۔

جگر ایک مکمل غزل گو شاعر ہیں۔ وہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں واردات حسن و عشق میں ڈوب جاتے ہیں اور کیف، وارفتگی اور بے خودی کی لہروں میں سننے والوں کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔ جگر کی شاعری "قال" نہیں سراپا "حال" ہے۔ اور اسی لئے اُس میں زندگی کی تازگی اور حرارت ہے۔ اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ وہ "مقطر" داغ ہیں۔ غزل کی جدید شاعری میں جن زبردست شخصیتوں نے انقلاب پیدا کیا ہے، اُن میں جگر بہت نمایاں ہیں۔

www.taemeernews.com

جوش ملیح آبادی

سمجھتا ہے مآلِ گل، مگر کیا جبرِ قدرت ہے
ستم ہوتے ہیں کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا
سوئی جو عقل، رُوح کو بیدار کر دیا
جس آنکھ کے پردہ میں جھلکتے رہیں آنسو
دراصل وہ سرچشمۂ انوارِ خدا ہے
چشمِ حواس بند ہے، مست ہوں سوز و ساز سے
ملنے چلا ہوں اس طرح حسنِ جنوں نواز سے
فنا ہو جا، جھلک اٹھے گا سینہ نورِ عرفاں سے
ابھی تو دل کے آئینے پہ، غافل، داغِ ہستی ہے

مگر راتوں کو جب فکرِ وطن میں سر جھکاتا ہوں
یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے
فضا میں جس طرح "رُوحُ الامیں" کی بال جنبانی
جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں
حقیقت کیا بتاؤں، اُس صدائے رُوح افزا کی
یہ مشرق محو ہے، صبحِ تجلی زار ہونے میں

(نظم)
فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں
صبا جس طرح، زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے
برستا ہو کہیں کچھ دُور، جیسے خواب میں پانی
ہوا کی سنسناہٹ جس طرح، گنجانِ صحرا میں
نہاں ہیں جس کے اندر، کاوشیں امروز و فردا کی
یہ رُوحِ ایشیا مصروف ہے، بیدار ہونے میں

بشیر حسن خاں نام، جوش تخلص، شاعرِ انقلاب، خطاب، ملیح آباد وطن، ۱۸۹۴ء/۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے بزرگ کابل سے ہندوستان آئے تھے، والد بشیر احمد خاں بشیر اور دادا نواب محمد احمد خاں احمد دونوں صاحبِ دیوان تھے۔ جوش کے پردادا نواب حسام الدولہ، تہور جنگ فقیر محمد خاں گویا (شاگردِ ناسخ) کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر کچھ عرصہ تک چند اسکولوں میں تعلیم پائی ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد دکن گئے اور دس سال تک عثمانیہ یونیورسٹی کے "دارالترجمہ" میں ملازمت کی جوش نے بچپن سے شعر کہنا شروع کیا۔ اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لی کچھ عرصہ تک غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتے رہے اس کے بعد اپنی توجہ نظم کی طرف مبذول کر دی جوش کی شاعری، اُن کے کردار اور سیرت کا آئینہ اور خود اُن پر گذری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے "شبابیات" اُن کا خاص موضوع ہے اُن کو زبان پر پوری قدرت ہے۔ اُن کے کلام میں اگر ایک طرف غنائی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں تو دوسری طرف انقلابی اور خصوصاً اشتراکی عنصر آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔

www.taemeernews.com

رضا علی وحشت

پھر کرے تازہ کشش پیدا حرم میرے لیے
محو آرائش ہے پھر بیت الصنم میرے لیے

خود بخود محسوس کی میں نے بھی دل میں تاب ضبط
جب گراں ہونے لگا بار الم میرے لیے

تیرے ہی ذوقِ جلوہ سے وا ہو گئی ہے چشم
یاں ورنہ امتیاز وجود و عدم نہ تھا

مَیں سادہ لوح واقفِ رسمِ بتاں نہ تھا
اقرارِ عشق کر کے گنہگار ہو گیا

زبانِ بے زبانی کہہ رہی ہے داستاں میری
شکایت سنج ہوں مَیں کس کے جورِ بے نہایت کا

کچھ کام نہ ملے نہ کبھی جستجو سے ہم
شرمندہ ہی رہے ہیں تری آرزو سے ہم

عالم پہ ہے چھایا ہوا ایک یاس کا عالم
یعنی کہ تمنا کے گرفتار بہت ہیں

انداز میں، شوخی میں، شرارت میں، حیا میں
واں ایک نہ اک بات نکلتی ہی رہے گی

ہزاروں حسرتوں کا نقش ہے آئینۂ دل پر
مرا سینہ ہے یا اک حیرت آباد تمنا ہے

رضا علی نام، وحشت تخلص ۱۸۹۴ء (۱۳۱۲ھ) میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی شمشاد علی۔ دادا حکیم غالب علی غدر ۱۸۵۷ء میں دہلی سے کلکتہ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وحشت کو شعر و شاعری سے فطری ذوق تھا فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد اور مولوی عبدالغفور نساخ کے بیٹے مولوی ابو قاسم سے تلمذ کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے امپیریل ریکارڈ ڈیپارٹمنٹ کلکتہ میں ملازم ہوئے۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج کلکتہ میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں "خان بہادر" کا خطاب ملا اور ۱۹۳۶ء میں پنشن ہو گئی۔ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے۔

وحشت نے طرزِ غالب اختیار کرنے میں جو کمال دکھایا، اس کو مولانا حالی کی زبان سے سنئے "وحشت نے میرزا غالب کے تتبع کا پورا پورا حق ادا کیا ہے"۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں "وحشت کے کلام میں جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرزِ ادا اُن سے خوب بن پڑتی ہے"۔ جہاں تک زبان اور اظہارِ خیال کا تعلق ہے وحشت نے بیشک طرزِ غالب کا صحیح چربہ اتارا ہے اور اُن کے کلام میں اسی انداز کی فارسی ترکیبیں پائی جاتی ہیں جن سے غالب کا نام روشن ہے۔ علوئے تخیل اور مضامین کی نزاکت میں غالب کی ہمسری کا دعویٰ تو انہیں بھی نہیں وہ صرف اس رنگِ خاص کے مقلد اور خاصے کامیاب مقلد ہیں۔ یہ چیز بجائے خود قابلِ تحسین ہے۔

www.taemeernews.com

حفیظ جالندھری

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنم ہی ترنم تھے، کنارے جوئباروں کے
ندا آئی دریچے کھول دو، ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے
ہوا عرشِ معلّٰی سے، نزولِ رحمتِ باری
تو استقبال کو اٹھی حرم کی چار دیواری
مبارک ہو کہ ختم المرسلین تشریف لے آئے
جنابِ رحمۃ للعالمین تشریف لے آئے
بصد اندازِ یکتائی، بغایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت، آمنہ کی گود میں آئی

نہ کوئی زُعمِ باطل تھا، نہ کوئی جوشِ ہنگامی
نہ فکرِ کامیابی تھی، نہ ذکرِ خوفِ ناکامی
نہ کثرت کی کوئی پروا، نہ قلت کا تھا غم اُن کو
نہ کچھ اندیشۂ پست و بلند و بیش و کم اُن کو
نہ تھے مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے
کہ ساماں پر نہیں، ایمان پر ایمان رکھتے تھے
معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے
ہم تری صورتِ انکار کو پہچانتے تو ہیں
وہ تبسم تو شریکِ لبِ گویائی کر،

(نغمۂ زارِ اسلام)
(غزل)

محمد حفیظ نام حفیظ تخلص، کنیت ابوالاثر، سنہ ۱۹۰۰ء ۱۳۱۸ھ میں پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے ان کا خاندان قدیم چوہان سورج بنسی راجپوت خاندان کی ایک شاخ ہے جو دو سو سال قبل مسلمان ہو گیا تھا حفیظ کی ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ مولانا غلام قادر گرامی سے اصلاح لی ۱۹۲۹ء میں پہلا مجموعہ "نغمہ زار" اُن کی شہرت کا باعث ہوا۔ "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" بعد کا کلام ہے حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ "شاہنامۂ اسلام" ہے

حفیظ نے مختلف حیثیتوں سے اُردو شاعری کو متاثر کیا ہے موضوعِ کلام مضمون و خیالات، بحور و قوافی، منظر کشی کا انداز، مناظر کا تجزیہ، تشبیہات و تلمیحات کے اعتبار سے اُن کی شاعری میں ایک نرالا پن ہے۔ انہوں نے اگر ایک طرف "نغمہ زار" اور "سوز و ساز" میں چھوٹی چھوٹی بحروں میں جذبات کے اظہار اور دردِ دل کی ہلکی دھنوں اور گیتوں کو سانچے میں ڈھالا تو دوسری طرف "شاہنامۂ اسلام" کی شکل میں واقعہ نگاری اور بیانیہ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا۔ وہ ہندی بحروں کو اُردو میں رائج، اور شعر میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنم اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں حفیظ بیک وقت "شاعرِ شباب" بھی ہیں اور "مرقع نگار" بھی

www.taemeernews.com

اختر شیرانی

پلائے جائیے جا خوب ساقی!
کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی

چھلک جائے نہ مینائے دو عالم
ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی!

اختر شیرانی

۱۲-۳-۴۷

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
خدائی کہکشاں کہتی ہے جس کو

مجھے مے خانہ تھرّاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
وہ سلمیٰ کا خرامِ رائیگاں ہے

ہے جامِ خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

یہ بھیگی رُت، یہ مستانہ ہوا، برسات کا موسم
یہ سیلِ نور ہے شراب ہو نہ سکا

ہیں بحرِ مے سے بہم میکدے میں شام و سحر
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

بہاروں کا سماں، یہ رس بھرے جذبات کا موسم
کہ ماہتاب قدح، آفتاب ہے ساقی

نام محمد داؤد خاں، تاریخی نام مسعود خسرو۔ اختر شیرانی کے نام سے دنیائے شاعری میں مشہور ہیں ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء/۱۳۶۸ھ میں بمقام لاہور انتقال ہوا۔ والد کا نام حافظ محمود خاں شیرانی بزرگ صوبہ سرحد سے آئے تھے دادا مولوی محمد اسمٰعیل خاں ٹونک کے نواب محمد علی خاں کے مختار تھے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں پائی مزید تعلیم کیلئے لاہور آئے کیونکہ اُن کے والد یہاں پروفیسر تھے اختر کا بیشتر زمانہ لاہور ہی میں گذرا۔ یہیں سے بہارستان، خیالستان، اور رومان ادبی رسائل نکالے ۱۹۳۷ء میں اُردو کی مشہور لغت "جامع اللغات" کی ادارت کی۔

اختر شیرانی کی شاعری فلسفہ و تصوف کے بجائے عشق مجازی کے لطیف جذبات اور وجد انگیز غنائیت سے معمور ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں اور اُن کی تمام شاعری پر جوانی چھائی ہوئی ہے۔ اُن کی شاعری کی روح تغزل ہے اور وہ اس روحِ تغزل اور غنائیت کو اپنی تمام شاعری پر پھیلا کر الفاظ کی ترکیب اور اپنی انفرادی رنگینی سے کلام میں عجیب ولولہ انگیز ترنم اور نغمگی پیدا کر دیتے ہیں۔

مکتبہ طبع ذلک سازی
فوٹو آرٹ پریس گنپت روڈ۔ انارکلی۔ لاہور

www.taemeernews.com

آرزو لکھنوی

● سید انور حسین نام عرف منجھو صاحب، تخلص آرزو تھا۔ والد میرزا کر حسین بھی شاعر تھے اور یاس تخلص تھا آرزو 1289 ہجری میں پیدا ہوئے ان کے مورث اعلیٰ عالمگیر کے عہد میں ہرات سے ہندستان آکر فوج میں ملازم ہوئے اور اجمیر (راجپوتانہ) میں قیام کیا پھر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی آرزو کا قد درمیانی، چہرہ آفتابی اور رنگ گندمی تھا پیشانی کشادہ تھی جو سنجیدہ اور متانت کا تاثر چھوڑتی تھی آرزو بڑے متواضع، پرخلوص اور سادہ مزاج والے شاعر تھے شاعری کا ذوق فطری تھا اور کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے ان کے والد یاس کو جب معلوم ہوا کہ فرزند عزیز کو شاعری سے فطری شغف ہے تو انہیں حضرت جلال لکھنوی کے پاس لے گئے اور ان کی شاگردی اور تربیت میں دیدیا اس وقت آرزو 13 برس کے تھے رفتہ رفتہ مشق سخن اس درجہ بڑھی کہ جلال اپنے دوسرے شاگردوں کے کلام کو بغرض اصلاح آرزو کو بھیج دیا کرتے تھے آرزو کی غزل کا انداز بڑا والہانہ اور دل نشیں تھا ان کی غزل بڑی حد تک مرصع سازی، تراکیب اور ان کے بوجھل پن سے پاک تھی میرا گرد درد اور دھیمے دھیمے غم کی آنچ دینے والے لہجے کے شاعر تھے تو آرزو رواں دواں شگفتہ اور شاداب لہجے کے شاعر تھے اور راست انداز بیاں میں شعر کہنے کی خوبی میں ماہر تھے عظمت اللہ خاں کا شعری مجموعہ 'سریلے بول' ایک رجحان ساز مجموعہ تھا اسی طرح آرزو کا مجموعہ 'سریلی بانسری' بھی ایک مثالی مجموعہ تھا اس سے پہلے ان کے دو مجموعے 'فغان آرزو' اور 'جانِ آرزو' شائع ہو چکے تھے آرزو عرصے تک کلکتے میں رہے پھر ممبئی آگئے اور فلموں سے وابستہ ہوگئے آرزو کی نغمہ نگاری نے کئی فلموں کی مقبولیت کو یقینی بنایا تھا۔

اول شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا ویرانہ بھی

غنچے چپ ہیں گل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

www.taemeernews.com

یگانہ چنگیزی

● مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی نے خود لکھا ہے کہ وہ 17 اکتوبر 1884ء کو پٹنہ کے محلہ مغل پوری میں پیدا ہوئے مدرسے اور سکول تک کی تعلیم اسی شہر میں ہوئی 1903 میں انٹرنس پاس کیا 1904 میں کلکتے کا سفر کیا مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے خاندان کے دو افراد کی معلمی کی وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی تو پٹنہ واپس آ گئے یہاں بھی صحت بحال نہ ہوئی تو 1905 میں بغرض علاج لکھنؤ آ گئے اور زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزار دیا یہیں شادی بھی کی شروع میں یاس تخلص اختیار لیا پھر صرف یگانہ تخلص اپنا کر شاعری کرتے رہے ان کا پہلا مجموعہ 'نشتر یاس' 1914 میں شائع ہوا یہ مجموعہ بڑی حد تک ابتدائی اور روایتی کلام کا حامل تھا یگانہ کی ایک منفرد غزل گو کی پہچان بنانے والا دوسرا شعری مجموعہ 'آیاتِ وجدانی' (1927) تھا اس کا ایک غیر معمولی دیباچہ خود یگانہ نے مرزا مراد بیگ شیرازی کے نام سے لکھا تھا آیاتِ وجدانی کے تین اضافی، ایڈیشن شائع ہوئے بعد میں یگانہ نے اپنے تمام شعری مجموعوں کو ''گنجینہ'' کے نام سے شائع کر دیا تھا 2003 میں مشفق خواجہ نے بے حد سلیقے اور عمدہ تدوین کے ساتھ یگانہ کا کلیات کراچی سے شائع کر دیا شعرائے لکھنؤ غالب کے مقلد تھے یگانہ غالب کی شاعری کے قائل نہ تھے اور خود کو آتش کا مقلد کہتے تھے۔ ان کی اہم ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں میں ان کی شاعری بھی اور ان کی ''غالب شکنی'' بھی لوگوں کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بنی رہی تھی 'غالب شکن' کے عنوان سے انہوں نے ایک رسالہ بھی نکالا تھا جو بے حد متنازعہ تھا یگانہ زندگی بھر معاشی اعتبار سے ناآسودہ رہے حیدر آباد بھی گئے اور پاکستان بھی جہاں وہ غیر قانونی طور پر قیام کرنے پر قید بھی کئے گئے بڑھاپے، تنہائی اور مسلسل بیماری نے یگانہ کو خلل دماغ میں مبتلا کیا تو انہوں نے مذہبی عقیدے کی مذمت میں قابل اعتراض رباعیاں لکھ دیں ان کے شائع ہوتے ہی ان پر لعن طعن ہوئی اور انہیں لکھنؤ میں سر بازار رسوا کیا گیا ان کی زندگی کے آخری پانچ سال نہایت کس مپرسی میں گزرے بالآخر وہ 4/3 فروری 1956 کی آخری رات اپنے تین پُرسان حالوں کی موجودگی میں کلمہ پڑھ کر درمیانی رات میں انتقال کر گئے کربلائے منشی تفضل حسین لکھنؤ (وکتوریا گنج) میں تدفین عمل میں آئی۔

www.taemeernews.com

●

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہوکر راہ پہ آنا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سرمار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

اسیرو، شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

فراق گھورکھپوری

● گورکھپور کے کائستی رئیس اور وکیل منشی گورکھ پرشاد عبرت کے صاحبزادے رگھوپتی سہائے فراق بروز جمعہ 28 اگست 1896ء کو گورکھ پور میں پیدا ہوئے ان کے بزرگوں کو شیر شاہ نے پانچ گاؤں جاگیر میں دئے تھے اسی مناسبت سے فراق کے بزرگ پنچ گاؤاں کا سیٹھ کہے جاتے تھے 1913 میں انٹرنس اور 1915 میں ایف اے پاس کیا تھا کہ ان کی شادی کر دی گئی بی اے کے بعد والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا فراقؔ نے اس بات کا بَرملا اظہار کیا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بڑی بے کیف اور ان کے لئے ذہنی کوفت کا باعث رہی۔ فراق نے آگرہ

www.taemeernews.com

یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی میں فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا وہ 1930 میں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں سے 1958ء میں سبکدوش بھی ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ فراق کی شاعری کا آغاز 1924 کے آس پاس ہوگیا تھا لیکن فراق کو اپنی غزل گوئی کی صحیح داد 1945 کے بعد ہی ملی آغازِ شاعری میں فراق نے مہدی حسن ناصری سے مشورۂ سخن کیا تھا برق سیتاپوری کے تذکرے 'بہار سخن' میں لکھا ہے کہ فراق نے وسیم خیرآبادی سے بھی استفادہ کیا تھا فراقؔ نے اپنے تخلص کے بارے میں لکھا ہے کہ پریم چند سے جب ان کا دن رات کا ساتھ تھا تو کسی رسالے میں انہوں نے مشہور داستاں گو ناصر علی فراق کا نام پڑھا تو انہوں نے فراقؔ تخلص رکھنا طے کرلیا پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے نے فراق کے ساتھ پریم چند کے مربیانہ سلوک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پریم چند فراق کی شاعری زمانہ کانپور میں شائع کرنے سے برابر دلچسپی لیتے تھے فراقؔ کو شعری ذوق اور ذہانت خاندانی ورثے کے طور پر ملی تھی اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ برطانوی سرکار کے سیاسی قیدی بھی بنے تھے اور 1922ء کے ابتدائی مہینوں میں آگرہ جیل میں بھی رہے تھے جیل سے رہائی کے بعد وہ آل انڈیا کانگریس کے انڈر سکریٹری بنادئے گئے تھے جواہر لال نہرو ان کی سیاسی آگاہی سے پوری طرح باخبر تھے فراق بعد کے برسوں میں اشتراکیت سے بھی متاثر ہوئے تھے فراق غزلوں، رباعیوں کے ساتھ ساتھ نظم کے بھی اچھے شاعر تھے ان کی نظموں میں آدھی رات، پرچھائیاں اور رقص حیات کئی انتخابات میں شامل ہیں صنف غزل کو پسند کرنے والوں کا سب سے پسندیدہ کلیات ہے گل نغمہ' رمز و کنایات، مشعل، غزلستان، شعرستان، شبنمستان گلبانگ کے ساتھ ساتھ فراق کی غیر معمولی تنقیدی ذہانت کی حامل کتابیں، اندازے، اور اردو کی عشقیہ شاعری، ہر ادبی نسل کے لئے سرمایہ ادب ہیں۔ فراق نے 3 مارچ 1982 کو دلی میں آخری سانس لی وہ اپنے معاصرین میں تنہا شاعر ہیں جن پر سب سے زیادہ کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اور خصوصی نمبر نکالے گئے ہیں اب بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے فراق کو 1970 میں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی ملا تھا۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
ہائے اب مجھ سے تجھے رنجش بیجا بھی نہیں

نگہۂ ناز کی نیت کا پتہ بھی نہیں اور
دلِ دیوانہ کا معلوم ارادہ بھی نہیں

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

ہم اسے منھ سے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
دوست تیرا ہے مگر آدمی اچھا بھی نہیں

www.taemeernews.com

احمد ندیم قاسمی

● خاندانی نام احمد شاہ اور ادبی نام احمد ندیم قاسمی تھا بطور شاعر تخلص ندیم تھا انگر تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں 20 رنومبر 1916 کو پیدا ہونے والے ندیم نے علاقے کی مسجد میں بیٹھ کر قرآن شریف سے آغاز کیا شیخ پورہ کے سرکاری اسکول سے ہائی اسکول بہاول پور کے ایک کالج سے بی اے کیا کئی طرح کی ملازمتیں کرتے رہنے کے بعد اخباری دنیا کو اپنے لئے موزوں ترین پایا پھول، تہذیب نسواں اور ادب لطیف کی ادارت کی ریڈیو پر اسکرپٹ نگار بھی رہے وہ اشتراکی تھے اس لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنیاد گزاروں میں گنے جاتے تھے روزنامہ، امروز، روشن خیال میں ادبی اور سیاسی موضوعات پر کالم لکھتے رہے وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم بھی رہے 1963ء سے زندگی کے آخری دن تک یعنی 10 رجنوری 2006 تک وہ اپنا رسالہ فنون، نکالتے رہے تھے احمد ندیم قاسمی نے شاعری کے ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی ادبی دنیا شاید آج بھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ ان کی افسانہ نگاری غیر معمولی تھی یا ان کی شاعری۔ سچ تو یہ ہے کہ ندیم اردو کے اہم اور صف اول کے افسانہ نگار بھی تھے اور ایسے ہی رتبے کے شاعر بھی بسم اللہ، رئیس خانہ، گنڈاسا، بین ان کے نمائندہ افسانے ہیں اب تک ان کے سولہ سے زائد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے خاکے 'میرے ہم سفر' بھی بے حد پسند کے گئے ندیم سیفٹی ایکٹ کے تحت دو بار پابند سلاسل کئے گئے انہیں ستارۂ امتیاز، کمال فن ایوارڈ اور نشان امتیاز پیش کیا گیا فاروق حسن جیسے معتبر مترجموں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لئے ان کے درجن بھر افسانوی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کے افسانے اور شاعری روسی، جاپانی، میں بھی بڑے شوق سے ترجمہ ہوئے ہندستان میں بھی وہ بے حد پسند کئے جاتے تھے ندیم صاف گو، مخلص اور اپنی ثقافتی اور سیاسی فکر سے کمیٹڈ تھے۔ قلم کے اس جیالے سپاہی نے یہ کہہ کے دم توڑ دیا'' آدم کا بھرم ندیم سے ہے۔''

●

www.taemeernews.com

عمر بھر اس نے اسی طرح نبھایا ہے مجھے
وہ جو اس دشت کے اس پار سے لایا ہے مجھے

کتنے آئینوں میں اک عکس دکھایا ہے مجھے
زندگی نے جو اکیلا کبھی پایا ہے مجھے

تو مرا کفر بھی ہے تو مرا ایمان بھی ہے
تو نے لوٹا ہے مجھے تو نے بسایا ہے مجھے

میں تجھے یاد بھی کرتا ہوں تو جل اٹھتا ہوں
تو نے کس درد کے صحرا میں گنوایا ہے مجھے

اتنی خاموش ہے شب لوگ ڈرے جاتے ہیں
اور میں سوچتا ہوں کس نے بلایا ہے مجھے

میری پہچان تو مشکل تھی مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے

واعظ شہر کے نعروں سے تو کیا کھلتی آنکھ
خود مرے خواب کی ہیبت نے جگایا ہے مجھے

اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

فیض احمد فیض

● فیض 12 رفروری 1911ء کو سیالکوٹ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے ان کے والد سلطان محمد خان ممتاز بیرسٹر اور والئی افغانستان کے چیف سکریٹری تھے لندن میں بھی وہ افغانستان کے سفیر رہے فیض اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے بی اے آنرز عربی میں اور ایم اے انگریزی کے بعد عربی میں بھی کیا MAO کالج امرتسر اور پھر ہیلی کالج لاہور میں لکچرر رہے پھر فوج کی طرف نکل گئے اور میجر اور لیفٹیننٹ جرنل کے عہدے پائے فیض کا تیسرا ملازمتی مشغلہ انگریزی اور اردو صحافت تھی وہ پاکستان ٹائمز اور اردو روزنامے امروز کے مدیر رہے انہوں نے ماہ نامہ ادب لطیف اور ہفت روزہ لیل ونہار کی بھی ادارت کی فیض اشتراکی ذہن رکھتے تھے وہ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر بھی رہے تھے 1951ء میں ایک بڑا واقعہ فیض کی زندگی میں رونما ہوا اور وہ سجاد ظہیر اور کچھ فوجیوں کے ساتھ راولپنڈی سازش کیس میں حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں چار سال ایک ماہ مختلف جیلوں میں قید رکھے گئے قید کا یہی عرصہ تھا جب فیض نے زنداں

www.taemeernews.com

کے تجربے کو موضوع بنا کر کئی نظمیں اور غزلیں لکھیں ان کی ان مختلف تخلیقات کو زنداں نامہ کے نام سے شائع کیا گیا تھا فیض ایشیائی ادیبوں کی تنظیم سے بھی بڑے سرگرم انداز میں وابستہ رہے 1976 میں انہیں اسی تنظیم کا لوٹس انعام ملا وہ عالمی امن کونسل کی ایگزیکٹیو کونسل کے بھی ممبر رہے اور اس سلسلے میں عالمی سطح پر اشتراکیت پسند ادیبوں اور دانش وروں سے ان کے رابطے بڑھے 1964 میں انہیں لینن امن انعام ملا فیض پاکستان آرٹس کونسل کے بھی سربراہ رہے وہ پہلے ایشائی اور پاکستانی شاعر تھے جن کے کلام کا انتخاب یونیسکو کے ثقافتی شعبے نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا 1941 میں فیض کا پہلا شعری مجموعہ نقش فریادی، کے عنوان سے شائع ہوا اس کے بعد ان کے چھ اور شعری مجموعے دستِ صبا، دستِ تہہ سنگ، سر وادیٔ سینا، شامِ شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر اور زنداں نامہ، شائع ہوئے۔ ان کا ایک بھرپور کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے فیض کے تنقیدی مضامین میزان، خطوط صلیبیں میرے دریچے میں، اور متاع لوح وقلم و تقاریر اور متفرق تحریریں، شائع ہوئی ہیں انگریزی خاتون ایلس سے ان کی شادی ہوئی اور نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا، فیض نے لاہور میں 20 رنومبر 1983 کو آخری سانس لی غالب اور اقبال کے بعد فیض تیسرے شاعر تھے جن کا بیشتر کلام اردو کے قاری اور سامع دونوں کو ازبر تھا انہوں نے اپنی بعد کی نسل پر اپنے لہجے کی گہری چھاپ چھوڑی۔

●

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنار فلک کا سیہ ترین گوشہ
یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زبانِ چمن
کھلے نہ پھول، اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض، اب نہیں سردار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں

●

www.taemeernews.com

معین احسن جذبی

● جذبی جنھوں نے پہلے تخلص ملال رکھا 21/اگست 1912 کو مبارک پور اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کئی شہروں جھانسی، آگرہ، لکھنؤ میں ہوئی ایم اے اور پی ایچ ڈی (موضوع حالی کا سیاسی شعور) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا جذبی ترقی پسند تحریک کے بے حد کامیاب غزل کے شاعر تھے 1945 میں مسلم یونیورسٹی علی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہونے سے پہلے جذبی نے بڑی تنگ دستی کے دن گذارے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی جدوجہد میں جذبی ممبئی اور لکھنؤ میں مختلف جگہوں پر کام کرتے ہوئے دلی کے اردو رسالے آجکل سے وابستہ ہو گئے تھے مگر یہاں ان کی ایڈیٹر سے بنی نہیں اور علی گڑھ آ گئے 21/اگست 1974 کو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ریٹائر ہو کے اپنے بنائے ہوئے مکان 'فروزاں' میں زندگی کی آخری سانس تک قیام پذیر رہے وہ نہ زود گو تھے اور نہ آورد کے جذبے سے شعر کہتے تھے کئی دنوں تک غزل کے ایک ایک شعر کو صیقل کرتے تھے اس احتسابی رویے کی بنا پر ان کا سرمایۂ سخن کچھ زیادہ نہیں رہا، فروزاں، ان کا پہلا مجموعہ تھا جس کی کئی غزلیں اس زمانے میں کافی مقبول ہوئیں شاہد لطیف نے اپنی فلم ضدی میں ان کی ایک غزل بھی گوائی تھی خواجہ احمد عباس کی فرمائش پر انہوں نے ایک کورس بھی فلم کے لئے لکھا تھا کسی نے انہیں شدتِ جذبات کا شاعر کہا تو کسی نے انہیں حریفِ شب تار کہا وہ کم سخن، کم گو، اور کم آمیز تھے اور اپنے اظہار اور ردعمل میں صاف گو اور دیانت دار تھے جذبی کے حزینہ لہجے میں لوگ فانی کی یاسیت تلاش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جذبی دراصل فانی کی شعری کائنات جو الم اور ملال کی دنیا تھی متاثر تھے لیکن جذبی اس تاثر کی تائید نہیں کرتے تھے۔ جذبی کا دوسرا مجموعہ، 'سخن مختصر' تھا ان دونوں شعری مجموعوں کا انتخاب انہوں نے اپنے آخری مجموعے 'گدازِ شب' میں شامل کر لیا تھا اقبال سمان کے علاوہ انہیں غالب ایوارڈ جیسے کئی اور بھی ایوارڈ دئے گئے تھے آخری عمر میں وہ بینائی سے محروم ہو گئے تھے 93 برس کی عمر میں 7/فروری 2005 کو اپنے افراد خاندان کے درمیان آخری سانس لی۔

www.taemeernews.com

●

دیکھو تو رہروانِ شب چاند بجھا بجھا سا ہے
ڈھونڈو تو گمراہانِ شب دور کہیں سحر گئی

وہ سرِ شام چھیڑی دی حسن کے ساز پر غزل
شام نکھر نکھر گئی رات سنور سنور گئی

اب نہ سنے کوئی مزے دل کی صدا تو کیا کروں
نالہ تو کو بکو گیا آہ تو در بدر گئی

اس کا خیال اس کا غم دل پہ ہزار ہا ستم
جذبی نہ جانے کس طرح عمر یونہی گذر گئی

کار گہہ حیات میں جب بھی مری نظر گئی
موج سی درد وفکر کی سر سے مرے گزر گئی

ہوش و خرد ہیں سرنگوں تو ہی بتادے اے جنوں
جانبِ منزل سکوں کون سی رہ گذر گئی

مجروح سلطان پوری

● مجروح سلطان پوری اپنے ہم عصر شاعر علی سردار جعفری کی موت سے کوئی دو ماہ دس دن پہلے اکیاسی برس کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ گئے 1919 میں سلطان پور یوپی میں پیدا ہونے والے اسرار حسن خاں نے حکیم بننے کا خواب دیکھا تھا اور طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی انہوں نے اپنے مکان کے دیوان خانے میں آنے والے مریضوں کی نبض دیکھ کر نسخہ لکھنا بھی شروع کر دیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب جگر کی مئے نوشی اور ان کے ترنم کے اردو دنیا میں بڑے چرچے تھے اور جگر مشاعروں کی کلٹ فیگر بنے ہوئے تھے مجروح کو جگر بھی پسند کرتے تھے ان کا ترنم بڑا دلکش تھا 1944ء میں ممبئی میں منعقدہ ایک بڑے مشاعرے میں جگر کے ساتھ مجروح بھی تھے جگر کے بعد سامعین نے مجروح کو کافی پسند کیا ان پسند کرنے والوں میں فلم ہدایت کار کاردار بھی تھے جنہوں نے مجروح کو ممبئی میں روک لیا اپنی فلم شاہجہاں کے ان سے گانے لکھوائے اور یوں مجروح زندگی بھر کے لئے نغمہ نگار کی حیثیت سے ہندستانی فلموں سے وابستہ ہو گئے پہلی بار اردو میں ترقی پسند تحریک کی گونج 1936ء میں سنائی دی

www.taemeernews.com

تھی اس تحریک کو جن نوجوانوں نے جوش وخروش سے اپنایا ان میں مجروح بھی تھے ترقی پسندوں میں زیادہ تر نظم نگار تھے غزل کہنے والوں میں جذبی، فیض، مجاز، اور مجروح نمایاں بھی تھے اور مقبول بھی مجروح کا کمال یہ تھا کہ بیشتر ترقی پسند شاعر جو کچھ نظم کے حوالے سے کہہ رہے تھے وہی باتیں مجروح اپنی غزلوں کی زبان میں کہہ رہے تھے وہ جگر کی صحبتوں میں اٹھے بیٹھے تھے مگر ان کا رنگ سخن سب سے مختلف تھا اُن کی غزلیں پسند کی گئیں اور ان کے کئی شعر لوگوں کے حافظہ کا حصہ بن گئے مجروح نے زندگی بھر اپنی ادبی غزل اور اس کی پہچان اور اس کی داد پانے پر اصرار کیا وہ اپنی فلمی شاعری اور فلمی امیج کو اپنی روزی سے وابستہ کرتے رہے تھے اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ ادب کے بجائے فلم کی نغمہ نگاری کے فل ٹائمر بن گئے اپنی اس غیر معمولی پل پل والی مصروفیات کی بناء پر وہ اپنے اکلوتے شعری مجموعے ''غزل'' کی ضخامت کو موٹا نہ کر سکے مجروح اپنے معاصر ترقی پسند ادیبوں کی طرح قید بھی کئے گئے اپنی زندگی کے 55 سال فلموں کو دینے والے مجروح مئی 2007 میں ممبئی میں انتقال کر گئے اور ترقی پسند غزل کے سر پر دستارِ فضیلت رکھنے کی ابدی داد پا گئے۔

●

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
خم ہوگئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

اب جاکے کچھ کھلا ہنر ناخنِ جنوں
زخم جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری

● افسانہ نگاری سے اپنا ادبی سفر شروع کرنے والے علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے بڑے اہم اور تابندہ شاعر تھے 20 رنومبر 1913 کو وہ مشرقی یوپی کے شہر بلرام پور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے انہوں نے دلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اس کے بعد کی تعلیم کے لئے وہ لکھنؤ پہونچے اور کچھ دنوں بعد ہی یونیورسٹی طلباء کی یونین کے صدر کا انتخاب جیت گئے تعلیمی سرگرمی کے دوران ہی وہ تحریک آزادی میں شامل ہوئے 1940 اور 1941 میں وطن پر راج کر رہے فرنگیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دوبار جیل گئے وہ اپنی تخلیقی زندگی کے آخری لمحوں تک مارکسٹ رہے اور ترقی پسند تحریک سے اپنی وابستگی کو ٹوٹنے نہیں دیا ہاں وہ اپنے ادبی نظریات میں حالات کے زیر اثر لچک پیدا کرلیا کرتے تھے اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکالے گئے آزادی کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگی تو وہ ممبئی اور ناسک میں ڈیڑھ سال قید میں رہے لکھنؤ سے انہوں نے مجاز اور سبط حسن کے ساتھ مل کر رسالہ، نیا ادب، نکالا اس رسالے نے ترقی پسندی کا میلان اور رجحان مستحکم کیا ممبئی سے نکلنے والے کمیونسٹ پارٹی کے اخبار، قومی جنگ، کی ادارت میں وہ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ شامل ہوئے IPTA کے لئے ڈرامے لکھے، یہ کس کا خون ہے، ان کا مقبول ڈرامہ تھا انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کی کئی کامیاب کتابیں لکھیں، ترقی پسند ادب، میں انہوں نے بیباکی سے تحریک کے بارے میں لکھا مگر شخصی تعصبات بھی کتاب میں ذرآئے تھے ان کے شعری مجموعوں میں پرواز، ایشیا جاگ اٹھا، امن کا ستارہ، پتھر کی دیوار، خون کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، پیراہن شرر، ایک خواب اور اور لہو پکارتا ہے جیسے مجموعے خاصے مقبول ہوئے۔ گفتگو، کے نام سے رسالہ بھی نکالا اور غالب، کبیر اور میرابائی کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیا ایک فلم بھی بنائی اور معاصر شاعروں پر ٹی وی سیریل بھی بنایا بیشتر ترقی پسند شاعروں کی طرح سردار جعفری نے بھی آزادانہ ادبی زندگی گزاری سردار اکیلے ترقی پسند ادیب ہیں جو زندگی بھر ترقی پسندوں اور جدیدیوں دونوں کی نکتہ

www.taemeernews.com

چینیوں کا سب سے زیادہ نشانہ بنے رہے وہ اپنے مخالفین سے مجادلہ یا مکالمہ کرنے سے گریز کرتے تھے وہ فیض سے پہلے ہی شاعری کے عالمی منظر نامے کے اہم شاعروں جیسے لوئی آراگاں، ناظم حکمت اور پبلو نرودا کے لئے ایک مانوس نام بن چکے تھے۔ سردار جعفری کو گیان پیٹھ ایوارڈ بھی ملا تھا انہوں نے یکم اگست 2000ء میں ممبئی میں کئی ماہ اسپتال میں زیر علاج رہتے ہوئے آخری سانس لی آخری دنوں میں وہ پہچان اور یادداشت سے محروم ہو گئے تھے جعفری ممبئی میں دفنائے گئے۔

●

چشم بدمست کو پھر شیوۂ دلداری دے
دل آوارہ کو پیغام گرفتاری دے

عشق ہے سادہ و معصوم اسے اپنی طرح
جو برِ تیغِ ادا خنجر عیاری دے

جو دکھے دل ہیں انہیں دولتِ درماں ہو عطا
درد کے ہاتھ میں مت کاسۂ ناداری دے

کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا
سرکشی دل کو نیا ذوق گنہگاری دے

شاخِ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے گل
دیکھیں کب بادِ صبا حکمِ چمن کاری دے

اے مرے شعلۂ دل شعلۂ شعر و دانش
رات آخر ہے اسے جشنِ شرر باری دے

چمن افسردہ ہے اے جانِ چمن، روحِ بہار
گل کو بھی اپنے تبسم کی فسوں کاری دے

مخدوم محی الدین

● مخدوم کا پورا نام ابوسعید مخدوم محی الدین حذری تھا مخدوم 4 رفروری 1908 کو اندول ضلع میدک آندھرا میں پیدا ہوئے ان کا گھرانہ خاصا مذہبی تھا وہ پانچ برس کی عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے اور ان کی ماں کی دوسری شادی کر دی گئی تھی مخدوم کی تربیت ان کے چچا نے کی ملازمت کے سلسلے میں چچا کے تبادلے ہوتے رہے مخدوم کے اسکول بھی بدلتے رہے مخدوم کو پڑھنے کا شوق تھا اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بی اے اور ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی سے پاس کیا مخدوم کی تعلیم کا یہ وہ زمانہ تھا کہ ان کے استادوں اور ہم جماعتوں

www.taemeernews.com

میں وہ لوگ تھے جو بعد میں ادبی دنیا میں کافی معروف ہوئے 25 سال کی عمر میں مخدوم کی شادی چچازاد بہن سے ہوگئی مخدوم کو بہت بعد میں اپنی ماں کے بارے میں علم ہوا وہ ان کے اصرار پر ان کے ساتھ آخری دن تک قیام پذیر رہیں۔ مخدوم کے پہلے شعری مجموعے ''سرخ سویرا'' پر نظام سرکار نے پابندی لگادی تھی اپنے اس مجموعے کی اشاعت سے پہلے ہی مخدوم کمیونسٹ نظریات کے حامی بن گئے تھے اور ان کے مزاج میں ایک باغی شاعر اپنے آتشیں لہجے کے ساتھ ایک عملی کامریڈ بن چکا تھا انڈر گراونڈ تلنگانہ تحریک سے مخدوم گہرے طور پر وابستہ تھے اور نظام سرکار نے ان کی گرفتاری پر انعام بھی رکھا تھا مخدوم نے یونیورسٹی تعلیم کے بعد کئی طرح کے کام کئے بالاخر انہیں سٹی کالج حیدرآباد میں اردو پڑھانے کا موقعہ مل گیا مگر مخدوم دراصل کمیونسٹ تحریک کے پروردہ تھے اس لئے انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد میں تشکیل کے ساتھ ساتھ خود کو ہمہ وقتی ممبر کے طور سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ کرلیا آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن، ٹریڈ یونین کانگریس کو بھی مخدوم کی سرگرم قیادت حاصل تھی پارٹی پر پابندی تھی اور مخدوم انڈر گراونڈ تھے پھر بڑے ڈرامائی انداز میں پکڑے گئے جنوری 1952 میں ان کی رہائی پر ایک مثالی جلوس حیدرآباد کی سڑکوں پہ امڈ پڑا وہ کئی برس مجلس قانون ساز میں اپوزیشن لیڈر رہے دسمبر 1966ء میں مخدوم کا بڑا شاندار جشن حیدرآباد میں منایا گیا اس کے ڈھائی سال بعد ہی 25 راگست 1969ء کو دلی کے ارون ہسپتال میں دل کے عارضے میں ان کا انتقال ہوگیا ان کا جسد خاکی حیدرآباد لایا گیا اور وہیں درگاہ شاہ خاموش میں ان کی تدفین عمل میں آئی مخدوم کا پہلا مجموعہ 'سرخ سویرا' اور پھر لمبے عرصے کی خاموشی کے بعد 'گل تر' اور آخری مجموعہ 'بساط رقص' کے نام سے شائع ہوا مخدوم اردو کے صف اول کے نظم نگاروں میں تھے انہوں نے غزلیں کم لکھی ہیں مگر وہ غزل کے طرحدار شاعر تھے مخدوم کی نظموں قید، چارہ گر، چاند تاروں کا بن کو غیر معمولی مقبولیت ملی ہے مخدوم کی نظم چارہ گر، فلم میں گائی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

●

گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دل پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے

سراب ہے کہ حقیقت نظارہ ہے کہ فریب
یقین بھی ٹوٹا ہے طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے

سیاست دل آئینہ چور چور تو تھی
سیاست دل آہن گراں بھی ٹوٹی ہے

اندھیری رات کا یہ نیم باز سناٹا
گلوں کی سانس رگِ گلستاں بھی ٹوٹی ہے

تمہارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہیں وہیں میری زنجیر جاں بھی ٹوٹی ہے

کہاں ہیں عالم امکاں وجود میں آئیں
نظر نظر ہی رہی ہے جہاں بھی ٹوٹی ہے

شکست دریخت زمانے کی خوب ہے مخدوم
خودی تو ٹوٹی تھی خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے

www.taemeernews.com

اسرار الحق مجاز

● مجاز کی زندگی اور شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتی کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر سے کسی قدر واقفیت ضروری ہے جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوئی ان کی بہن حمیدہ سالم ان کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں پر ''مجاز۔ میرا بھائی'' کے عنوان سے ایک بھرپور مضمون لکھ چکی ہیں۔ مجاز اودھ کے مشہور قصبے ردولی میں اکتوبر 1911 کو ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے منتوں اور مرادوں کے درمیان پالے گئے مجاز نے جنھیں جگن پکارا جاتا تھا لکھنو کے امین آباد ہائی اسکول سے میٹرک کیا اور اپنے والد کے ساتھ آگرہ آ گئے یہاں سینٹ جانس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا فانی کا پڑوس اور جذبی کا ساتھ ملا یہیں سے شاعری کا دور شروع ہوا پڑھنے میں جی نہ لگا اور فیل ہو گئے علی گڑھ کا رخ کیا اور وہیں سے بی اے کیا ایم اے میں داخلہ لیا اسی دوران ریڈیو کے رسالے آواز، میں سب ایڈیٹری کی جگہ مل گئی مجاز کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قیام کے دنوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا حاصل ہوئی یہاں انہیں سردار جعفری، سبط حسن، اور جاں نثار کی دوستانہ رفاقتیں ملیں مجاز مسلم یونیورسٹی کے محبوب شاعر بن گئے اور انہیں مطرب بزم دلبراں کہا جانے لگا 1936 میں ریڈیو کے رسالے آواز کی ملازمت ترک کردی اور دلی چھوڑ دی رند مشرب اور خوبان جہاں، کے مدح خواں مجاز پر 1940 میں نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا لیکن جلد ٹھیک ہو گئے لکھنؤ میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا اسی زمانے میں نئے ادب، اور پرچم کی ادارت بھی کی حالات نے پھر ایک بار دلی کی راہ دکھائی اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین ہو گئے 1940 میں مجاز پر دوسری بار دیوانگی کا دورہ پڑا اس کی وجہ اور باتوں کے علاوہ ان کی بے حساب مے نوشی بھی تھی 1952 میں ان پر تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاون کا حملہ ہوا وہ دلی کے کوچوں میں اسی دیوانگی میں پھرتے رہے بالآخر رانچی کے مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرادیئے گئے کچھ دنوں بعد نارمل زندگی میں لوٹ آئے لیکن پھر وہی بادہ پرستی اور کوچہ گردی پیروں کا مقدر بن گئی ایک رات لکھنؤ کے ایک شراب خانے کی چھت پر ٹھٹھر کے مر گئے

www.taemeernews.com

مجاز کے مشہور شعری مجموعے 'آہنگ' کا دیباچہ فیض نے لکھا تھا اس کا انتساب اس طرح تھا ''فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں سردار اور مخدوم کے نام جو میرے دست و بازو ہیں۔'' مجاز 1955 تک زندہ رہے۔

●

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجیے ہم صورت جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو ہم لطف بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشتر زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگ جاں بھول گئے

جاں نثار اختر

● جاں نثار اختر 18 رفروری 1914 کو گوالیار میں پیدا ہوئے ان کے والد افتخار حسین مضطر خیر آبادی معروف شاعر تھے جاں نثار کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی اور بی اے آنرز انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے کیا ایم اے کے بعد وہ ڈاکٹریٹ بھی کرنا چاہتے تھے مگر اسی عرصے میں وہ وکٹوریہ کالج میں لکچرر بن گئے شاعر مجاز کی بہن صفیہ بی بی سے ان کی شادی ہوئی جاں نثار آزادی کے بعد بھوپال آ گئے ، یہاں کے حمیدیہ کالج میں ان کا تقرر ہو گیا اس زمانے میں ممبئی ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی ایک سرگرم آماجگاہ بنی ہوئی تھی فلمی صنعت نے ان شاعروں پر روزگار کے باعزت راستے کھول دئے تھے جاں نثار اختر نے بھی فلموں کے لئے نغمہ نگاری کرنے کی سرگرمی اپناتے ہوئے ممبئی کو اپنی دائمی قیام گاہ بنالیا بیوی صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار نے بھوپال کی خدیجہ ہارون سے شادی کرلی جاں نثار کے شاعرانہ مزاج پر قلندری کی گہری چھاپ تھی وہ بے حد لطیف اور پر بہار عشقیہ لہجے کے شاعر تھے ترقی پسندوں میں اپنی الگ پہچان رکھنے والے جاں نثار کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے سلاسل ، جادواں ، تار گریباں اور خاک دل جیسے مجموعوں نے انہیں نئی نسل میں خاصا مقبول کیا صفیہ نے ان کے نام جو محبت اور شفقت بھرے خطوط لکھے وہ 'زیر لب' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں خطوط کا یہ مجموعہ جاں نثار کے شاعرانہ مزاج اور خدوخال کو سمجھنے میں بڑا معاون بنا ہے جاں نثار اردو غزل کے کلاسیکی لہجے کا بھرپور ادراک رکھتے تھے، گھر آنگن ، قطعات اور رباعیات کا ایک منفرد مجموعہ ہے انہوں نے غزلوں کے نئے مجموعے 'پچھلے پہر' میں

www.taemeernews.com

اپنے غزلیہ لہجے کو ایک نئی پہچان دیتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اس مجموعے کے حوالے سے جاں نثار نے اپنے اندر ایک نئے غزل گو کی تلاش کرلی تھی پچھلے پہر کی غزلوں نے چونکایا بھی اور اس کے آہنگ اور اسلوب کو اپنانے کے لئے شاعروں کو للچایا بھی آخری دنوں میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور 18/اگست 1976 کو وہ ہم سے بچھڑ گئے۔

●

آہٹ سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے لچک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

رستے کے دھندلکے میں کسی موڑ پہ کچھ دور
اک لو سی چمک جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

صندل سی مہکتی ہوئی پر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب رات گئے کوئی کرن، میرے برابر
چپ چاپ سی سوجائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

نیر مسعود

بلاشبہہ اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں
ان کے نئے افسانوں کا مجموعہ

گنجفہ شائع ہوگیا

قیمت : 120 روپئے

رابطہ: تمثال مسعود، ادبستان، دین دیال روڈ لکھنو

ساٹھ کے بعد کے افسانہ نگاروں میں
عوض سعید نے اپنی انمٹ پہچان بنائی ہے
ان کے تمام تر افسانوں اور ڈراموں کو
اب **اوصاف سعید** نے مرتب کردیا ہے
عوض سعید کے افسانوں کی قراءت
آپ کو عوض کے خلاق ذہن کا
گرویدہ بنالے گی

ایجوکیشنل پبلکشنگ ہاوس، کوچہ پنڈت، دہلی۔۶

ممتاز نقاد
شکیل الرحمٰن
کی نئی کتابیں

● فراق کی نئی جمالیات
● اختر الایمان

نرالی دنیا پبلیکشنز
358-A، دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

زاھدہ زیدی کے طرز احساس
اور تخلیقی وژن نے
انہیں اک توانا شعری پہچان دی ہے
ان کا نیا شعری مجموعہ
شام تنہائی
شائع ہوگیا

ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

www.taemeernews.com

افسانے

بھوت

● عبدالصمد

● فضول کاموں میں مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔ یہ سب میں نے اپنی بیوی پر چھوڑ رکھا ہے، یوں وہ اپنی کسی بھی مصروفیت کو فضول نہیں مانتی۔ کبھی کبھی میں بھی قائل ہونے پر مجبور ہو جاتا ہوں جب وہ اپنے فضول کاموں یعنی کوڑے کے ڈھیر سے کوئی موتی برآمد کر لیتی ہے..... ایسا موتی جو دیر تک ہماری زندگیوں میں روشنی بکھیرتا رہے۔

لکی..... چودہ پندرہ سال کی مدقوق اور بدحواس سی لڑکی کوڑے کے ڈھیر سے برآمد ایک موتی ہی تو تھی تو تم..... جسے پہلے پہل دیکھ کر میں نے برا سا منہ بنایا تو وہ ایک ادائے خاص سے مسکرائی۔

''تم دیکھنا اسے میں کیا بناتی ہوں۔ ناکام ہوگئی تو تم جو سزا تجویز کرو.....'' میں نے کوئی جواب دینے سے بہتر یہی سمجھا کہ میں بھی مسکرا کر چپ ہو جاؤں۔ مجھے ضرورت بھی کیا تھا اس قسم کی باتوں میں سر کھپانے کی۔ وہ اس خام مال کو ہیرا بنائے یا موتی، یہ اس کا شوق ہے اور وہ جانے۔

شروع شروع میں وہ اس لڑکی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتاتی تھی کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، نہ ماں باپ نہ دور قریب کا کوئی رشتہ دار۔ فی الحال اس کے لئے وہی سب کچھ ہے یعنی وہ اسے جس طرح چاہے رکھے۔ سننے والوں کی آنکھوں میں رشک کا چٹائی بم پھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں ایسی نایابی۔ مگر اس دن میری بیوی کی مسکراہٹ اچانک معدوم ہوگئی جب اچانک ایک بدمعاش سی عورت ہمارے گھر میں گھس آئی اور بہ بانگ دُہل بولی کہ وہ اس لڑکی کی ماں ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جائے گی۔

میری بیوی کے لئے یہ ایک بڑا دھکا تھا۔ وہ اس خام مال کو چمکانے میں کافی محنت صرف کر چکی تھی۔ اس فضول سی لڑکی کو ڈھنگ سے کپڑے پہنے آگئے تھے، ناک بہنی بند ہوگئی تھی، رومال استعمال کرنا سیکھ گئی تھی۔ ٹوسٹ اب جلتے نہیں تھے، انڈے معتدل انداز میں ابل جاتے تھے، چائے اچھی بنا لیتی تھی وغیرہ۔ فوری طور پر میری بیوی کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس اچانک حملے کا کیا جواب دے۔ اس کی زبردست چھان بین ناکام ثابت ہوگئی تھی۔ پھر رشک کے وہ چٹائی بم جو وہ بڑے اطمینان اور شوق سے سننے والوں اور جلنے والوں کی آنکھوں میں پھوڑتی رہتی تھی۔ پھر بھی وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اپنے آپ پر قدرے قابو پا کر اس نے اس لڑکی کی طرف دیکھا..... لڑکی جس کا نام اس نے

www.taemeernews.com

بڑے چاؤ سے رکھا تھا لکی.....

لکی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی، دوسری نگاہ اس عورت پر پھر اپنی دونوں نگاہیں نیچی کر لیں۔

اس خاموش مگر عجیب صورت سے اس کی پریشانی بڑھ گئی لیکن آفریں ہے اس عورت پر کہ اس نے اپنی باہری دیواروں پر اپنی پریشانیوں کو جھلکنے نہیں دیا اور پوری تندہی اور جان فشاں سے صورت حال کی تفتیش اور اس کے حل میں جٹ گئی۔ اس کی جگہ میں ہوتا یا کوئی بھی ہوتا تو چپ چاپ اس لڑکی کو حوالے کر کے چین کی سانس لیتا پر میری بیوی کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی تھی، اس لڑکی پر تو اس کا داؤ لگا ہوا تھا، وہ اتنی آسانی سے اس سے کیسے دستبردار ہو جاتی۔

آخر کار اس کی انتہائی محنت رنگ لائی اور اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

وہ عورت دراصل لڑکی کی اصلی نہیں سوتیلی ماں تھی۔ لکی کی ماں اپنے کسی آشنا کیساتھ بھاگ گئی تھی تو اس کے باپ نے اس عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس عورت کی بھی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں اور پہلے دو مردوں سے اس کے کئی بچے بھی تھے۔ اس نے اس لڑکی کے ساتھ جی بھر کے سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ دن رات کی مار پیٹ کر کے سارے کام کاج، اس پر سے جو نٹھا سوٹھا بہت کم کھانا، پھر بھی یہ لڑکی جاتی تو کہاں جاتی، اس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا، پھر یہ ہوا کہ اس کا باپ بھی بھاگ گیا اور اس عورت کا ایک پرانا آشنا اس کے گھر میں آ کے رہنے لگا۔ اب دونوں نے مل کر اس لڑکی پر ظلم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے جس کی انتہا اس کو گھر سے نکالنے پر ختم ہوئی۔ لڑکی ایک مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی رو رہی تھی اور شاید بھیک مانگ رہی تھی کہ میری بیوی کی نگاہیں اس پر ٹک گئیں، انہوں نے اسے پہلے بسکٹوں کا ایک پیکٹ دیا جسے اس نے چھوا تک نہیں، بس منہ بسورے گھورتی رہی، تب انہوں نے پانچ روپے کا ایک سکہ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے جھپٹ لیا۔ اس کی اس حرکت سے پتہ نہیں مری بیوی نے کیا مطلب نکالا کہ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کا آفر دے بیٹھیں جس کو اس نے قدرے جھجک کے ساتھ قبول کر لیا۔

میری بیوی میں ایک خصوصیت ہے جس کا ذکر شروع میں ہی کر دینا چاہئے تھا۔ گو اب بھی کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ وہ خراب سے خراب صورتحال کا بھی کوئی مثبت پہلو نکال لیتی ہے۔ اس نے لکی کا پس منظر جان لیا تو فوراً سمجھ گئی کہ اس کی سوتیلی ماں اسے لینے ہرگز نہیں آئی بلکہ اس کی قیمت وصول کرنے آئی ہے۔ لکی اب ایسی بن گئی تھی کہ اس کا محنتانہ وصول کیا جا سکتا تھا اور ہمارے سامنے اس کا مطالبہ مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر میری بیوی بھی اپنی اس محنت کی قیمت وصول کرنا چاہتی تھی جو وہ لکی پر کر چکی تھی، چنانچہ دونوں فریقین کی طرف سے مول تول کا معاملہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف زیادہ سے زیادہ بولی چل رہی تھی دوسری طرف کم سے کم کی کوشش اس سلسلے میں سب سے دلچسپ رویہ لکی کا تھا کہ وہ ایک دم چپ سادھے بیٹھی رہی، وہ کبھی اپنی سوتیلی ماں کی طرف دیکھتی، کبھی میری بیوی کی طرف اور پھر اپنا سر جھکا

www.taemeernews.com

دیتی۔ میرا غصہ لکی کی طرف مرکوز تھا۔ میری بیوی ترس کھا کر اسے یہاں لائی تھی، اسے جانور سے آدمی بنایا، اسے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت دی اور وہ اس وقت بالکل غیر جانب دار بنی ہوئی تھی۔ اکتا کر میں ابل ہی پڑا۔

ارے بھائی، اتنی بحث کی کیا ضرورت ہے، اسے اس کی ماں کے حوالہ کردو، تمہیں بہت مل جائے گیں..... میری بیوی نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہ رو رہی ہو۔

آپ کیوں بیچ پڑتے ہیں، یہ میرا معاملہ ہے، میں دیکھ لوں گی.....

مجھے کیا، میں تو اس کی بھلائی کے لئے کہہ رہا تھا، میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑا اور اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ نیند ٹوٹی تو تول مول کا معاملہ حل ہو چکا تھا اور لکی کی ماں جا چکی تھی۔ مجھے اس سے بھی دل چسپی نہیں تھی کہ معاملہ کتنے پر طے ہوا، بہر کیف میری بیوی بہت خوش تھی اور اسے اپنی فتح یابی سے تعبیر کر رہی تھی۔ لکی بدستور رہتی رہی البتہ میری بیوی کے رویے میں تھوڑا فرق آ گیا، وہ اس کے سلسلے میں میں خاصی محتاط ہوگئی، شاید یہ احساس اس کے شعور میں شامل ہو گیا تھا کہ اب اس لڑکی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور یوں اس کی قیمت ادا کرنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں تھا پھر بھی تب میں اور اب میں فرق تو آ ہی گیا تھا۔ میری بیوی لکی کو بنانے، سنوارنے میں لگی رہی، اب تو اس کی محنت کی ایک قیمت بھی مقرر ہو گئی تھی۔

لکی ایک معمولی اور سیدھی سادی سی لڑکی تھی، اس کے جسم اور شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کا ذکر کیا جا سکے، مگر اس کے الجھے الجھے بال میں چھپا ہوا جو ٹیڑھا میڑھا نہ تھا، اس میں ایک خاص قسم کی ذہانت چھپی ہوئی تھی۔ میری بیوی لکھانے پڑھانے پر محنت کرتی تو شاید اسے مایوسی ہاتھ نہیں آتی مگر اس نے اس کی ذہانت کو دوسرا رخ دے دیا تھا۔ طرح طرح کے پکوان مکان کو صاف ستھرا، سجا سجایا رکھنا، اٹھنے بیٹھنے کے آداب، رہنے سہنے کے طریقے، لباس وصفائی کا سلیقہ..... مختصر یہ کہ پتھر کو جس طرح چمکا کر ہیرا بنایا جاتا ہے، میری بیوی پورے خلوص کے ساتھ اس کو ہیرا بنانے میں لگی تھی۔ کبھی کبھی لکی اس سے بھی بڑھ کر اپنا ہنر دکھا جاتی۔ میں کسی خاص پکوان کی تعریف کے لئے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا تو وہ میری نگاہوں کو لکی کی طرف موڑنے کی کوشش کرتی۔

تعریف کرنا ہے تو لکی کی کیجئے، میرا اس میں کیا.....؟''

لکی اتنا اچھا بنانے لگ.....؟ یعنی آپ سے بھی اچھا.....؟

میرے منھ سے بے ساختہ نکل جاتا۔

میری بیوی فخریہ انداز میں مسکراتی۔ اصل تعریف کی مستحق تو وہی تھی۔ دھیرے دھیرے لکی اتنا کچھ سیکھ گئی کہ میری بیوی کے حق میں راوی چین ہی چین لکھنے لگا۔ گھر کے سارے کام کاج آہستہ آہستہ لکی

www.taemeernews.com

کے ذمے ہو گئے تھے بلکہ وہ اپنے سیکھے ہوئے ہنر کو دکھانے کے لئے خود میں مستعد رہتی۔ میری بیوی کے لئے کوئی خاص کام بچتا ہی نہیں تھا، وہ اپنی دفتری مصروفیات میں بڑے اطمینان سے لگی رہتی اور لکی کی سوتیلی ماں کو بڑی پابندی سے پیسے بھجواتی رہتی۔ لکی کو دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوتی کہ اس نے کس طرح اتنے سارے کام آسانی سے سنبھال لئے، اپنے کاموں کے لئے میری بیوی کتنی پریشان رہتی تھی۔ لکی میں بس ایک ہی کمزوری تھی، وہ ڈرپورک بہت تھی، ڈر بھی کس سے.....؟ بھوت سے.....طرح طرح کے بھوتوں کا تصور اسے چاروں طرف سے گھیرے رہتا، کبھی کبھی تو وہ اپنے سائے سے بھی ڈر جاتی۔ ہم دن بھر کے لئے اپنے اپنے کام سے باہر نکل جاتے وہ دونوں باہری دروازے سے، ساری کھڑکیاں اور بالکونی وغیرہ کو تقریباً سیل کر دیتی، اس سلسلے میں وہ ٹھیک آدھے درجن تالے استعمال کرتی۔ دروازے تو وہ بالکل نہیں کھولتی تھی قیامت ہی کیوں نہ آجائے۔ ڈاک کا ڈبہ باہر تھا اور ڈاک سے جو رجسٹری یا پیکٹ وغیرہ آتے، انہیں وصول کرنے کے لئے ہمیں بہ نفس نفیس ڈاک گھر جانا پڑتا۔ کبھی کبھار ہمارے کچھ رشتہ دار ہماری غیر موجودگی میں اچانک آگئے تو وہ سر پٹک کر رہ گئے، اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ جو سمجھ دار تھے، وہ تو سمجھانے سے مان گئے۔ جو نہیں سمجھ سکے انہوں نے منہ پھلا لیا۔ وہ صرف ہماری گھنٹی کی مخصوص آواز کو پہچانتی تھی۔ اس میں کبھی ہم سے بھی چوک ہو جاتی تو اس نے اس وقت تک دروازہ نہیں کھولا جب تک ہم نے اپنی خاص پہچان اس پر ظاہر نہیں کر دی۔ داخل ہونے پر گھر ہمیں صاف ستھرا ملتا اور کھانا تر و تازہ۔

میری بیوی نے مارے محبت کے اس کے سونے لیٹنے کا انتظام اس کمرے میں کر دیا جو ہمارے بچوں کا کمرہ تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں ہم اسے صاف ستھرا کر کے مقفل رکھتے۔ مگر وہاں سے وہ فوراً بھاگ آئی۔ دراصل وہاں شیشے کی الماریوں اور شوکیس وغیرہ میں ہم نے ان کے بچپن کے کھلونے سجا کر رکھے تھے، بڑے بڑے ہی مین جبا جو اور مختلف قسم کے ماسک وغیرہ۔ ان سب میں اسے اپنے خیالی بھوت کا سایہ نظر آیا، پھر اس کا انتظام ڈریسنگ روم میں کرنے کی کوشش کی گئی، وہ ہمارے کمرے سے بالکل متصل تھا بلکہ اس کا ایک حصہ ہی تھا، میری بیوی نے وہاں زبردستی اسے سلایا بھی، پر وہ بار بار چیخ مار کے وہاں سے بھاگ آتی، مجبوراً اسے ہمارے ہی کمرے میں ایک کونے میں چٹائی بچھا کر سونے کی اجازت دینی پڑی۔ یہ صورت حال خیر ہمارے لئے نہایت تکلیف دہ تھی، مگر صرف اپنے آرام کی خاطر گوارا کرنا پڑی۔

ہماری شادی کو بیس برس گزر چکے تھے، دونوں بچے دور دراز کے شہروں میں تعلیم کے حصول میں مشغول تھے۔ ہماری ازدواجی زندگی بے حد مطمئن اور خوشگوار تھی۔ محبت کی جس مضبوط ڈور سے ہم بندھے تھے، وہ کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھار تھوڑی بہت ہوتی بھی تو پھر تازہ دم ہونے کے لئے نئے جوش کے ساتھ آگے کے سفر کے لئے۔ مگر ہمارے بیڈروم میں ایک تیسرے وجود کی موجودگی اس

www.taemeernews.com

ڈور کو بار بار جھٹکا دے رہی تھی، یوں لگی ایک بار سوتی تو پھر صبح ہی اٹھتی، مگر اس کے بے ترتیب سانسوں کا مدوجزر اور جوانی کے مدہوش خراٹے، اس کی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے۔ ہمیں دیر تک نیند نہیں آتی اور ہم ایک دوسرے کو بس دیکھتے رہتے۔ ہماری انکھوں میں طرح طرح کے سوالات جنم لیتے رہتے، جن کے جواب دوسرے کی آنکھوں میں دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ شاید حالات کے جبر کے تحت ہم اشاروں کی زبان بھی سمجھنا بھول چکے تھے کیوں کہ اشارے ہمارے جسموں کو چھونے لگتے تو ہم دوسری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ ہمیں کس وقت نیند کی دیوی اٹھا لے جاتی اور کب ہمارے بستروں پر لا پٹکتی ہمیں کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا۔

ہمیں شدت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنے آرام کی ہم بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں۔ میری بیوی لکی پر بار بار جھک کر اس کی نیند کی گہرائی کا مشاہدہ کرتی، اس کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ کے اس کی سانسوں کے زیر و بم کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی، اس کے جسم کے حساس حصوں پر ہاتھ پھیر کر اس کے حواس کو محسوس کرنے کی سعی کرتی، پھر میری طرف فاتحانہ نگاہیں ڈالتی مگر ہمارے درمیان لکی کے علاوہ بھی ایک نامعلوم مبہم وجود ڈیرہ جمائے موجود تھا۔ وہ ہماری ساری آنکھوں اور خوشیوں پر پانی پھیرتا رہتا اور ہم اپنے بستروں پر بے شمار سلوٹیں پیدا کرنے کے موجب بن جاتے۔

میری نگاہیں بیوی سے بار بار کہتیں۔

کچھ کرو..... کچھ کرو.....

میری بیوی کی کشادہ پیشانی پر بے شمار لکیریں ابھرتیں، مٹتیں پھر ابھرتیں..... ایک دن اچانک لکیریں مٹتی دکھائی دیں۔ اس کے چہرے پر سکون کی کچھ نامکمل لہریں مچل رہیں تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بیڈروم کے بغل والے اس کمرے میں لے گئی جو ڈریسنگ روم تھا۔ اس نے کھڑکیوں کے جال کے پیچھے کتے کے کارٹنوں کو کاٹ کاٹ کر اس طرح سیل کر دیا تھا کہ یہ چھوٹا سا کمرہ ایک محفوظ قلعہ سا بن گیا تھا۔

مگر اسے تو تنہائی سے خوف آتا ہے.....؟

میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

میری بیوی ہنسی۔

اسے تنہائی نہیں تنہائی کے بھوت سے خوف آتا ہے.....

میں سمجھا نہیں اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

وہ پھر ہنسی

اس کم بخت کو لگتا ہے اسے بھوت دیکھتا ہے/

www.taemeernews.com

دبو چتا تو نہیں.....؟

دبو چے تو اس کا خوف ہی نکل جائے.....؟

میری بیوی ٹینشن دور ہونے سے خوش دلی کے موڈ میں تھی۔

تو آپ نے بھوت کی آمد کے سارے راستے بند کر دیے ہیں----

میں نے ایک بار پھر بغور اس کی کاوشوں کو دیکھا۔

کوشش تو کی ہے.....

اس نے جواب دیا۔ اعتماد اس کے لب و لہجے سے جھلک رہا تھا۔

پہلی رات تو اس کا اعتماد متزلزل نہیں ہوا، لکی رات بھر سوتی رہی اور اسے کوئی بھوت دوت دکھائی نہیں دیا۔ یہ رات ہمارے لئے سکون کا ایک نیا پیغام لے کر آئی۔ مگر دوسرے ہی دن سوتے میں اچانک بند دروازے کی راہ داری میں کوئی چلتا ہوا سا محسوس ہوا۔ میری بیوی تو ڈر گئی اور میں دم سادھے اگلے لمحوں کا منتظر رہا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور کسی کے سسکنے کی آواز.....

دروازہ کھولا تو لکی کھڑی سسک رہی تھی، مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں وہاں سے فوراً ہٹ گیا، میری بیوی کو پتہ نہیں کیوں اس پر ترس آ گیا اور اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

کیا ہوا رے.....؟

بھو..... بھ..... بھوت.....؟

اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور میری بیوی سے تقریباً لپٹ گئی۔ میری بیوی نے بہ وقت تمام اسے اپنے سے الگ کیا اور مجھے آواز دی شاید وہ بھی تنہا اس کمرے میں جانے سے ڈرتی تھی۔ میں بڑی بے زاری سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہوا کے زور سے کارٹن کے ٹکڑے اپنی جگہ سے ہٹ گئے تھے اور باہر کی تیز ہوا پر شور جھونکے کے ساتھ اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم نے ان ٹکڑوں کو اپنی جگہ پر پھر جما دیا اور اسے وہیں سونے کا حکم دیا اگر چہ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھی لیکن اس وقت اس پر سختی کرنا ضروری تھا ورنہ اس کا یہ روگ ایک مستقل عذاب بن جاتا۔

ہم تو اپنے بیڈ روم میں بند ہو گئے مگر یہ احساس ہمارے شعور میں لگاتار کچوکے لگاتا رہا کہ لکی رات بھر کمرے اور راہ داری کا چکر کاٹ رہی ہے۔ ہمارا گھر ایسا تھا کہ دیوار پار کی ساری حرکتوں کا ہمیں اندازہ ہوتا رہتا۔ ہمیں لکی سے ہمدردی تھی۔ اس کی وجہ سے ہمیں آرام میسر تھا مگر اس وقت اپنے آپ پر جبر کرنا بھی گویا اس کے حق میں تھا۔

ہماری سختی رنگ لائی۔ لکی اس کمرے میں سونے لگی، ہم نے اس کا پورا پورا خیال رکھا کہ اس کا کمرہ پوری طرح سیل رہے اور لکی کو بھوت دکھائی دینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے۔

www.taemeernews.com

اس درمیان ایک اور بڑی پریشانی نے آگھیرا۔

میری ساس بہت بیمار ہوگئی اور میری بیوی کا ان کے پاس جانا بہت ضروری ہوگیا۔ میں تو یہ سنتے ہی خود کو بیمار محسوس کرنے لگا۔ میرا جانا ممکن نہیں تھا اور میری بیوی لکی کو نہیں لے جاسکتی تھی، کیونکہ اس صورت میں گھر کی دیکھ بھال اور مجھے کون دیکھتا۔

فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ہم یوں بھی دن بھر گھر پر کب رہتے ہیں۔ لکی جیسے رہتی تھی رہے گی اصل مسئلہ تو رات کا ہے، آپ ذرا اس کے کمرے میں جھانک لیجئے گا، بند کمرہ اس کے لئے ٹھیک ہے مگر جہاں کہیں باہر کچھ کھلا رہ جائے، اس کم بخت کو بھوت دکھائی دینے لگتا ہے.....''

میں جانتا تھا کہ سمجھا دینا جتنا آسان ہے۔ سمجھنا اتنا ہی مشکل، یہ لڑکی میرے لئے پروبلم پیدا کرے گی، اسے مان ہی کر چلنا ہوگا۔ بیوی سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ اسے تو جانا ہی تھا۔ پھر اس کے سفر کو کیوں برباد کیا جائے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا تھا کہ اس سے جلد واپس آنے کی درخواست کروں، سو وہ میں نے کیا اور اپنے آپ کو تقدیر کے سہارے حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

اس رات پتہ نہیں آسمان کو کیا تکلیف پہنچی تھی کہ اس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا۔ اسے اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی کہ اس کے اس عمل سے نیچے زمین پر طوفان آجائے گا۔ اور کیسا ہاہا کار مچے گا۔ ایسی زبردست بارش ایسا، زبردست طوفان..... اس کے سامنے کارٹن کے ٹکڑوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی وہ پتہ نہیں اڑ کر کہاں چلے گئے۔ لکی کے کمرے میں ایک نہیں کئی ایسے راستے کھل گئے جن سے بلا روک ٹوک بھوت کی آمد ہوسکتی تھی۔

بہت دیر تک میں طوفان کے رکنے کا انتظار کرتا رہا، لکی ایک کونے میں دبک کر کھڑی رہی گھنٹوں کے بعد طوفان تھما تو میں نے اسٹور میں رکھے ہوئے۔ کارٹن نکالے اور ان کے ٹکڑوں سے لکی کے کمرے کو پھر ٹھیک ٹھاک کرنے کی کوشش کی اور اسے وہاں سونے کو کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں کیا کرتا، اسے تو ہر حال میں اپنے ہی کمرے میں سونا تھا۔

کمرہ بند کرکے میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ مجھے خیال آیا کہ کم سے کم مجھے اپنا کمرہ بند نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے اس لڑکی کو تشفی بھی رہے گی اور میں بھی اپنی نگاہیں اس پر رکھ سکوں گا۔ وہ رات اپنے دامن میں بے چینی اور وحشت چھپا کر لائی تھی اس لئے سکون مفقود تھا۔ مگر وہ جو کہا جاتا ہے نیند سولی پر بھی آجاتی ہے پتہ نہیں کب نیند دبے پاؤں نکلی اور اس نے مجھ پر ایک ہی جست میں غلبہ پالیا۔

اچانک آنکھ کھل گئی۔ گھر کے اندر ایک دبا دبا سا طوفان آیا ہوا تھا۔ لکی کی سسکیاں سارے گھر میں گونج رہی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر باہر بھاگا لکی راہ داروں میں کھڑی بری طرح رو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

www.taemeernews.com

کیا ہوا لکی — ؟ ڈر لگا کیا — ؟

وہ کچھ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس نے تھرتھراتی انگلی سے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بے ساختہ اس طرف دوڑ گیا۔ ہوا یہ تھا کہ ہوا کافی تیز چلی تھی اور کارٹن کے ٹکڑے پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔ انہیں اس وقت ٹھیک کرنا اس لئے مشکل تھا کہ اس کے لئے باہر جانا پڑتا۔ رات بہت ڈراونی تھی، موسم نے اسے اور بھیانک بنا ڈالا تھا۔ اب مسئلہ تھا کہ لکی سوئے کہاں اپنے کمرے میں تو کسی حال میں نہیں سو سکتی تھی۔ اس وقت وہ صرف میرے ہی کمرے میں سو سکتی تھی، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجبور ہو کر میں نے اسے یہیں چٹائی بچھا کر سونے کو کہہ دیا۔ مگر پتہ نہیں اسے کیا ہوا کہ وہ میری بات سن کر ٹس سے مس نہیں ہوئی اور یونہی کھڑی لرزتی سسکتی رہی۔ میں نے خود ہی چٹائی لا کر بچھا دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس پر لانے کی کوشش کی۔

ارے ..... میرا ہاتھ جیسے اچھل پڑا۔ اسے تو بہت تیز بخار تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر میں ڈر گیا۔ اس کو کچھ ہو ہوا گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اب تو وہ بے سہارا بھی نہیں رہی۔ اس کی تمام تر قیمت وصول کرنے والی اس کی سوتیلی ماں موجود ہے۔ اس کے ہاتھ سے سونے کا انڈا دینے والی مرغی چلی گئی تو پتہ نہیں وہ کیا قیامت برپا کرے گی۔ ان سب کے علاوہ اس وقت اس بچی کی جان کو بچانا بے حد ضروری تھا۔ فوری طور پر ایک میرے ذہن نے ایک فیصلہ کیا اور۔ میں نے لکی کو ایک جھٹکے میں اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنے بستر پر لا کر ڈال دیا۔ الماری سے ایک کمبل نکال کر اسے اوڑھا دیا اور کہا۔

اب اطمینان سے سو رہو، یہاں کوئی بھوت ووت نہیں آئے گا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا تو لمحہ بھر کے توقف کے بعد میں پھر بولا۔

ایک بات یاد رکھنا لکی میں صرف تمہاری جان بچانے کے لئے یہاں تمہیں لایا ہوں۔ یہ بات کبھی کسی کو معلوم نہ ہو، میڈم کو بھی نہیں .....؟

دوسری طرف کروٹ بدل کر میں نے خود بھی سونے کی کوشش کی حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ نیند کو شاید لکی کا بھوت بھگا لے گیا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اچانک مجھے محسوس ہوا کہ لکی کمبل کے اندر بھی لرز رہی ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ میں نے بنا کچھ سوچے سمجھے اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے کمبل سمیت اپنی طرح بھینچ لیا۔ آہستہ آہستہ ایسا لگا کہ اس کی کپکپاہٹ کم ہو رہی ہے۔ اس کا سسکنا بند ہو گیا تھا۔ میں نے اسے مزید لپٹا لیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجھ میں کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ ایک اجنبی وادی میں بے ارادہ مرے قدم چلے گئے ہیں۔ لکی کو، سچی بات یہ تھی کہ میں نے آج تک نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ بس اچٹتی ہوئی سی نگاہیں ..... یوں تو وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ میری بیوی نے اسے جو کپڑے دیئے

www.taemeernews.com

تھے، وہ تقریباً سب کے سب اس کو ڈھیلے ہوتے تھے، اس لئے اس کے جسم کے نشیب و فراز بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ مگر اس وقت میرا واسطہ کسی اور ہی چیز سے پڑ رہا تھا۔ بے حد جوان اگداز، لچکیلا جسم..... جس حصے سے بھی میرے ہاتھ مس کرتے، مجھے ربڑ کی گیند یاد آجاتی مجھے یہ اندازہ ضرور تھا کہ یہ لڑکی جوانی کی سرحدوں میں داخل ہو چکی ہے یہ پتہ بالکل نہیں تھا۔.....

میرے ہاتھ اس کے جسم کے سارے حصوں پر پھسلتے رہے اور میں اس کے بخار کو اپنے جسم میں جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے سکون آیا تھا اور وہ نیند میں مدہوش ہو چکی تھی۔ لیکن میرا سکون پوری طرح غارت ہو چکا تھا۔ میں پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ لکی کے جسم کا لرزہ بھی میرے جسم میں منتقل ہو گیا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں میں لکی کو اپنے آپ سے الگ نہیں کر پا رہا تھا۔ کوئی طاقت مجھے بار بار روک دیتی تھی۔

یوں میں پہلی بار ایسی لذت سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں ایک پختہ عمر کا شادی شدہ مرد تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کبھی بے وفائی بھی نہیں کی تھی۔ اس نے مجھے ازدواجی زندگی کی بھرپور لذت دی تھی، اس کا جسم مجھے ہمیشہ سرشار کر دیتا تھا۔ مگر اس معمولی سی لڑکی کے جسم میں کون سی ایسی بات تھی کہ مجھے لگ رہا تھا ساری زندگی اسی طرح گزر جائے۔ سارے جسم میں گولائیاں ہیں کو گولائیاں..... انتہائی درجے کی ملائمیت..... لمس کا بے پناہ سرور.....

ساری رات وہ میرے وجود میں ڈوبی رہی اور مزے کی نیند سوتی رہی اور میں..... وہ رات شاید میری زندگی کی مختصر ترین رات تھی جو پلک جھپکتے ہی گزر گئی۔ میں اس رات کی درازئ عمر کی دعا مانگتا رہا مگر دعا کو باب قبول نہ مل سکا۔

صبح لکی بالکل ٹھیک تھی معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف..... میری نگاہیں اس سے دو چار نہیں ہو پا رہی تھیں۔ جس لڑکی کو میں نے نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا، رات کے آخری چند گھنٹوں میں اس کے جسم کے سارے رازوں سے واقف ہو گیا تھا۔ جو کچھ ہوا اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا، نہ ہوتا تو شاید اس کی جان نہیں بچتی، مگر اس کے نتیجے میں جو کچھ مجھے حاصل ہوا۔ اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں ایک زبردست طوفان میں پھنس گیا تھا اور فی الحال کسی کام کے لائق نہیں رہا تھا۔

اس روز میں اپنے کام پر بھی نہیں گیا۔ بستر میں پڑا رہا۔ لکی ناشتے کو پوچھنے آئی تو منع کر دیا۔ میں اندر کی ہلچل پر قابو پانے میں مصروف تھا، گو مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس میں کامیاب ہو سکوں گا۔ لکی کو نارمل اور اپنے کام میں لگن دیکھ کر مجھے قدرے سکون تو ہوا مگر میں ایک احساس گناہ اور اس میں پوشیدہ احساس لذت مجھے دیر تک اپنی گرفت میں لئے رہے۔

دوپہر تک میں اپنے آپ پر قابو پا سکا، ہمت کر کے اٹھا، غسل خانے سے نکلا تو لکی نے میز پر

www.taemeernews.com

کھانا لگا دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں کھانے پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے خاتمے پر اس نے چائے کا ایک بڑا کپ مجھے تھما دیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، کھانے کے بعد میں چائے نہیں پیتا تھا۔

آپ نے صبح کی چائے نہیں پی تھی.....''

اس نے ہولے سے جواب دیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے بشرے پر ایسا کچھ نہیں تھا جسے میں پڑھ سکتا اور اس کا کوئی مطلب نکال سکتا۔ یوں میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اور ابھی مجھے کیا کرنا ہے۔

میں کارپنٹر کی تلاش میں نکلا جو تھوڑی کاوش کے بعد مجھے مل بھی گیا۔ میں نے اسے لکی کے کمرے کی باہری مرمت پر لگا دیا۔ ابھی تک ہم اپنے طور پر کام چلا رہے تھے اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل نکالنا ہی ہوگا چند گھنٹوں کی محنت کے بعد وہ کمرہ یوں سیل ہو گیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھا اور اب شاید کوئی طوفان اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ کارپنٹر کو میں نے مزدوروں کے علاوہ کچھ انعام بھی دیا اور بیوی کو یہ خوش خبری سنائی البتہ رات کی بات ایک دم گول کر گیا۔ لکی کو اس سلسلے میں منع کر ہی چکا تھا۔ بیوی نے اطلاع دی کہ اس کے آنے میں مزید دیر ہو جائے گی۔ مگر اب مجھے اس کے آنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

لکی کو میں نے تاکید کی کہ اب وہ اطمینان سے اس کمرے میں سوئے اور بھوت ووت کو بالکل بھول جائے، یوں میرا کمرہ کھلا رہے گا۔ کوئی بات ہوئی تو میں دیکھ لوں گا۔ لکی ایک دم بے وقوف لڑکی نہیں تھی۔ اسے بھی یہ انتظام دیکھ کر کافی تشفی ہوئی۔ وہ یوں بھی زیادہ بولنے والی لڑکی نہیں تھی۔ پھر بھی رات باقی تھی۔ اس کا اصل امتحان تو رات ہی میں ہونا تھا۔

رات وہ بڑے آرام سے سوتی رہی مگر نیند میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی، مجھے برابر اس کا کھٹکا رہا کہیں وہ پھر نہ ڈر جائے۔ اپنے آرام کی خاطر اس کو آرام پہنچانا بہت ضروری تھا۔ ایک ذرا سی آہٹ پر میں چونک اٹھتا ایک بار وہ شاید ٹوائلٹ جانے کے لئے اٹھی تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور دم سادھے اس کا منتظر رہا۔ شکر ہے کہ وہ فارغ ہو کر پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دو ایک بار میں نے اس کے کمرے میں جھانکا بھی۔ وہ بے سدھ سوئی ہوئی تھی۔ ہاتھ کہاں پیر کہاں بدن کہاں، خود کہاں..... میں جلدی سے ہٹ گیا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ رات کسی مشکل کے بغیر گزر گئی۔ صبح لکی کے چہرے پر گہری نیند کا سکون تھا۔ یوں میری نیند سکون بخش نہیں رہی تھی۔ یہ کیفیت آگے بھی برقرار رہی۔ پہلی رات کی وجہ تو کسی حد تک سمجھ میں آتی تھی مگر آگے..... اب تو کوئی مسئلہ باقی میں نہیں رہا تھا، لکی آرام سے سوتی رہی اور گھر کے کام کاج میں مگن تھی۔ مجھے بھی کوئی ٹینشن نہیں تھا۔

پھر.....؟

www.taemeernews.com

دو تین روز کے بعد میری بے سکونی بے چینی میں تبدیلی ہوگئی۔ شاید لکی کا پرابلم میرے اندر منتقل ہوگیا تھا۔ اب فکر مجھے کوئی بھوت ڈرا رہا تھا۔۔۔؟

سوتے سوتے کروٹ بدلتے ہوئے اچانک میری نیند ٹوٹ گئی تو میں نے اپنے خود کو لکی کا منتظر پایا۔ یعنی.....؟

مجھے یقین نہیں آیا..... میں لکی کا منتظر تھا.....؟

کیوں.....؟

میرے اندر سے کوئی لکی کو پکار رہا تھا۔ میں اس آواز کو بہ خوبی سن رہا تھا اور اس کو دبا دینا چاہتا تھا۔ پر یہ چیز میرے بس میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر بھی میں اپنی شکست کو تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

شکست اور وہ بھی اپنے آپ سے.....؟ کبھی نہیں.....!

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نیند مری آنکھوں سے یوں بھاگی ہوئی تھی کہ پتہ نہیں چلتا تھا وہ کبھی میری آنکھوں میں آئی بھی تھی یا نہیں۔ میں اتنی دیر سے چکر کاٹ رہا تھا، ہر تھکاوٹ کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ دو ایک بار میرے قدم بالکل غیر ارادی طور پر لکی کے کمرے کی طرف اٹھ گئے مگر میں نے انہیں اپنی پوری قوت ارادی سے روک دیا اور اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میرے اندر کوئی التجا کرتا رہا کہ میں دروازہ کھول دوں پر میں نے اپنے کان بند کر لئے اور اپنے آپ کو کسی طرح گھسیٹ کر بستر پر لے گیا۔ کسی طرح صبح ہوئی تو میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ لکی چائے لے کر آئی تو میرا جی چاہا کہ اسے واپس کر دوں، لیکن اتنی ہمت میرے اندر پیدا نہیں ہوئی اور لکی پائنتی رکھی میز پر چائے رکھ کر چلی گئی۔ میری نگاہیں نہایت بے تابی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

شاید..... میں نے پہلی بار لکی کو غور سے دیکھا..... اس کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ تھا وہ صرف اس کی جوانی تھی۔ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی مگر اس کے معمولی اعضاء پر جوانی نے یوں پالش کی تھی کہ وہ سب چمک اٹھے تھے۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا۔ لیکن اس کے جسم کے خاص حصوں پر اس کے کپڑے ٹھہر ٹھہر جاتے اور لمحہ بھر کے لئے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں بجلی پیدا کر دیتے۔ اچانک یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ لکی کے جسم کے تمام رازہائے دروں سے میں تو واقف ہوں، اس کا شباب اور جسم میری آغوش میں رہا ہے، میں نے فوراً اپنے ذہن کے اس دریچے کو بند کر کے ذہن کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ وہ واقعہ ایک غیر ارادی یکطرفہ اور ناگزیر تھا جو محض اس کی زندگی کو بچانے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ اور اس سے حظ اٹھانا انتہائی درجے کی کمینگی، جو کسی اور سے نہیں مجھ سے سرزد ہو رہی تھی۔ میں اپنی سوچ سمیت ایک خاص مقام پر رک گیا اور وہاں ٹھہر کر ان حسین لمحوں کا جائزہ لیا جن سے میں ابھی ابھی گزر رہا تھا تو میں شرمندگی کے سمندر میں ڈوب ڈوب گیا۔

www.taemeernews.com

یہ میں کیا کر رہا تھا——؟

لکی بہ حالت مجبوری، محض اپنی محنت کے عوض ہمارے گھر میں رہ رہی تھی اور گویا ہماری پناہ میں تھی اور میں امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ میں نے محاورتاً نہیں، حقیقتاً اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارے۔ میں نے اپنی ان نگاہوں کو باندھنے کی پوری کوشش کی جو بار بار بہت بے تابی سے لکی کی طرف اٹھ رہی تھیں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، سبزیاں کاٹتے مصالحہ پیستے، گھریلو کام کرتے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے ..... نگاہیں اس پر ٹھہر جاتیں میں نے انہیں جلدی سے دوسری طرف موڑ دینا چاہے دوسری طرف دیواریں کیوں نہ ہوں۔ میں جلدی سے گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اور لکی ناشتہ تیار کرنے میں دیر کر رہی تھی۔ یا شاید مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے اندر ایک زبردست دباؤ سا تھا، اس دباؤ کے تحت میں نے اس سے جلدی کرنے کو کہا، بہر کیف وہ پھرتی سے ناشتے کی مٹرے اور چائے رکھ کر چلی گئی۔

میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور اسے کھانا بنانے کا کہہ کر گھر سے نکل گیا۔

دن بھر میں نے ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی بھرپور کوشش کی، لکی کا خیال بار بار کسی نہ کسی گوشے سے جھانکنے کی کوشش کرتا اور میں بار بار اسے جھٹک دیتا۔ دن بھر کی شعوری کوششوں اور محنت کا فائدہ یہ ہوا کہ میں دیر شام گھر واپس جا رہا تھا تو میرا ذہن اپنے بزنس کے حساب میں الجھا ہوتا تھا۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی کہ میری بھوک چمک اٹھی تھی اور میں فوراً سونا بھی چاہتا تھا۔

لکی نے حسب معمول کھانا بہت اچھا بنایا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر نہایت دل جمعی سے نوش کیا اور اس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے کھانے کی تعریف بھی کی۔ لکی کو میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی مگر اس کے چہرے پر ایک سرخی مائل روشنی ضرور آئی ہوگی جسے میں نے صرف محسوس کیا۔ اپنی نگاہوں کو اس سے محروم کیا۔

میری کوششیں کافی حد تک رنگ لائیں اور نوے فی صد رات آرام سے کٹ گئی۔ دس فی صد میں، میں دو بار پانی پینے کے لئے اٹھا ایک بار استنجی کے لئے۔ ہر بار میری نگاہیں لکی کے کمرے کی طرف اٹھتیں اور بہت بار دبی کچلی خواہش نے دھیرے سے سر اٹھایا۔

کاش.....کوئی بھوت اسے پھر ڈراتا.....!

میں نے گویا اپنے آپ کو ایک مضبوط کھمبے سے باندھ دیا تھا اور اپنے گرد مضبوط رسیاں کس دی تھیں کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی میں ہل نہیں سکتا تھا یعنی جب کھمبا ہلتا، تب ہی میں ہلتا اور کھمبے کے ہلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی دوران میری شدید خواہش ہوئی کہ بیوی اب واپس آجاتی۔ اس کی ماں تو اب ٹھیک ہی ہیں، یوں بھی ایک ضعیف تو بیمار رہتا ہی ہے۔ وہ دو تین روز کے لئے گئی تھی، اب ایک ہفتہ ہو گیا۔ میں نے فون کیا تو انہوں نے جواب میں لکی کا نام لیا..... مجھے وقت پر کھانا ناشتہ مل جاتا ہے۔ گھر کی

www.taemeernews.com

مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے۔.....اور کیا چاہئے مگر ان کے حصول کے لئے مجھے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، انہیں کیا پتہ وہ ابھی اور رہیں گی۔

دو تین روز اسی کھینچا تانی میں گزرے، یعنی میں رسی تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا مگر میری اپنی ہی باندھی ہوئی رسی مجھے میرے ہی کھمبے کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتی، پر وہ رسی ہی تھی اور میری ہی باندھی ہوئی.....ایک رات پتہ نہیں میں کس ضرورت سے اٹھا، گلا خشک ہو رہا تھا۔ دو تین گلاس پانی اپنے اندر انڈیلا، پیاس کم نہیں ہوئی بلکہ اس کے ساتھ جو جلن تھی، اس میں مزید اضافہ محسوس ہوا۔ میں باتھ روم چلا گیا، وہاں سے واپس آنے کے بعد بھی نامعلوم بے چینی میں کچھ کمی نہیں ہوئی۔ نگاہیں بار بار لکی کے کمرے کی طرف اٹھ رہی تھیں اور میں نہایت شدت سے لکی کا منتظر تھا.....!

میں بار بار اس لمحے کو اپنی مٹھی میں کسنے کی کوشش کرتا رہا جب لکی بھوت کے ڈر سے دوڑتی ہوئی آتی اور میری گود میں گر جاتی۔ میں نے دوبارا سے جھانک کر بھی دیکھا، وہ بے سدھ سوئی ہوئی تھی اور اس کا کمرہ اندر باہر دونوں طرف سے قلعہ بند تھا۔ یہ قلعہ بندی کسی اور نے نہیں، خود میں نے اپنی نگرانی میں کرائی تھی۔ لکی کا کمرہ نیم تاریک تھا مگر میری نگاہیں روز روشن کی طرح ان کھڑکیوں پر پڑتی رہیں جن کو میں نے باہر سے سیل کروا دیا تھا۔

اس وقت میرا ذہن اپنی پوری قوت سے بس ایک ہی راستے پر رواں دواں تھا۔ آس پاس کی ساری چیزیں میری نگاہوں سے اوجھل تھیں۔ یوں میں بالکل واقف نہیں تھا کہ میری منزل کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

میری نامعلوم منزل کا دوسرا پڑاؤ صبح تھی۔ میں سیر کرنے کو باہر نکل آیا اور سب سے پہلی لکی کے کمرے کی باہری دیواروں اور کھڑکیوں کا بغور جائزہ لیا۔ دیواریں تو پہلے سے ہی مستحکم تھیں۔ انہوں نے پہلے میرا کچھ بگاڑا تھا نہ آئندہ بگاڑنے والی تھی مگر کھڑکیوں پر جو تختے ٹکے تھے، وہ میری ہی نگرانی میں لگے تھے۔ اور میں نے پوری احتیاط برتی تھی کہ وہ اکھڑنے نہ پائیں، گویا اپنی نامعلوم منزل کو میں نے اپنے ہی ہاتھوں سیل کر دیا تھا۔

میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے کھول دیا۔ انہوں نے زمانے کی سرد و گرم کو بہت دنوں تک برداشت کیا تھا۔ مگر ان میں کسی زمانے کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا تھا۔ ہتھیلیاں خشک اور سپاٹ تھیں اور ان کے اندرون جو کچھ چھپا تھا، وہ نگاہوں کی زد میں ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی یہ ہتھیلیاں متحرک تھیں۔ ان میں جو تڑپ تھی، وہ ان کی سرخی سے آشکارہ تھی۔

صبح پرسکون تھی، آس پاس سناٹا پھیلا ہوا تھا، میرے گھر کا پچھواڑا یوں بھی سونا ہی رہتا تھا۔ میں نے ایک کھڑکی کے تختے کو ہلا کر دیکھا، بہت مضبوطی سے جڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنی مضبوط اور بے

www.taemeernews.com

تاب ہتھیلیوں کو للکارا کہ وہ اس وقت اپنی زندگی و پائندگی کا ثبوت فراہم کریں اور نامعلوم منزل کے سفر میں میری مدد کریں۔

ایک آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد اس کی دو تین کیلیں ڈھیلی پڑ گئیں اب ایک آدھ تختے کو ذرا حکمت عمل سے ہٹا دیا جاتا تو اندر جھانکنا بہت آسان تھا۔

دوسرے مرحلے کی غیر معمولی کامیابی کے بعد تیسرا مرحلہ بچوں کے کمرے میں داخلے کا تھا جہاں چاروں طرف ان کے کھلونے سجے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے جانور پرندے، درندے، عجیب عجیب شکلوں کے انسان، ایک طرف مختلف قسم کے ماسک رکھے تھے۔ ان کے پیچھے کسی چہرے کو بھی چھپایا جاسکتا تھا اور انہیں لگا کر کوئی سوانگ بھی بھرا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک ماسک منتخب کرلیا۔ وہ میرے چہرے پر بھی خوب فٹ آیا۔

لکی نے شام کو غسل کے بعد گلابی رنگ کی شلوار جمپر زیب تن کیا تھا۔ اس لباس میں اس کی جوانی جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ میری نگاہیں بار بار اس پر ٹھہرنے لگیں تو شاید اس نے کچھ محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ میرے سامنے آنے سے گریز کرنے لگی ہے۔

وہ میری نگاہوں کے سامنے تھی تب بھی، میری نگاہوں سے اوجھل تھی مگر وہ میرے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کسی طرح شام کو رات کیا اس تیسرے مرحلے کو طے کیا اور اب میرے سامنے چوتھا پڑاؤ تھا۔

لکی اپنے کمرے میں گہری نیند میں ڈوب گئی تو میں چپکے سے باہر آیا، کھڑکی کے ایک چھوٹے سے تختے کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ ماسک کو اپنے چہرے پر لگایا اور اور کھڑکی پر ہلکی ہلکی ٹھوکریں لگانے لگا۔

ٹھک.....ٹھک.....ٹھک.....

لکی ذرا سی کسمسائی اور آنکھیں موندے موندے دوسری طرف کو ہوگئی۔ تھوڑے وقفہ کے بعد پھر ٹھک.....ٹھک.....ٹھک.....

یکبارگی وہ چونک کر اٹھ بیٹھی، متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا، اچانک کھڑکی پر نگاہیں پڑیں تو بے ساختہ چیخ اٹھی اور اٹھ کر بے تحاشا بھاگی مگر اتنی وحشت زدہ تھی کہ دو چار ہی قدم کے بعد بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

میں نے کھڑکی کے تختے کو اپنی جگہ پر پھر جما دیا، ماسک اتار کر اس کے ٹکڑے کر دیئے اور اندر آکر لکی کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا.....

.....اپنے بستر کی طرف.....

●●

www.taemeernews.com

سوفوکلس

● شبیر احمد

● جب ناٹک کار کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنے کرداروں کو اس حال میں دیکھا، تو آپے سے باہر ہو گیا! وہ جب بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب دیکھ لیتا تھا، تو اسی طرح غصے سے بھر جاتا تھا۔ وہ دونوں بھی چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے تھے۔ سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ ناٹک کار نوجوان کو ڈانٹ پلاتا، ''خبردار پھر کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو! وہ حشر کروں گا کہ پاگلوں کی طرح آنکھیں نوچتا پھرے گا! دفع ہو، دور ہو یہاں سے!!''

نوجوان نظریں نیچی کیے سرسراتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا۔ اور پھر ناٹک کار ابھنیتری کو پھٹکار لگاتا، ''تجھے لاج نہیں آتی۔ کم سے کم اپنے عمر ہی کا لحاظ کر!'' کیا میں نے تجھے اسی دن کے لیے ادا کاری سکھائی تھی، تیرے فن کو اسی دن کے لیے نکھارا تھا کہ جب لوگ تجھے سر آنکھوں پر بٹھانے لگیں تو تو ایک لونڈے کے عشق میں پاگل ہو کر میرے ارمانوں کا گلا گھونٹ دے!!''

اور اس بار ناٹک کار نے یہ بھی کہہ دیا تھا، ''مگر یہ نہ بھول، ابھی تیرے فن کا تکمیل تک پہنچنا باقی ہے۔ آج بھی تیرے فن میں خامی ہے!! اگر تو اسی طرح جذبات کی رو میں بہتی گئی اور کوئی غلط قدم اٹھا لیا تو یاد رکھ، بہت پچھتائے گی! شرم سے زمین میں گڑ جائے گی!!''

ابھنیتری حیران ہو کر بولی، ''میرے فن میں خامی!! میں نے برسوں محنت ریاضت کی ہے۔ عورت کا کون سا ایسا کردار ہے، جس پر میں نے اپنی فنکاری کی مہر ثبت نہ کی ہو۔ جب اسٹیج پر اترتی ہوں تو لوگ میری ہر ادا پر تالیاں بجاتے ہیں۔ میری تعریف کرتے نہیں تھکتے! اور آپ!!'' اس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے ناٹک کار کے چہرے کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور کہا، ''آپ کہہ رہے ہیں، میرے فن میں کمی!!''

ناٹک کار نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں، یہ سچ ہے کہ تو نے عورت کے سبھی کردار نبھائے ہیں، اور بہت اچھی طرح نبھائے ہیں۔ لیکن ایک کردار نبھانا باقی ہے!!'' تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد ناٹک کار پھر گویا ہوا، ''ہاں، باقی ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کردار کی تخلیق کروں۔ ایک ایسا ناٹک لکھوں، جو فن کی دنیا میں تجھے امر بنا دے!!''

www.taemeernews.com

اور اس کے بعد ناٹک کار اس کردار کی تخلیق میں جٹ گیا۔ اپنے کام میں ایسا غرق ہو گیا کہ اسے خود کی بھی خبر نہ رہی!! دن رات، صبح شام سوچتا رہا، لکھتا رہا۔ کئی مہینوں بعد جب ناٹک لکھ چکا تو اس نے اس کے تمام کرداروں کو جمع کیا اور کہا، ''اس کے بعد میں کوئی ناٹک لکھوں گا، نہ ہی کوئی رول نبھاؤں گا۔ ہدایت کاری بھی نہیں کروں گا۔ یہ میری زندگی کا آخری ناٹک ہوگا۔'' اس نے ابھنیتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''تو، اس کی ہیروئن ہوگی، اور وہ نوجوان!!'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا، ''وہ نوجوان کہاں ہے؟''

ابھنیتری نے کہا، ''میں نے اسے بلایا نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' ناٹک کار نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

ابھنیتری نے دھیرے سے کہا، ''اسے دیکھ کر آپ ناراض جو ہو جاتے ہیں!''

''اسے دیکھ کر میں ناراض ہو جاتا ہوں؟'' ناٹک کار نے حیرت سے پوچھا، ''یہ تجھ سے کس نے کہا۔ بھلا میں اس سے کیوں ناراض ہونے لگا؟ وہ تو میرے بیٹے جیسا ہے۔ اسے فون کرو۔ فوراً یہاں آنے کو کہو! وہی اس ناٹک کا ہیرو ہے!!''

یہ سن کر ابھنیتری کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کئی دفعہ چاہا تھا کہ وہ ناٹک کار سے التجا کرے کہ نوجوان کو بھی اس ناٹک میں کوئی چھوٹا سا رول دے دے۔ لیکن وہ یہ کہنے کی ہمت نہیں جٹا پائی تھی۔ اور اب جب کہ ناٹک کار نے خود ہی اسے ہیرو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ اس نے نوجوان کو فون لگایا۔ فوراً آنے کو کہا۔ اور جب وہ آ گیا اور سبھی کردار اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو، ناٹک کار نے کہانی شروع کی:

ایک گاؤں تھا۔ دور، ندی کے پار! پہاڑوں، جنگلوں سے گھرا ہوا، سرسبز گاؤں!! یہاں ہر روز سورج پائل کی چھم چھم اور سروں کی سرگم کے ساتھ طلوع ہوتا تھا۔

پائل جھنکانے اور نغمہ سرائی کرنے والی شوخ چنچل حسیناؤں میں ایک حسینہ وہ تھی جسے گاؤں والے پیار سے مرگ نینی پکارتے تھے۔ مرگ نینی گاؤں کی شان تھی، جان تھی۔ شادی بیاہ کی تقریب ہو یا تیج تہوار کا موقع، اس کے بغیر سب پھیکا پھیکا، سونا سونا لگتا تھا، ایسے موقعوں پر وہ رقص اور گیتوں سے ایسا سماں باندھ دیتی تھی کہ بچے اور جوان تو درکنار پیر فرتوت کے بدن بھی تھرک اٹھتے تھے۔ لوگوں کی خوشیوں میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے ناٹکوں میں اپنی اداکاری کے خوب خوب جوہر دکھاتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں آس پاس کے قصبوں میں جاترا دل آیا کرتے تھے۔ ان میں شہر کے نامور ڈراما آرٹسٹوں کے علاوہ بڑے بڑے فلمی ستارے بھی جلوہ گر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پاس والے قصبے میں ایک جاترا دل نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ مرگ نینی جاترا کی شوقین تھی۔ ہر روز جاترا دیکھنے جاتی تھی۔ مہا

www.taemeernews.com

بھارت کی مشہور کہانی 'نل دمینتی' پر مبنی ناٹک پیش کیا جا رہا تھا۔ اسے سارے کے سارے مکالمے ازبر ہو گئے تھے۔ ایک دن وہ ناٹک دیکھ رہی تھی۔ کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالمے دہرائی جا رہی تھی۔ آخری سین چل رہا تھا:

راجا نل: رانی، دیکھو! دیوتاؤں نے کس نسٹھرتا سے سبھوں کا وَدھ کیا ہے۔

دمینتی: سبھوں کو مار ڈالا ہے! (روتے ہوئے) تو پھر ہمیں کیوں چھوڑ دیا ہے؟

راجا نل: وہ اس لیے کہ وہ ہمیں یہ جتلا سکیں کہ وہ کتنے بلوان ہیں!!

دمینتی: ہم نے دیوتاؤں کا کیا بگاڑا تھا، جو انھوں نے اتنا کٹھور رنے لیا۔ ہمارے ساتھ ایسا وَیوہار کیا؟

راجا نل: تم نے جوان کا پریم نویدن ٹھکرا دیا۔ اسی لیے وہ اتنے کرودھت ہو گئے!

اور اس کے بعد ہیروئن اپنا ڈائلاگ کہنے کو مڑی ہی تھی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ دھڑام سے فرش پر گر گئی۔ پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔ ہیرو راجا نل کا ڈایلاگ دہرا رہا تھا۔ اشاروں سے ہیروئن کو کھڑے ہونے اور اپنا کردار نبھانے پر آمادہ کر رہا تھا۔ لیکن ہیروئن درد سے کراہنے لگی تھی۔ درشکوں کو بھلا اس کے کراہنے سے کیا سروکار تھا؟ وہ تو ناٹک دیکھنے آئے تھے۔ جب انھوں نے یہ ماجرا دیکھا تو گالیوں کی بوچھاڑ باندھ دی۔ اسٹیج پر جوتے چپل پھینکنے لگے۔ افراتفری کا ماحول بن گیا۔ جاترا والے پریشان ہو گئے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے ہی والے تھے کہ یکا یک درشکوں کے بیچ سے رامنی دمینتی کے لہجے میں ایک آواز بھری، ''وہ سب کے سب مجھ سے بیاہ رچانا چاہتے تھے۔ میں کسے چھوڑتی اور کسے چنتی!! میرے پریتم، کہیں آپ مجھ سے بیاہ رچا کر پچھتا تو نہیں رہے ہیں!!''

درشک بھونچکا رہ گئے۔ شور وغل تھم گیا۔ کلاکاروں کو سانپ سونگھ گیا۔ ہیرو حیرت زدہ بت بنا کھڑا رہا۔ مرگ نینی نے اسے جھنجھوڑا، ''پریتم، کہیں آپ پچھتا تو نہیں رہے ہیں!!''

ہیرو نے خود کو سنبھالا۔ موقع کی نزاکت بھانپ کر اپنا رول ادا کرنے لگا۔ اس نے مرگ نینی کی اشارتاً دل جوئی کی اور اسٹیج پر ڈٹے رہنے کو کہا۔

راجا نل: نہیں پریے، کدا پی نہیں! میں تو تمہیں پا کر آنند مئے ہو گیا ہوں، پرنتو دمینتی، یہ تو بتاؤ، تم نے مجھے ہی کیوں چنا؟

مرگ نینی رو دمینتی: اس لیے کہ آپ منش ہیں! اور منش مجھے دیوتاؤں سے زیادہ پریے ہیں!!

اور پھر رانی دمینتی خوشی کے گیت گانے لگی۔ مورنی کی طرح ناچنے لگی۔ راجا نل کی بانہوں میں لہرانے لگی۔ گھڑی بھر کے لیے دیوتاؤں کے ذریعہ ڈھائے گئے قہر کو بھی بھول گئی۔ اور جب ناٹک ختم ہوا تو تالیوں کی گڑگڑاہٹ، 'واہ واہ' کی آواز اور سیٹیوں کے شور سے پورا شامیانہ گونج اٹھا۔ دل کے سبھی لوگ مرگ نینی کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

www.taemeernews.com

اور دوسرے دن علی الصباح مرگ نینی کمر سے گگری نکائے، گاتی اور چھم چھم کرتی ہوئی جب پنگھٹ کو چلی جارہی تھی، تو کسی نے پیچھے سے آواز دی، ''سنیئے!''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ جاترا کا ہیرو سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت سے بول اٹھی، ''ارے، ہیرو جی، آپ، یہاں!!''

ہیرو نے کہا، ''آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔ آپ تو کمال کی اداکاری کرتی ہیں!! کل آپ نے ہمارے جاترا دل کی عزت رکھ لی۔ ورنہ درشک اتنے بگڑ گئے تھے کہ پنڈال ہی جلا دیتے۔ ہمارا بڑا نقصان ہو جاتا۔'' اور پھر ہنستے ہوئے بولا، ''مار پڑتی، سوالگ!!''

اس نے ادب سے کہا، ''بابو جی، آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ بھگوان کے لیے مجھے 'آپ' نہ کہیں!! مجھے پاپ لگے گا۔ میرا نام مرگ نینی ہے!!''

''مرگ نینی! یعنی ہرنی جیسی آنکھوں والی! واقعی، واقعی تمہاری آنکھیں بڑی خوب صورت ہیں۔ تمہاری آواز، تمہاری لے، تمھارا رقص، تمہاری اداکاری، سب بے مثال ہیں۔ اگر تم شہر میں ہوتی تو فلم والے تمہارے گھر کا چکر لگاتے نہیں تھکتے، تم بہت بڑی اسٹار ہوتی۔''

مرگ نینی ہیرو کو بہت غور سے دیکھتی رہی۔ نظروں کے تیر اس کے دل میں پیوست کرتی رہی۔ وہ، بھی اس کا شکار بنتا گیا۔ کچھ دیر تک دونوں کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ اور جبھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا مرگ نینی کا آنچل اڑا لے گیا۔ اس کا گندمی شباب پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔

اس کے بعد ناٹک کار نے ڈائری سے نگاہیں ہٹائیں۔ چھوٹے بڑے سبھی کرداروں کے چہروں کا باری باری جائزہ لیا۔ سب کے سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ ابھینیتری کی بے قراری اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ناٹک کار بول پڑا، ''بتاؤ، کیسی لگ رہی ہے یہ کہانی؟''

سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا، ''بہت اچھی، بہت عمدہ!!''

ناٹک کار نے کہا، ''تو آگے سنو! لیکن بیچ میں کوئی کچھ نہیں بولنا، نہ ہی کچھ پوچھنا۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ابھرے تو مجھ سے اکیلے میں پوچھ سکتا ہے۔'' اور اس تنبیہ کے بعد ناٹک کار نے کہانی کا سلسلہ آگے بڑھایا:

اور ایک دن مرگ نینی ہیرو کے ساتھ بھاگ گئی۔ جب وہ بھاگ رہی تھی تو بار بار گاؤں کی اور مڑ مڑ کر دیکھتی اور سسکیاں بھرتی جارہی تھی۔ ہیرو اسے دلاسہ دے رہا تھا۔ اسے اسکے مستقبل کی خوش آئند جھلکیاں دکھا رہا تھا کہ اچانک اسکی نگاہ مرگ نینی کی گدرائی ہوئی چھاتی پر جا ٹکی۔ چھاتی چڑھی ہوئی تھی۔

www.taemeernews.com

ہیرو تجربہ کار تھا، فوراً تاڑ گیا!!

اور رفتہ رفتہ مرگ نینی کی قربانی رنگ لانے لگی۔ اس میں اسکی محنت، ریاضت اور فن کے تئیں اس کی رغبت بھی شامل تھی۔ ہیرو بھی ہر موڑ پر اس کا بھرپور تعاون کرتا رہا۔ اس کے فن کو نکھارتا رہا۔ اسے کامیابی کے زینے چڑھنے میں ہر ممکن مدد کرتا رہا۔ بیس سال گزر گئے۔ اب وہ ایک منجھی ہوئی اداکارہ بن چکی تھی۔ فلمی دنیا ہو یا ناٹک منڈلی ہر جگہ اس کا شہرہ تھا۔

اتنا کہہ کر ناٹک کار پھر ٹھہر گیا۔ سامنے میز پر سے گلاس اٹھایا، اور غٹا غٹ کئی گھونٹ پانی پی کر رکھ دیا۔ ایک نظر پھر سب کے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ اٹھتری ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نوجوان اس کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر مسرور رہا تھا۔ آنکھوں اور ہونٹوں کے اشاروں سے پیغام عشق دے رہا تھا۔ وہ بھی جواباً موقع بہ موقع نینوں کے بان مار رہی تھی۔ ناٹک کار ان کی حرکتوں سے بے خبر نہ تھا۔ وہ تو بس ضبط کر رہا تھا۔ کسی طرح اپنی کہانی مکمل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان کی حرکتوں کو نظر انداز کر کے کہانی کا باقی حصہ سنانے لگا:

اور ایک روز ان کی جاترا پارٹی دور، ندی کے پار، پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک قصبے میں خیمہ زن ہوئی۔ اس دوران جاترا میں بہت ساری ریلیاں آ چکی تھیں۔ دیومالائی اثرات کم ہو گئے تھے۔ ہر طرح کے قصے پیش کئے جانے لگے تھے۔ اس وقت جاترا پارٹی شکسپیئر ڈراما، رومیو اینڈ جولیٹ پیش کرنے آئی تھی۔ ہیرو بوڑھا ہو چکا تھا۔ اداکاری چھوڑ کر ہدایت کار بن گیا تھا۔ کبھی کبھار پروڈیوسروں کی درخواست پر کہانی اور اسکرپٹ بھی لکھ دیتا تھا۔ اس لئے اب سے اسے ہیرو کے بجائے ناٹک کار کے نام سے پکاریں گے۔ غرض یہ کہ ہیرو بدل چکا تھا۔ مرگ نینی ہی ہیروئین تھی۔ وہ جولیٹ کا رول ادا کرنے آئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر اداکار رومیو کا کردار نبھا رہا تھا۔ ناٹک پورے شباب پر تھا:

جولیٹ: رومیو! تم نے رومیو بن کر کیوں جنم لیا؟ تم دشمنوں کے خاندان میں پیدا کیوں ہوئے؟ دیکھو، ہماری محبت کے درمیان تمہارا نام آڑے آ رہا ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے؟ What's in name? تم اپنا نام بدل ڈالو! گلاب کو چاہے جس نام سے پکارو، گلاب گلاب ہی رہتا ہے۔ اس کی خوشبو نہیں بدلتی!!

رومیو: (پردے کے پیچھے سے) تمہاری باتیں سر آنکھوں پر۔ تم مجھے جس نام سے پکارو گی، آج سے وہی میرا نام ہوگا۔ بس تم پیار سے ایک بار مجھے پکار لو۔ میں دوڑا چلا آؤں گا۔ اب میں رومیو نہیں رہا۔ تمہارا پیار بن چکا ہوں۔

جولیٹ: (حیرت سے) کون ہے وہاں جو اس طرح چھپ چھپ کر میرے دل کی باتیں سن

www.taemeernews.com

رہا ہے؟ کون ہے؟

اس کے بعد رومیو کو اسٹیج پر آ جانا چاہئے تھا، لیکن وہ نہیں آ رہا تھا۔ مرگ نینی بار بار اس امید میں اپنا ڈائلاک دہرا رہی تھی کہ شاید ہیرو اسٹیج پر چلا آئے، مگر وہ آتا کیسے؟ اس نے بے تحاشہ پی رکھی تھی۔ اس میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ گرین روم سے نکل کر اسٹیج پر آ سکے۔ درشکوں نے واویلا مچایا۔ اسٹیج پر اینٹ پتھر، جوتے چپل کی برسات شروع کر دی۔

مرگ نینی گھبرا گئی۔ ناٹک کار نے چاہا کہ وہ خود ہی رومیو بن کر اسٹیج پر چلا جائے۔ لیکن اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ خود کو رمیو کے رول مین نہیں کھپا پائے گا۔ وہ پس وپیش میں تھا کہ اچانک درشکوں کے درمیان سے ایک آواز ابھری۔ بانکا سجیلا ایک نوجوان مکالمہ کہتا ہوا اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا، ''مجھے خود کی خبر نہیں! میں کون ہوں، مجھے پتا نہیں!! اگر میرا نام رومیو ہے اور یہ نام تمہیں پسند نہیں، تو نفرت ہے مجھے بھی اس نام سے۔ میں اس نام کو اپنے پیار کے بیچ حائل ہونے نہیں دوں گا۔''

مرگ نینی حیرت مین پڑ گئی۔ اس کے ذہن کے پردے پر ایک پرانی تصویر ابھرنے لگی۔ لیکن اس نے ایکٹنگ نہیں روکی۔ اپنا ڈائلاگ جاری رکھا:

مرگ نینی: (پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے) رومیو! میرے رومیو!! تم نے اتنا خطرہ کیوں مول لیا؟ اگر کسی نے یہاں دیکھ لیا تو تمہیں قتل کر دے گا۔

رومیو/نوجوان: تمہاری نظروں کے تیر تلواروں سے کہیں زیادہ تیز ہیں! جو تمہاری نظروں سے گھائل ہو گیا ہو، اسے بھلا تلواروں کی کیا پرواہ!!

جولیٹ: تمہیں یہاں کس نے بلایا؟

رومیو/نوجوان: محبت نے!

اور جب ناٹک ختم ہو گیا تو سبھوں نے اس نوجوان کو بدھائی دی۔ جاترا والوں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مرگ نینی چھوٹے چھوٹے فن کاروں کو کبھی منہ نہ لگاتی تھی۔ لیکن آج وہ اس نوجوان کے آگے جیسے خود سپردگی کر رہی تھی۔ اسے اسکی اداکاری، اس کا انداز، اس کا بانک پن، اس کی جواں مردی اور وضع قطع ایسی بھا گئی تھی کہ وہ اسے نینوں کے رستے اپنے من میں اتارتی چلی گئی۔ نوجوان بھی اس کی آنکھوں میں اپنا مستقبل تلاش کرنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں رومیو جولیٹ کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے باغ باغیچوں، ہاٹ بازاروں، کھلیانوں میں پھرنے لگے۔

اور ایک دن جب دونوں نے حد سے تجاوز کرنا چاہا۔ لذتِ نفس کے اسیر ہو کر ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آ گئے، ناٹک کا ولین بن کر بیچ میں کود پڑا۔ دونوں چونک کر الگ ہو گئے۔ سر

www.taemeernews.com

جھکائے کھڑے رہے۔ ناٹک کار نے نوجوان کو ڈانٹ پلائی، ''خبردار جو اسکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو !وہ حشر کروں گا کہ پاگلوں کی طرح اپنی آنکھیں نوچتا پھرے گا! جاؤ دفع ہو یہاں سے !!'' نوجوان نظریں نیچی کیے سرسراتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے مرگ نینی کو پھٹکار لگائی، ''تجھے لاج نہیں آتی۔ کم سے کم اپنی عمر ہی کا لحاظ کر!''

وہ اندر ہی اندر سلگنے لگی، پر خاموش رہی!!

اور ابھنیتری نے مداخلت کی، '' آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس روز میں اندر ہی اندر سلگنے .....'' ناٹک کار نے منھ پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ تنبیہ کی، ''میں نے منع کیا ہے نا! کوئی سوال نہیں کرے گا!! کسی کو کچھ پوچھنا ہو تو مجھ سے اکیلے میں پوچھے!!''

ابھنیتری 'ساری' کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اور ناٹک کار نے کہانی آگے بڑھائی:

اور جب جاترا پارٹی کلکتہ واپس آئی، نوجوان بھی ساتھ چلا آیا۔ مرگ نینی کے کہنے پر ناٹکوں اور ٹیلی ویژن سیریلوں میں اسے چھوٹے موٹے رول ملنے لگے۔ بطور ہیرو بڑے پردے پر آنے کی اب تک کوئی صورت پیدا نہیں ہو پائی تھی۔ لیکن مرگ نینی اسے پردۂ سیمیں پر لانا چاہتی تھی۔ اسے ہیرو بنانا چاہتی تھی۔ اور اس کے لیے اسے کسی اچھے ناٹک میں ہیرو کا رول نبھانا ناگزیر تھا۔ ایسا رول جس سے عوام کے دل و دماغ پر گہری چھاپ پڑے اور وہ اسے اپنا رول ماڈل بنالے۔ اور اس کے لیے کسی بڑے پروڈیوسر یا ڈائرکٹر کی سرپرستی لازمی تھی۔ اچھی کہانی، اچھے گیت اور اچھی ہیروئن بھی درکار تھی۔ ویسے وہ خود ہی اس کے ساتھ بطور ہیروئن کام کرنے کو تیار تھی۔ لہٰذا وہ ناٹک کار کو آمادہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے اپنے کسی ناٹک میں موقع دے۔ ویسے ناٹک کار بھی نوجوان کے فن کا معترف تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان کے چہرے سے حیرت اور امنگ کے ملے جلے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ ناٹک کار زیرِ لب مسکرایا اور کہانی سناتا گیا:

اور ایک دن پھر اس نے دونوں کو ایسے حال میں دیکھ لیا کہ اسکی آنکھیں شرم سے فرش پر گڑ گئیں!! اگر وہ عین وقت پر وہاں نہ آتا تو انرتھ ہو جاتا۔ وہ دونوں لذتِ نفس کے اسیر ہو کر ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آگئے تھے۔ باہوں میں جکڑ کر، لب سے لب سٹائے ایک دوسرے کو بھینچ رہے تھے۔ لباس کی بندشوں سے آزاد ہو کر صوفے پر دراز ہونے لگے تھے۔ اور جبھی ناٹک کار یمدوت کی طرح نازل ہوگیا۔ چیخ کر دھتکارنے لگا، ''لعنت ہے تم لوگوں پر!!''

اس کے بعد ناٹک کار یکایک رک گیا۔ چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور اپنی ڈائری بند کر کے کہا ''بس یہیں تک!!''

تمام کردار تجسس میں پڑ گئے۔ یک زبان ہو کر بولے، پھر کیا ہوا!!''

www.taemeernews.com

ناٹک کار نے کہا،''میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے، یہاں کوئی سوال نہیں کرے گا۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہو تو اکیلے میں ملے''

سب خاموش ہو گئے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ناٹک کار کی باتوں پر چوں چرا کرے۔ سب اٹھ کر چلے گئے۔ اور دوسرے دن سے ریہرسل شروع ہو گیا۔

ابھنیتری کو کہاں چین تھا؟ اسکا تجسس بڑھتا گیا۔ نوجوان کی بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ دونوں کہانی کا انجام جاننے کو بیتاب تھے۔ مگر انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ناٹک کار انہیں کچھ نہیں بتائے گا۔ چنانچہ ایک دن دونوں چپکے سے ناٹک کار کے کمرے میں داخل ہوئے، میز کے قریب گئے اور دائری کا پنا الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دونوں دنگ رہ گئے!! باقی کا پنا دودھ کی طرح سفید تھا!!!

اور ناٹک شروع ہو گیا۔ ناظرین کثیر تعداد میں امنڈ پڑے۔ تمام اداکار اپنے اپنے اداکاری کے جوہر دکھانے لگے۔ اپنے اپنے کرداروں میں یوں داخل ہو گئے جیسے انکی اپنی کوئی پہچان ہی نہ ہو۔ اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

ناٹک کار نے واقعات وحادثات، کردار و مکالمہ، تصادم وآویزش کو رنگ، روشنی، پوشاک اور پس منظر سے اسطرح مربوط کر دیا کہ ناظرین بھی خود کو اس ناٹک کا حصہ سمجھنے لگے۔ اب ناٹک آخری مرحلے میں تھا۔ ناظرین پہلو دابے، اسٹیج پر نظریں ٹکائے بیٹھے تھے۔ اسٹیج پر آنے سے پہلے ابھنیتری نے ناٹک کار سے کہا،''اب تو کلائمکس سین ہے۔ اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا، آپ نے تو ابھی تک بتایا ہی نہیں۔'' پیچھے نوجوان نے بھی یہی سوال دہرایا۔

ناٹک کار نے ابھنتری سے کہا،''میں نے یہ ناٹک تیرے فن کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے لکھا ہے۔ کیا اور کیسے کرنا ہے، اس کا فیصلہ اب تجھے کرنا ہوگا۔ وہ بھی بروقت! برجستہ!! آج تیرا امتحان ہے۔ اگر تو اس امتحان میں کامیاب ہوگئی تو تیرا یہ کردار لافانی ہو جائے گا۔ اور تو فن کی دنیا میں امر ہو جائے گی۔'' اور پھر اس نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا،''اور تیرے لیے بھی یہ ناٹک کم اہم نہیں ہے۔ یہ تیرے کیریر کی اڑان کے لیے ضروری ہے۔'' اور پھر دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا،''اب اس ناٹک کے کردار بھی تم ہو، مکالمہ نگار بھی تم، واقعہ نگار اور کشمکش کا نقطہ بھی تم ہو! کوئی بندش نہیں!! کوئی پابندی نہیں!!! تمہارا مستقبل تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ جاؤ، گھنٹی بج رہی ہے۔ درشک بے قرار ہیں، تمہارے فن کا بہترین نمو نہ دیکھنے کو!!''

اور پھر ناٹک کا آخری سین شروع ہوا:

جدید طرز کے ہاؤسنگ اپارٹمنٹ کے فلیٹ کا ایک ڈرائنگ روم۔ بیچ میں صوفہ سیٹ۔ سامنے سنٹرل ٹیبل پر شراب کی بوتل اور گلاس۔ پاس ہی میز پر قلم دان میں پیتل کے دو موٹے موٹے

www.taemeernews.com

نوکیلے اور چمکدار قلم ہیں۔ سامنے ڈائنگ ٹیبل پر پھل کی ٹوکری میں لمبی سی ایک چمکیلی چھری سیدھی کھڑی ہے۔ مرگ نینی ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس اور اور دوسرے میں سلگتا ہوا سگریٹ لئے صوفے پہ بیٹھی ٹی.وی. پر شہوت انگیز منظر دیکھ رہی تھی۔ حصولِ لذت کو دوبالا کرنے کے شوق میں رہ رہ کر سگریٹ کا کش لیتی اور شراب کے گھونٹ لیتی جا رہی ہے۔ نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے خمار آلودہ نگاہوں سے نوجوان کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ نوجوان کی سانسیں پھولنے لگیں۔

نوجوان: (کن انکھیوں سے ٹی.وی. پر شہوانی منظر دیکھتے ہوئے) تم نے مجھے بلایا؟ کیا کوئی پروڈیوسر راضی ہو گیا ہے، مجھے ہیرو بنانے کے لیے؟

مرگ نینی: ہوں گے! سب راضی ہو جائیں گے!! تم من چھوٹا کیوں کرتے ہو میں ہوں نا! جب میرے دل کے ہیرو بن گئے ہو، تو بہت جلد دنیا والے بھی تمہیں ہیرو تسلیم کر لیں گے۔ (شراب کا ایک گھونٹ لے کر) دیکھنا، ایک دن تم سپر اسٹار بنو گے! ہر آدمی کی زبان پر تمہارا نام ہوگا!! بس تمہارا نام!!

نوجوان: سچ! میں سپر اسٹار بن جاؤں گا!! (اس کی نگاہیں مرگ نینی کے پستانوں کے شگاف میں اٹکنے لگیں!!)

مرگ نینی: ہاں تم بہت جلد کامیابی کے آسمان چھونے لگو گے! آؤ میرے ساتھ اپنے خوش آئند مستقبل کا جشن مناؤ۔ لو! پیو!!

اور اس نے شراب انڈیل کر گلاس نوجوان کی طرف بڑھایا۔ رفتہ رفتہ نوجوان کے اندر بھی نفسِ امارہ کا زور بڑھنے لگا۔

نوجوان: ایسا ہے تو لاؤ۔ (اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے، اپنی بانہیں مرگ نینی کی طرف پھیلا دیں۔)

مرگ نینی: (صوفے سے اٹھ کر اسکی بانہوں میں سماتے ہوئے) او میرے ہیرو، تم نے تو مجھ پر جادو کر ڈالا ہے! اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔

اور وہ دونوں خواہشات کی تیز رو میں بہنے لگے۔ ایک دوسرے کو بانہوں میں جکڑ لیا۔ لب سے لب جوڑ کر ایک دوسرے کو بھینچنے لگے۔ لباس کی بندشوں سے آزاد ہو کر صوفے پر دراز ہونے لگے۔ اور جبھی ناٹک کار یمدوت کی طرح اچانک نازل ہو گیا۔ چیخ کر دھتکارا، ''لعنت ہے تم لوگوں پر!!''

لیکن وہ چونکے نہیں! نہ ہی ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔ انھوں نے شرم سے سر بھی نہیں جھکایا۔

ناٹک کار: (نوجوان سے) خبردار پھر کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو! وہ حشر کروں گا کہ پاگلوں کی طرح اپنی آنکھیں نوچتا پھرے گا۔ دفع ہو! دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے! (اور پھر مرگ نینی سے

www.taemeernews.com

) تجھے لاج نہیں آتی۔ کم سے کم اپنی عمر ہی کا لحاظ کر!!

مگر ناٹک کار تعجب میں پڑ گیا۔ نوجوان وہاں سے ٹلا نہیں۔ الٹے اسے غضب ناک نگاہوں سے گھورنے لگا۔ مرگ نینی بھی ناگن کی طرح پھنکارنے لگی۔

مرگ نینی: تم حاسد ہو، تم سے ہماری خوشیاں دیکھی نہیں جاتیں!! اور تم بار بار مجھے میری عمر کا احساس کیوں دلاتے ہو۔ ہاں یہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے۔ بہت چھوٹا ہے۔ لیکن میں اس سے پیار کرتی ہوں اور یہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ پیار میں عمر نہیں دیکھی جاتی، دل دیکھے جاتے ہیں۔ اور ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو!! کون سے تم بھی دودھ کے دھلے ہوئے ہو!! جاؤ اپنا کام کرو!!!

یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر نوجوان کی طرف بانہیں پسار دیں۔ نوجوان بھی بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔

اور تب ناٹک کار مسکرایا۔ اپنے بازوؤں کو موڑ کر ہتھیلیوں سے پکڑتے ہوئے بولا۔

ناٹک کار: تو سن! (چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے) مرگ نینی یاد کر جب تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہی تھی، تو اپنے گاؤں کو مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں تجھے دلاسہ دے رہا تھا۔ تجھے تیرے مستقبل کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ یاد آیا!! اس وقت میری نگاہ تیری گدرائی ہوئی چھاتی پر جا ٹکی تھی۔ میں نے دیکھا، تیری چھاتی چڑھی ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کیا ماجرا ہے!!

مرگ نینی: (بپھرتے ہوئے) کیا ماجرا تھا؟ میں ایک سال کے بچے کو چھوڑ کر تیرے ساتھ بھاگ آئی تھی، یہی نا!!

ناٹک کار: ہاں، تجھے تو سب یاد ہے!! مگر تو کیا جانتی ہے، تیرا وہ ایک سال کا بچہ (تھوڑے توقف کے بعد) کہاں ہے؟

مرگ نینی: (بیتابی سے) کیا وہ زندہ ہے؟ میرا بیٹا زندہ ہے!! کہاں ہے وہ؟ تم جانتے ہو وہ کہاں ہے؟

ناٹک کار: ہاں، (اتراتے ہوئے) میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تیرا بیٹا کہاں ہے!!

مرگ نینی: (بے صبری سے) کہاں ہے؟ بتاؤ نا، کہاں ہے میرا بیٹا؟

ناٹک کار: (سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے نوجوان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہے!!

اور اس کے ساتھ ہی بجلی کے ایک کڑکے سے ناظرین کے دل ہل گئے۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ نوجوان کے قدم پیچھے ہٹتے گئے۔ لال، پیلی، نیلی، ہری روشنی کبھی اس کے ہراسان چہرے پر اور نوکیلے چمکدار قلم پر، کبھی مرگ نینی کے بے رنگ چہرے پر، اور کبھی ٹوکری میں رکھی ہوئی چمکتی دمکتی چھری پر منعکس ہونے لگی!! ناٹک کار مسکراتا ہوا ان چاروں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ کہانی جذبات کے سب سے شدید مقام پر پہنچ چکی تھی۔ ہال میں سکتہ کا عالم تھا۔ ناظرین دم بخود رہ گئے تھے۔ ان کا تجسس نقطۂ عروج کو

www.taemeernews.com

پہنچ چکا تھا۔'اب کیا ہوگا؟' یہ سوال ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔اور اچانک مرگ نینی زور زور سے قہقہہ لگانے لگی۔قہقہے کی آواز کچھ دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ناٹک کار کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے کافور ہوتی گئی۔وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا،سوچنے لگا،شائد اس سچائی کی تاب نہ لا کر وہ پاگل ہوگئی ہے۔ نوجوان بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اور تب مرگ نینی چٹکی بھرتے ہوئے بولی،''خوب کہانی گڑھی ہے۔تو نے!!....ہماری محبت کا خون کرنے کا اچھا حربہ اپنایا ہے!!....تو حاسد ہے،خود غرض ہے!مکار ہے!!تو مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہا ہے میں تیری جنسی ہوس کو راحت پہونچاتی رہی۔تو جھوٹا ہے۔دغاباز ہے!!اب مین تیرے جال میں نہیں پھنسنے والی!!تیرے فریب میں نہیں آنے والی!!(پھر نوجوان کی طرف بانہیں پھیلاتے ہوئے) اس شیطان کی باتوں پر مت جا میرے گلے سے لگ جا۔برسوں کی پیاس بجھادے!!!''

نوجوان گم صم کھڑا رہا!حواس باختہ کبھی ناٹک کار کا اور کبھی مرگ نینی کا چہرہ دیکھتا رہا۔تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔پھر آہستہ آہستہ ناٹک کار کی طرف بڑھا اور اسے گھورتے ہوئے کہا''ناٹک کار،تیری یہ کہانی بڑی پرانی ہے!ہزاروں برس پہلے سفوکلس نے بھی ایسی ہی ایک کہانی گڑھی تھی!اور دنیا کا عظیم ترین ناٹک کار بن گیا تھا!!لیکن مجھے ایڈی پس بننے کا کوئی شوق نہیں!!میں ایڈی پس نہیں بن سکتا!!!ہاہاہا....''

وہ قہقہہ لگاتا ہوا مرگ نینی کی طرف لپکا اور اس کی چھاتی سے چپک گیا!!!اور پھر....

ناٹک کار: (سامنے آکر ناظرین کو دیکھتے ہوئے) آہ!یہ کیسا المیہ ہے! زندگی مجھے کس موڑ پر لے آئی ہے!!(ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے) اے،بشوریہ،یہ کیسا انرتھ ہے!کیسا انرتھ ہو رہا ہے!!کیسا انرتھ ہے یہ....!!!

اس کے بعد ناٹک کار سینہ کوبی کرتے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔چلا چلا کر رونے لگا۔اور تبھی ایک شور اٹھا،''ناٹک کار ہٹ جا سامنے سے!ابے،ہٹتا کیوں نہیں؟ہٹ سامنے سے!!دیکھنے دے ہمیں دیکھنے دے!!!''

ناٹک کار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔چہرے پر رنگ برنگی کرنیں ناچنے لگیں۔پیشانی پر جمی پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔وہ دیوانہ وار کپڑے پھاڑتا ہوا ڈائنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔پھل کی ٹوکری میں رکھی ہوئی چمکتی دمکتی چھری کے دستے پر گرفت مضبوط کی۔تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔پھر چھری چھوڑ کر میز کے پاس آیا۔نوکیلے قلم کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔اور پھر ایک دم سے دونوں قلموں کو مٹھیوں میں دبوچ کر زوردار چیخ ماری،''سفوکلس!!اب تیری یہی سزا ہے!!!''

اور تبھی سے ایک چاک دامن بوڑھا اس شہر میں خون کے آنسو رو رہا ہے!!!

●●

www.taemeernews.com

تامل کہانی

●چنئی کے نزدیک واقع اتھیرا میرور کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھانے والی باما کی نگارشات تامل دلت ادب کی ایک منفرد آواز مانی جاتی ہیں۔ ان کے دو ناول "سنگتی" (۲۰۰۵) اور ورنم (۲۰۰) ناقدین اور قارئین میں دلت ادب کے نہایت اہم ناول کے طور پر بہت سرا ہے گئے۔ ۲۰۰۱ء میں ان کی بچپن کی یادیں (کارکو) کو کراس ورڈ پرائز بھی دیا گیا ہے۔ بلقیس

پنّو تھیئی

افسانہ نگار: باما

ترجمہ: بلقیس ظفیر الحسن

● سیاہ سے بھی زیادہ سیاہ فام پنوتھئی شادی کے آٹھ برسوں کے اندر یکے بعد دیگرے چار بچوں کو جنم دینے کے باوجود ہٹی کٹی جاذب نظر عورت ہے اس کے بچے اس سے بھی زیادہ کالے نکلے۔ اتنے، کہ کوئی چاہے تو ان کی جلد رگڑ کے ماتھے پر بندی لگالے۔ گلیوں میں دوڑتے پھرتے انہیں دیکھو تو لگتا ہے جیسے کوے اڑ رہے ہوں۔ پنوتھی کا ڈیل ڈول بھی اتنا بھاری ہے کہ تیز تیز چلنے لگے تو زمین کانپ جاتی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ آس پاس کی عورتیں ناک چڑھا کے بڑبڑانے لگتی ہیں۔ دیکھو تو۔ کیسے چل رہی ہے! مردوں کی طرح!۔ عورتوں والی کوئی بات ہے کیا؟

ہے ہی نہیں۔ صرف چال ڈھال ہی نہیں اس کی آواز سن کے بھی کانوں میں انگلی دینے لگتی ہیں۔ آواز ہے بھی تو ایسی۔ پنوتھئی کا گلا تو جیسے تانبے میں ڈھلا ہوا ہے۔ تیز کھنک کے ساتھ لفظ نکل کے سامنے والے پر سیدھی چوٹ کرنے والے! گلی کے اس سرے پر بولے تو دوسرے سرے تک آواز پہنچ جاتی ہے— کھری کھری سنانے والی پنوتھئی کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کا تو نام ہی رکھ دیا ہے لوگوں نے۔ لمبی زبان— کوئی کوئی بڑبولی بھی کہتا ہے۔ یہی نہیں اس نے اپنے لئے جو ذریعۂ معاش چنا ہے اس پر بھی لوگوں کو سخت اعتراض ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح کھیتوں پر کام کرنے کیوں نہیں جاتی؟ سر پر ٹوکرا دھرے آوارہ گردی کرتی پھرتی ہے۔ عورتیں منہ ٹیڑھا کر کے کہتی رہتی ہیں۔

پنوتھئی پڑھی لکھی نہیں ہے مگر ہے ارادے کی بڑی پکی!

کوئی کیا کہتا ہے، اس کی اسے ذرہ بھر پرواہ نہیں۔ صبح اٹھتے ہی نزدیکی شہر جانے والی بس پکڑتی

www.taemeernews.com

ہے۔اور وہاں سے سبزیاں، پھل، اور دیگر سامان لاکر دروازے دروازے اپنی آواز کے ساتھ پہنچ جاتی ہے۔

ایک دن ناریل سے بھری ٹوکری سر پر اٹھائے ناریل، ناریل لے لو..... دس روپئے میں تین.....'' آواز نکالتی پھر رہی تھی تو ایک عورت نے کہہ دیا ناریل جہاں توڑے جاتے ہیں وہاں دو روپے میں ایک مل جاتا ہے۔کیسی نفع خور عورت ہے! پھر کیا تھا۔ پنوتھئی وہیں کی وہیں کھڑی ہوگئی۔

سن لو۔ میں لڑنے بھڑنے والی عورت نہیں ہوں۔مگر کوئی اکسادے تو پیچھے نہیں ہٹنے والی۔ ٹھیک لگے تو خرید بک بک کیوں کررہی ہے؟ یہ میرا بزنس ہے! تجھے کیا پتا۔ بزنس کیا ہوتا ہے! اتنا کہہ ٹوکرا اٹھا کے آگے بڑھی تو مگر با آواز بلند بولتے ہوئے۔ان کا کلیجہ کیوں جلتا ہے؟ حرام زادیاں ہیں سب کی سب۔ رانڈیں! کہے دیتی ہوں، یاد رکھو۔ یہ جو تمہارے دانتوں کے بیچ میں پڑی زبان ہے اسے سنبھالو۔نہیں تو کسی دن اسے کھینچ کے باہر نکالنا نہ پڑ جائے مجھے! مجھے ایسا ویسا سمجھ رکھا ہے۔اس کا ایسا بھینکر روپ دیکھنے کے بعد کس میں اتنا بوتا تھا جو کچھ اور بولے۔ہاں پیٹھ پیچھے عورتیں جو منہ میں آتا کہتی رہتی۔ بزنس کرتی ہے!۔ بڑی اونچی ذات والی ہے نا! کھیتوں پر کام کرنے سے چھوٹی ہو جائیگی۔ کیسی دیدہ دلیر عورت ہے!۔مگر یہ باتیں پنوتھئی کے پچھمی دروازے سے پوربی دروازے جا کے لوٹ آنے تک ہی چلتی تھیں۔

اسے واپس آتے دیکھا نہیں کہ سب کی بولتی بند ہو جاتی۔ایک دن اپنے دروازے پر کھڑی پوتھئی زور زور سے پھنکار رہی تھی۔ میں جو چاہوں کروں۔ کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے؟ ہاں اپنے دانتوں کو برش کررہی تھی۔ یہ تانکا جھانکی کیا ہو رہی تھی؟ اپنے دانتوں کو اپنے برش سے اپنا ٹوتھ پیسٹ لگا کے گھس رہی تھی میں! تمہارا کلیجہ کیوں پھٹا جارہا ہے؟ ہاں میں اپنے دانت داتن سے نہیں برش سے صاف کرتی ہوں! تم بھی کرو۔تم چھنالو میری ٹوہ میں کیوں لگی رہی ہو بولو!

مگر کون بولے۔اس کی آواز سن کے سب کی سٹی پٹی گم ہو جاتی ہے۔ بک جھک کے جب اندر چلی گئی تو آکاشم پتی کاری کے بول پھوٹے۔ چھی۔کیسی لمبی زبان ہے۔ دانت انگلی سے نہیں برش سے صاف کرتی ہے! بڑی جاتی والی ہے نا! کیا عورت ہے! چپتی تو کوزو سے ہی ہے مگر جو نکلتا ہوگا ضرور رسم ہوتا ہوگا۔ مرچی والا رسم۔ شش..... چپ بھی رہو! یتھما نے جھٹ اس کی بات کاٹی۔ سن لے گی تو چیتھڑے اڑا دے گی تمہارے۔ معلوم ہے نا! کیا کیا اس نے اپنے جنموں کے بندھن سے بندھے مرد کے ساتھ؟ کیسا پٹوایا ہے اسے۔ پولیس چوکی میں بلا کے،

پولیس کیس کا یہ قصہ ان دنوں ہر ایک کی زبان پر ہے۔ پنوتھئی کو اپنے شوہر کو چھوڑ کر اپنی ماں کے یہاں آکر رہتے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔اپنا یہ بزنس والا کام اس نے یہاں آنے کے بعد

www.taemeernews.com

ہی شروع کیا۔ روز سویرے ہی سر پر ٹوکرا رکھ کر ماں کے گھر سے نکل جاتی ہے اور دن بھر اس میں رکھا سامان بیچ کر جو بھی ہاتھ آتا ہے اس سے گھر کے لئے کھانے پینے کا سامان لے کے واپس آتی ہے۔

شادی ہوئی تھی تو اس نے توقع کی تھی کہ دوسری عورتوں کی طرح اسے بھی اب عافیت والی خوشحال زندگی مل جائیگی مگر ایسا ہوا نہیں۔ اس کا شوہر موکانڈی، بڑی بڑی گھنی مونچھوں والا دبلا پتلا مرد تھا۔ مونچھوں کو خوب تاؤ دے کر ایسی نوکیلی بنائے رکھتا جیسے سانڈ کی سینگوں کی طرح جس تس پر ابھی کے ابھی حملہ کرنیوالی ہیں۔ ہفتے میں چار دن کام کرتا اور تین دن آرام۔ شام ہوتے ہی گھر سے باہر نکل جاتا اور ہوٹلوں میں جا کر اڈلی سانبھر، بڑے، دوسا، اور پتا نہیں الم غلم کیا کیا کھا کے رات گئے گھر آتا تھا۔ کسی دن ناغہ ہو جائے تو وہ ہائے توبہ مچاتا جیسے آج اس کے پیٹ میں کچھ پڑا ہی نہ ہو۔ جن دنوں کام پر نہیں جاتا اور پیسے نہیں ملتے تو پنوتھئی کی کمائی اینٹھ لیتا اس سے۔ ہر اتوار کو کری کے لئے گوشت اور مار پاتھیور کے کشید کردہ عرق کے لئے پنوتھئی کی جان متھ کے رکھ دیتا تھا۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے یہ برس تو پنوتھئی نے دانت بھینچ بھینچ کے کسی نہ کسی طرح نکال دیئے۔ اپنے اخراجات کے لئے اسے خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ مگر جب یکے بعد دیگرے چار بچے ہو گئے تو پیٹ بھرنا بھی مشکل ہونے لگا۔ جان توڑ محنت کرتی تھی۔ کھیتوں پر دن بھر کی مشقت کے بعد گھر آتی تو بے جان سی ہو کر پڑ جاتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ایک گائے خریدی کہ بچوں کو دودھ ملتا رہے۔ موکانڈی ایک دن اسے بھی بیچ آیا۔ اور سارے پیسے اپنے پاس رکھ لئے پھر تو گھمسان کا رن کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں تھا پنوتھئی کو ـــــ جم کے لڑائی ہوئی۔ اور انجام کار ماری کوٹی، ٹوٹی پھوٹی نیلی پڑی وہ موکانڈی کا گھر چھوڑ میکے چلی آئی۔ تب سے وہ یہاں رہ رہی ہے۔ اپنے ساتھ صرف دودھ پیتے بچے کو لائی تھی اسے بھی چار پانچ مہینے ہی اپنے ساتھ رکھا جیسے ہی کچھ کھانے پینے لگا اسے بھی اپنے شوہر کے گھر چھوڑ آئی۔

دیکھو! ایسی عورت دیکھی ہے کہیں؟ بچوں کی موہ ممتا نہیں ذرا بھی۔ عورتیں ایک دوسرے سے کہتے نہیں تھک رہی تھیں ایسی کوئی ماں ہوتی ہے!

لوگوں کی زبانیں چلتی رہیں اور پنوتھئی بھی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ بچے کیا صرف میرے ہیں؟ لوگوں کی یہ باتیں اس کے کان میں پڑتیں تو اپنے آپ سے کہنے لگتی کون اپنی خواہش سے پیدا کیا ہے میں نے انہیں۔ میں تو دو سے زیادہ چاہتی ہی نہیں تھی ـــــ موکانڈی کی مار سے بچنے کے لئے اور کیا کرتی۔ پیدا کر دیا انہیں پیٹ پیٹ کر یہ بچے جنوائے گئے مجھ سے۔ زبردستی:۔ ایک کے بعد ایک! اب پالے انہیں وہ خود!۔

اپنے آپ کو اس طرح سمجھا بجھا کر اپنے کام میں لگ جاتی۔ ادھر موکانڈی بچوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے عاجز ہو جاتا تھا۔ ایک پنوتھئی کے میکے آدھمکا۔ ای.....ی.....چل.....گھر چل!

www.taemeernews.com

کیوں چلوں؟ کوں ہوتا ہے تو میرا؟ تیرا میرا رشتہ ختم ہوئے دو سال ہو گئے۔ میں نہیں جانیوالی اب تیرے گھر! کبھی نہیں۔ سمجھا! تڑاخ سے جواب دے کر جانے کے لئے مڑی تو مگانڈی طیش سے چلانے لگا۔ اوندھی عقل والی عورت!۔ اپنے مرد سے یہ کہہ رہی ہے؟ کتیا۔ رانڈ..... دیکھو۔ دیکھو لوگو۔ دیکھو یہ کیسی عورت ہے! نہ گھر کی پرواہ ہے نہ اپنے بچوں کی ہتھیا تو دیکھو اس کا۔ مرد کے منہ آتی ہے چھنال!۔

میرا جو جی چاہے گا کروں گی۔ تو کون ہوتا ہے بولنے والا۔ بچے تیرے نہیں ہیں کیا؟ تو انہیں پیدا نہیں کر سکتا تھا میں نے کر دیا۔ اب تو پال انہیں! یہ تو تو کر ہی سکتا ہے۔ جواب دینے میں پنوتھئی کچھ کم نہیں بھاری پڑ رہی تھی۔ مکانڈی تو مارے غصے کے پاگل ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح چلانے لگا۔ رنڈی۔ چھنال کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔ شکل دیکھ اپنی۔ یہ تیری صورت، یہ تیرا ڈیل ڈول۔ کون بیاہ کرنے والا تھا تجھ سے۔ یہ تو میری عقل ماری گئی جو میں تجھے بیاہ لایا۔ لوگو! مجھ بے وقوف کو مارو۔ جوتوں سے پیٹو۔ کتنی بڑی غلطی کی میں نے۔

صرف جوتوں سے؟ جھاڑو سے بھی پیٹنا چاہئے مگر اس پر بھی عقل کہاں آنے والی ہے تجھے۔ نکما زمانے بھر کا!..... آخ تھو..... پنوتھئی نے منہ میں تھوک بھر کر جو پھنکا وہ سیدھا موکانڈی کے چہرے پر پڑ گیا۔ پھر کیا تھا۔ ہوش و حواس کھو کر موکانڈی اس کی طرف لپکا اور اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر پٹکنے لگا۔ اور پنوتھئی نے اس کا ہاتھ مروڑ کر خود کو چھڑانے کی کوشش میں خود کو ناکام ہوتے دیکھا اپنے تیز دانت اس کے ہاتھ میں گڑا دیئے..... درد سے تلملا کر موکانڈی نے جو لات ماری وہ زور سے پنوتھئی کے پیٹ پر پڑی اور وہ سیدھی لکڑی کے بھاری موسل پر جا گری۔ اس کا سر پھوٹ گیا۔ درد سے دہری ہوتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی تو خون کی دھاریں بہہ بہہ کر اس کے کپڑوں کو تر کر رہی تھیں۔ لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔ مگر نہ وہ چیخی نہ چلائی نہ ہی موکانڈی کو گالیاں دے رہی تھی بس ایک بار اسے دیکھا اور اندھا دھند کھیتوں کی طرف بھاگنے لگی۔

ای..... ای..... بی..... پکڑو آتے۔ تماش بینوں میں سے کوئی چلانے لگا۔ کھیتوں کی طرف جا رہی ہے..... جان دینے جا رہی ہے۔ کود پڑے گی کنویں میں۔ ''پکڑ'' دمرنے دو گدھیا کو۔ موکانڈی آگ بگولہ ہو کر چلایا۔ اسی قابل ہے۔ میرا کیا۔ میں دوسری لے آؤنگا۔ ہزار مل جائیں گی مجھے۔ فاتحانہ انداز میں سینہ پھلائے وہ وہیں کھڑا رہا تو پنوتھئی کی ماں اپنے بال نوچتی روتی چلاتی اسکے پیچھے دوڑ پڑیں اور اس کے ساتھ ہی وہاں کھڑے مرد عورتیں اور بچے بھی پورے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔

مگر پنوتھئی کنویں میں کودنے تھوڑا ہی بھاگی تھی وہ تو سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ اس کے سر سے بہتے لہو کی دھاروں اور اس کے اردگرد جمع جم غفیر کو دیکھتے ہی انسپکٹر نے اسے فوراً اندر لے

www.taemeernews.com

لیا۔اور سوال کرنے لگا۔

سر! میرا آدمی! ایسے ہی مار پیٹ کرتا رہتا ہے میرے ساتھ۔ بھاگ کے اپنی ماں کے پاس چلی آئی تو یہاں بھی آ گیا۔ دیکھئے کیا حال بنا دیا میرا؟ کیجئے! کچھ تو کیجئے میرے لئے۔

انسپکٹر نے اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھتے ہوئے اس کی شکایت پیلک جھپکتے ہی درج کر لی اور اسے سرکاری! سپتال بھیج دیا۔ پنوتھئی کی ماں بھی وہاں آ چکی تھی وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

خدا کی مدد پنوتھئی کے ساتھ تھی یا پھر انسپکٹر بہنوں والا ہوگا۔ آنا فانا اس نے موکانڈی کو پکڑ لانے کے لئے دو کانسٹیبل بھیج دیئے۔ مرہم پٹی کروا کے پنوتھئی واپس آئی تو موکانڈی کی جم کے پٹائی ہو رہی تھی۔

پیٹ پیٹ کے اسے لاک آپ میں ٹھونس دیا گیا تو انسپکٹر پنوتھئی سے پوچھنے لگا۔ اب کیا چاہتی ہو؟ دو تین دن اسے یہاں رکھے رہیں یا چھوڑ دیں؟ تمھیں اس کے ساتھ جانا ہے کہ نہیں۔"

سر! اس کا تو آپ جو جی چاہیں کریں۔ میں تو نہیں جانے والی اب اس کے ساتھ۔ بہت سہہ لیا لباس میں نے اب اور نہیں سہوں گی۔ اکیلی رہ کے بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔ موکانڈی کو دوسرے دن وارننگ دے کے چھوڑ دیا گیا۔ مگر تب تک یہ بات سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی کہ پنوتھئی نے اپنے مرد کو تھانے بلوا کے پٹوایا ہے اس پر طرح طرح باتیں ہونے لگیں۔

کچھ بھی ہو۔ جنم جنماتر کے لئے جس سے گانٹھ باندھی اسے اس طرح پٹوا دیا!۔ کتنی بری بات ہے۔ ایسا کہیں کرتے ہیں؟ بالکل غلط!۔

پکی چھنال ہے — رانڈ — چھی! —"

مگر یہ بھی تو سوچو۔ اور کیا کرتی۔ کتنا جھیل سکتا ہے کوئی۔ ہاں اور کیا۔ دیکھا نہیں کیسے پیٹ رہا تھا اسے؟۔ ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہئے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر ایسے دوسرے مردوں کو شاید عقل آ جائے۔ کرواما نے کہا تو۔ ایتھما تڑخ کے بول اٹھی۔ اوہو۔ بڑی ہمدردی ہو رہی ہے اس سے؟ واہ واہ کیا سوچ ہے تمہاری! عورت اپنے مرد کی مار سہے ہی نہیں؟ اس کو پولیس سے پکڑوا کے پٹوائے؟ جیسے پولیس اس کی حفاظت کے لئے ہمیشہ کھڑی ہی رہے گی۔ اور یہ پولیس والے! کب ہوئے ہیں کسی کے میں تو ان پر کبھی بھروسا کروں ہی نہیں۔ موکانڈی کی عورت ہے۔ ابھی نہیں تو کبھی جانا تو اسی کے پاس ہے۔ پھر کیا کرے گی؟ اب کی کسر تب وہ نکالے گا کہ نہیں؟۔

ایتھما کی بات سن کے کرواما کو لاجواب ہوتے دیکھ کنی اما بول اٹھی۔ کیوں جائے گی اس کے پاس۔ اسے تو دو سال پہلے ہی چھوڑ کے آ گئی ہے یہاں۔ اکیلی جی رہی ہے کہ نہیں؟ لینے تو وہ آیا تھا اسے! بچے پالے نہیں جا رہے تھے اس لئے آیا کون سا اس کی محبت میں آیا تھا اکیلے بچے پالنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔"

مگر کرواما کی اس بات کا جواب بھی ایتھما کے پاس موجود تھا۔ کتنے دن رہے گا اکیلا۔

www.taemeernews.com

عورتیں رہ بھی لیں مرد کے بغیر۔ مرد تھوڑا ہی رہتے ہیں۔ دیکھ لینا دوسری عورت لانے میں اسے دن ہی کتنے لگیں گے۔

عورتوں میں تو اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر مرد بپھر رہے تھے۔ ناک کٹا دی مردوں کی۔ اس کی تو اور پٹائی ہونی چاہئے۔ اتنی بڑی بڑی مونچھیں۔ نامرد کہیں کا اور دیکھو وہ کیسے دندناتی پھر رہی ہے! میں ہوتا تو وہیں کے وہیں گلا گھونٹ دیتا اس کا۔ پولیس اسٹیشن میں جان لے لیتا اس کی۔ کروپا سوامی آپے سے باہر ہو رہا تھا تو کسی نے ٹوک دیا۔ ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ ایسے ہی تو بڑے ہیرو ہو تم! ایک عورت کی جان لے لینے میں کون سے بہادری ہے بھائی۔ جنہیں عورت کو سنبھالنا نہیں آتا ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

یہ تو بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ اپنے انگوٹھے تلے دبا کے رکھنے کے لئے عورت کو جب تک چار چوٹ کی ایک مار نہیں لگاؤ قابو میں کہاں رہتی ہے! موکانڈی کو ایسا کرنا نہیں آیا تو اب بھگتے!۔ اتنی بڑی بڑی نوکیلی مونچھیں بس دکھانے کو رکھ چھوڑی ہیں۔

اس بات پر اتنے ٹھہاکے پڑنے لگے کہ پوچھو مت۔

مردوں میں اپنی اتنی تضحیک برداشت کرتے کرتے موکانڈی اپنی جان سے بیزار ہوا پڑا تھا۔ غصے اور شرمندگی سے دانت کٹکٹا کٹکٹا کے مارا مارا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے کتراتا رہتا— اور ایک دن اس نے اس معاملے سے آر یا پار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور پنوتھئی کے میکے جا دھمکا۔ باہر کھڑے ہو کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

کان کھول کے سن لو— چھوڑ رہا ہوں میں تمہاری بیٹی کو اب کبھی اسے لینے نہیں آؤنگا۔ اور نہیں پالنے ہیں مجھے اس کے جنے بچے بھی۔ میں دوسرا بیاہ کرنے جا رہا ہوں۔ بہت برداشت کر لیا۔ اب اور نہیں سہونگا۔ سن لیا تم نے! میں دوسرا بیاہ کرنے جا رہا ہوں!۔

پنوتھئی کا باپ گھر میں تھا۔ یہ سنا تو جھٹ باہر نکل آیا اور داماد کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں لگ گیا۔ ماپلے اتنا غصہ نہیں کرنے۔ دھیرج رکھو۔ ایسا تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ارے یہ عورتیں ہوتی ہی ہیں اوندھی عقل والی۔ میری بیٹی کی کچھ زیادہ ہی اوندھی ہے۔ پہنچ گئی پولیس اسٹیشن۔ عقل والی ہوتی تو ایسا کرتی؟ تھوڑا وقت دو مجھے میں خود اسے سمجھا بجھا کے تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔ بالکل نہیں۔ نہیں چاہئے مجھے تیری بیٹی۔ اور نہ ہی اس کے بچے! انہیں لا کے پٹک دوں گا یہاں۔ بہت سہہ لیا میں نے۔ اب اور برداشت نہیں کروں گا۔ کہتے ہوئے موکانڈی جانے کو مڑا تو سامنے پنوتھئی کھڑی تھی اب تک چپ چاپ سن رہی تھی، اس پر ٹوٹ پڑی۔

"کوئی ضرورت نہیں بچوں کو یہاں لانے کی۔ ایک پل بھی میں انہیں یہاں نہیں رہنے دوں

www.taemeernews.com

گی۔ کیوں رکھوں انہیں میں؟ تیرے بچے ہیں۔ تو پال۔ تیری مرضی سے پیدا ہوئے ہیں! مجھے بھی نہ تو چاہئے نہ تیرے بچے۔ ہرگز ہرگز انہیں نہیں رکھنے والی ہوں۔ ایسا کوئی قانون تو ہے نہیں کہ ماں ہی بچے پالے۔ خبردار جو تو یہاں لایا۔''

ہار کر موکا نڈی پیر پٹکتا چلا گیا تو پنوتھئی کی ماں زار و قطار رونے لگی۔ اری۔ سنا تو نے! کیا کہہ کے گیا! دوسری عورت لانے جا رہا ہے! اب تیرے بچوں کیا ہوگا؟ اری کب عقل آئیگی تجھے! تو کسی عورت ہے! اپنے مرد سے کیسی باتیں کرتی ہیں!— ہاتھا کاٹھی! مرد چاہئے پتھر کا بنا ہو یا گھاس پھوس کا، اپنا مرد ہوتا ہے۔ اری اُٹھ۔ دیکھ کیا رہی ہے؟ بھاگ۔ بیٹھی کیا ہے۔ اپنے بچوں کا تو سوچ۔ انہیں کیسے چھوڑ سکتی ہے تو!

اب چپ بھی کر اماں۔ سنتے سنتے تنگ آئی پنوتھئی ماں کے پاس آ کے کہنے لگی۔ کیوں جاؤں؟ بچے باپ کے نہیں ہوتے کیا؟ وہ کیوں نہیں پال سکتے انہیں؟ نہیں پال سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہیں۔ گھاس پھوس اور پتھر سے عورتوں کو کب تک باندھتے رہو گے تم لوگ؟ کم از کم میں تو نہیں بندھی رہنے والی۔ کہتی ہوئی پنوتھئی گھر کے اندر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بلیڈ تھا گھر کے سامنے والے مرغی کے ڈربے پر جم کے بیٹھ گئی۔ گلے سے منگل سوتر اتارا اور اس کے بیچ میں پڑی تھالی (لاکٹ) کو کاٹ کے نکالنے لگی۔ ماں نے دیکھا تو بدحواس ہو کے چیخنے لگی۔ اری کیا کر رہی ہے؟ کلموہی رانڈ!— یہ کیسی بدشگونی!..... اسے کیوں کاٹ رہی ہے؟ اری یہ ایڈوما پیا منگلا ہے!..... ہائے ہائے..... کیوں جنم دیا میں نے اس لڑکی کو..... اس سل کا بٹا پیدا ہو جاتا تو اچھا تھا.....'' منگل سوتر کے دھاگوں کو فرش سے چنتی وہ دھاڑیں مار مار کے روئے جا رہی تھی۔ اس کے رونے کی آواز سن کے آس پاس کے لوگ بھی گھروں سے باہر آ گئے اور اس کی ماں کے ہم آواز ہو گئے۔ مگر پنوتھئی نے کسی کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا دلجمعی سے اپنے کام میں لگی رہی۔ جب پوری تھالی نکال چکی تو آرام سے چلتی ہوئی ماں کے پاس جا کے کھڑی ہو گئی۔ اماں کیا چاہتی ہو؟..... پورا گاؤں اکٹھا ہو جائے؟ نہیں نا!— میں تو چلی شہر، تم بھی اب کما (ندی) کے گھاٹ چلی جاؤ۔ بیچاری بھیڑ کب سے ممیا رہی ہے۔ اس کے لئے وہاں سے کچھ، لانا ہے کہ نہیں؟ معصوم بے زبان جانور ہے۔ کب تک بھوکا رکھو گی اسے۔

اس نے منگل سوتر سے نکالی تھالی، کو اپنی کمر میں اڑس لیا ٹوکرا اٹھا لیا۔ اور مزے مزے سے چلتی ہوئی شہر جانے والی بس پکڑنے روانہ ہو گئی۔

دوسرے دن لوگوں نے اسے چھاواڑی کے ٹھیک سامنے ایک چھوٹی سی دوکان کھول کے اسے سجانے میں مصروف دیکھا جو دس برسوں سے اس کے گلے میں پڑے بے مصرف منگل سوتر کی تھالی بیچ کر پائے ہوئے روپیوں کی وجہ سے طرح طرح کے فروختنی سامانوں سے لبالب بھر گئی تھی۔

●●

www.taemeernews.com

منیب الرحمن کی شاعری کی کچھ اہم جہات

● زاہدہ زیدی

● منیب الرحمٰن ہمارے دور کے غالباً سب سے سینئر اور بہت اہم شاعر ہیں۔ لیکن ان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ انہوں نے نوجوانی ہی میں شاعری شروع کردی تھی اور وہ اب تک فعال ہیں جب کہ ان کی عمر پچاسی (۸۵) سال کے آس پاس ہے ان کی چھ (۶) شعری مجموعے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں جن میں 'بازدید' (انتخاب) بازدید، (مکمل) 'شہر گمنام'، نقطۂ موہوم، اور ہجر و فراق کی نظمیں شامل ہیں۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے بازدید (مکمل) کے پیش لفظ میں ان کی شاعری پر کلاسیکی، عصری اور مغربی اثرات کی نشاندہی بڑی خوبی سے کی ہے اور ان کا یہ بیان بھی دل نشیں ہے کہ منیب الرحمٰن کی شاعری ایک مترنم دھارا ہے جو کئی ملکوں سے ہوکر گزرتا ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمارے دور کے واحد شاعر ہیں جو بیک وقت اردو، فارسی اور انگریزی میں سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ منیب الرحمٰن کو اردو، فارسی اور انگریزی پر کما حقہ دسترس حاصل ہے۔ لیکن وہ کتنی زبانوں میں سوچتے ہیں یہ تو وہ خود ہی بتا سکتے ہیں البتہ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے وہ اردو ہی میں سوچتے ہیں اور اردو ہی میں شعر کہتے ہیں۔ وہ فارسی زبان و ادب کے اسکالر ہیں لیکن انہوں نے اب تک کوئی نظم یا غزل فارسی زبان میں نہیں کہی اور نہ ہی انگلش میں شاعری کی۔ بلکہ اپنی اردو شاعری کا انگلش میں ترجمہ بھی کچھ دوستوں کے توسط سے کرایا۔ بہر طور محترم فاروقی صاحب نے ان کی شاعری میں جن اثرات کی نشاندہی کی ہے وہ اہم ہیں۔ اور ان کی روشنی میں ان کی شاعری کی انفرادی شناخت قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسری طرف جناب مغنی تبسم اور شہریار نے ان کے مجموعۂ شاعری 'نقطۂ موہوم' کے ڈسٹ کور پر جس رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ دور دراز کار اور قابل حیرت ہے۔ ان کے الفاظ میں منیب الرحمٰن کی شاعری ایک پراسرار خوبصورت جزیرہ ہے، جس کی سیر کی توفیق کم لوگوں کو ہوئی ہے۔ اور جو اس کے مناظر سے سیر یاب ہوئے اور جن پر اس کے بھید منکشف ہوئے انہوں نے بہت کم کسی کو اس کا اتا پتا بتایا، اس

www.taemeernews.com

بیان کا اگر کوئی مطلب نکلتا ہے تو وہ یہ ہے کہ شاعری عام انسانوں اور ان کے مسائل سے کٹی ہوئی ایک پر اسرار جزیرے میں نور افشاں شاعری ہے جو 'جزیرہ خضرا' کی طرح عام انسان کے سائے سے بھی گریزاں ہے۔ اور اگر کچھ مخصوص لوگ کسی پر اسرار قوت کی مدد سے وہاں پہنچتے بھی ہیں تو پھر وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ یعنی اس کے اسرار میں اس طرح گم ہوئے کہ کسی کو اپنے تجربات میں شریک نہ کر سکے جس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ یہ شاعری حقیقی دنیا سے دور اور بے نیاز ایک فراری قسم کی شاعری ہے۔ اور یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے منیب الرحمٰن کی شاعری شروع ہی سے اپنے گرد و پیش کی دنیا سے منسلک ہے اور ایک مکالمہ قائم کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے عصری اور سیاسی مسائل سے بھی پرہیز نہیں کیا جس کا اندازہ مہاتما گاندھی کی موت پر لکھی ہوئی اور سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کی گرفتاری سے متاثر ہو کر کہی ہوئی نظموں سے ہو سکتا ہے۔ اور ان کی دوسری نظموں سے بھی جن سے انسانی مسائل اور گرد و پیش کے حالات کا عکس ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری داخل اور ان کے خارجی تاثرات کا ایک حسین امتزاج ہے جس میں بلاشبہ داخلیت کا عنصر زیادہ توانا ہے۔

اور اب ہم 'گفتگو' میں شائع شدہ باز دید کے اس تبصرے کو بھی دیکھتے چلیں جس کا حوالہ ڈاکٹر بیدار بخت نے 'نقطۂ موہوم' کے پیش لفظ میں دیا ہے۔ اور جو آزاد قلم کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس تحریر کے یہ الفاظ قابل توجہ ہے۔

> ''باز دید کی نظموں میں غم ذات اور غم کائنات دونوں کی لو مدھم ہے اور لفظی آرائش اور حسن کاری پر زور دیا گیا ہے ابلاغ اتنا مکمل ہے کہ ہر مصرع نظریں ملا کر باتیں کرتا ہے اور جی پلکوں کے سائے کے لئے ترس جاتا ہے۔''

اس بیان میں دو باتیں نا قابل قبول ہیں۔ اول تو یہ کہ منیب الرحمٰن کی شاعری میں لفظی آرائش اور حسن کاری مدھم لو کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش نہیں بلکہ یہ مدھم لو ہی حسن کاری اور فنی در و بست کا وسیلہ ہے۔ بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور یہ بات اتفاقی نہیں بلکہ شاعری کو ایک مخصوص رنگ و آہنگ دینے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ دوسری بات یہ کہ ابلاغ اتنا مکمل ہے کہ ہر مصرع نظریں ملا کر بات کرتا ہے'' اس قابل حیرت بیان کا اگر کوئی مطلب نکل سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ منیب الرحمٰن کی شاعری براہ راست اور ضرورت سے زیادہ وضاحتی ہے۔ اور یہ بات بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جو فنی نظم و ضبط لطافت، اشاریت اور تہہ در تہہ معنویت ہے وہ نہ صرف ہمارے جذبہ و فکر کو مرتعش کرتی ہے۔ بلکہ وہ ہم سے پوری توجہ کی بھی طالب ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری معروضیت اور داخلیت سادگی اور لطافت، بے ساختگی اور فنی در و بست، ارضیت اور ماورائیت اور حقیقت نگاری اور علامتی طرز اظہار کا ایک پر کشش سنگم ہے جو انہیں بار بار پڑھنے اور اپنے فکر و احساس میں جذب کرنے کی دعوت

www.taemeernews.com

دیتا ہے۔ ایک اور بات بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ منیب کی نظموں کو ایک ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ گو کہ اس میں شک نہیں کہ ان کی ہر نظم ایک مکمل اکائی ہے لیکن ان میں ایک باہمی ربط بھی ہے اور ان کے طرز احساس اور شعری اسلوب سے لطف اندوز ہونے کے لئے تسلسل سے پڑھنا بھی ضروری ہے۔ ان کی شاعری ہمیں خود بھی اس طریقہ کار کی طرف راغب کرتی ہے ان کی ایک نظم پڑھ کر یا تو اسے دوبارہ پڑھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ یا پھر ہم اور نظمیں پڑھنے کی خواہش سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اس شاعری کی معنویت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

اور اب میں اس جنرل گفتگو کو آگے بڑھانے کے بجائے میں ان کی کچھ چیدہ نظموں پر توجہ مبذول کرنا چاہوں گی جن کی مدد سے ان کی شاعری کی کچھ اہم جہات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں پہلی نظم جس پر میری نظر پڑی وہ 'ستارہ' ہے جو بازدید کی پہلی نظم ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک غیر معمولی بلکہ حیرت انگیز نظم ہے کیونکہ یہاں شاعر کو اپنے موضوع اور اس کے شعری اظہار پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ 'ستارہ' جو اہل فلک کا ہم نشیں ہے فلک کی خاموش اور ساکت فضاؤں سے بیزار ہے اور جہاں رنگ و بو کی ہماہمی بوقلمونی اور اس کی ہر ادا دامن دل کھینچتی ہے اور وہ اپنے جذبہ شوق کی شدت سے مجبور ہو کر فلک سے ٹوٹ کر زمین کی طرف آتا ہے اور فضا کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے یا پھر زمین کی رنگا رنگی اور شورش کے درمیان خاموشی سے سو جاتا ہے۔ اس نظم میں جو شدت فکر و احساس اور جو نفسیاتی بصیرت ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ اس کا سیدھا سارا انداز گہری علامتی معنویت کا حامل ہے دوسری نظم جواب میرے ذہن میں گونج اٹھی ہے وہ 'سمندر' ہے جو اس وقت لکھی گئی جب منیب الرحمٰن ۱۹۴۵ء میں بحری جہاز سے بغرض تعلیم لندن جا رہے تھے۔ سمندر کو دیر تک تکنے کے بعد شاعر محسوس کرتا ہے کہ سمندر ایک کھلی کتاب ہے۔ لیکن وہ کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی ہے جسے سمجھنے سے وہ قاصر ہے۔ اور پھر وہ سمندر سے درخواست کرتا ہے کہ اس نے اپنی زبان میں جو ایک افسانہ سا لکھ دیا ہے اس کا مطلب سمجھائے۔ لیکن اس کی یہ درخواست رائگاں جاتی ہے اور آخر کار شاعر خود ہی سوچتا ہے

''یہ قلزم بیکراں، یہ موجیں''

یہ وقت کا دھیرے دھیرے آغوش نیستی میں سمٹتے جانا ہے اور اس طرح یہ نظم وقت، تبدیلی اور فنا کے تصورات کو سمندر کے پیکر میں ڈھال دیتی ہے اور اسی طرح شاعر خود بھی لمحہ بہ لمحہ اپنی دنیائے آرزو سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

اس نظم کے بعد منیب الرحمٰن کی ایک اور خوبصورت اور معنیٰ خیز نظم کا خیال آنا بھی لازمی ہے۔ جو سمندر کے مرکزی خیال کی تکمیل کرتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے 'یہ وسعت بے کنار صحرا' اس نظم کا ابتدائی

www.taemeernews.com

حصہ پیش کرتی ہوں جو نہ صرف اپنی ترنم ریزی میں قابل ستائش ہے بلکہ گہری معنویت کا حامل بھی ہے:۔

یہ وسعت بے کنار صحرا
ہماری جرأت کا امتحان لے رہی ہے شاید
ہزار ہا کارواں ادھر سے گزر چکے ہیں
ہزاروں آئیں گے
پھر بھی اک شانِ بے نیازی سے سب کو دیکھتی رہے گی
نہ کچھ کہے گی ، نہ کچھ سنے گی
بھٹک گیا ہے اگر کوئی راہ میں تو اس کا ملال کیوں ہو۔

اس حصے کو پڑھ اقبال کی ایک شاہکار نظم 'ذوق وشوق' کے اس شعر کا خیال انا ناگزیر ہے

''آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر''
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

البتہ اقبال کی نظم میں جو جوش، ولولہ اور روحانی امنگ ہے وہ منیب الرحمٰن کی نظم میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ لیکن یہ نظم بھی اپنی جگہ فکر پرور اور بصیرت افروز خاص طور سے اس لئے کہ یہاں منیب الرحمٰن نے زماں اور مکاں کے تصورات کو باہم دیگر پیوست کر دیا ہے۔ بے کنار صحرا، مکاں کا استعارہ ہے اور گزرتے ہوئے کارواں اور ان لوگوں کا تضاد بھی جنہوں نے اپنے نقش قدم سے منزل کے نشانات پالئے اہم اور معنیٰ خیز ہے۔ بھٹکے ہوئے کارواں کو ایک رائگاں زندگی کی علامت کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اپنی کاوش اور جرأت سے منزل کے نشان پالئے ہیں ایک معتبر اور تخلیقی زندگی کا استعارہ ہیں اور اگر چہ وہ گزر چکے ہیں لیکن ان کی خوشبو اب بھی فضاؤں میں بسی ہوئی ہے۔ اور کوئی 'دلگداز نغمہ' کوئی 'محبت بھری کہانی' اور کوئی مہ شیریں اب بھی فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ یعنی ان کے تخلیقی کارناموں کے نشانات باقی ہیں اور اب یہ نظم ایک بے حد ذاتی نوٹ پر ختم ہوتی ہے:۔

یہ وسعتِ بے کنار صحرا
میں اک نحیف و نزار رہرو
مگر اے ذراتِ نور پیکر گواہ رہنا
یہاں سے گزرا تھا اک مسافر
مچل رہے تھے ہزاروں نغمات جس کے دل میں
مگر زمانے نے جس کے ہونٹوں کو سی دیا تھا

اس آخری حصے کی دلکشی میں تو کوئی کلام نہیں اور خاص طور سے ذرات نور پیکر کی ترکیب تو

www.taemeernews.com

بہت منفرد اور دلنواز ہے لیکن یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس ذاتی اعتراف نے اس معنی خیز اور بصیرت افروز نظم کے کینوس کو کسی قدر محدود کر دیا ہے۔ پھر بھی زمان و مکاں فنا بقا اور معتبر زندگی کے تصورات کو ایک منفرد انداز سے پیش کرنے کے باوصف یہ ایک اہم اور دلکش نظم ہے صحرا، سمندر اور ستارہ مذکورہ نظموں کے استعارے یا مرکزی کردار ہیں اور ان سب کا تعلق فطرت یا عظیم کائنات سے ہے اور یہ محض اتفاق نہیں بلکہ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ فطرت کے سبھی مظاہر منیب الرحمٰن کی شاعری میں نئے انداز سے اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں صحرا، سمندر بہار، خزاں، چاند، سورج، ستارے، بادل، پرندے، درخت، پت جھڑ، روشنی، اندھیرا، دھندلکا، ہوائیں ان کی پیکر تراشی کے اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور ان سب کو انہوں نے ایک علامتی معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور وہ ایک تخیل آفریں ماحول کی تشکیل کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر فطرت سے ان کا تعلق داخلی ہے صرف خارجی نہیں۔ داخلی تجربات اور کیفیات کے اظہار کی بہترین مثال ان کی عشقیہ شاعری ہے اور وہ بھی بڑی حد تک فطرت کی مرہون منت ہے۔ جسے منیب الرحمان نے عام طور پر علامتی معنویت کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

اور جب ہم منیب الرحمٰن کی عشقیہ شاعری پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو سب سے پہلے جو نظم ذہن میں گونجتی ہے وہ 'باز دید' ہے جو ایک ناقابل فراموش نظم ہے۔ اس میں احساس کی شدت پیکر تراشی کی ندرت اور تخیل کی بالیدگی نے ایک طلسمی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ نظم کو تین بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں شاعر نے اپنی محبوبہ سے شام یا رات یا پھر صبح کو آنے کی فرمائش کی ہے۔ اور اس طرح مترنم آہنگ اور نادر پیکر تراشی کے توسط سے شام رات، اور صبح کے تاثرات اور ذاتی کیفیات کو مجسم کر دیا گیا ہے یہ نظم آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ترشی ترشائی اور ڈھلی ڈھلائی اور اس کا مخصوص Rhyming pattern نے جس میں تسلسل۔ تنوع اور تکرار کے عناصر سے کام لیا گیا ہے اس کی کشش کو دوبالا کر دیا ہے۔ اور ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ تینوں بندوں کا Rhyming pattern اس طرح ہے۔

ABCBDD 1

ABEBFF 2

ABGBHH 3

اور اس تجزیے کے بعد میں صرف اس کے دوسرے بند کا تراشہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گی جو اس طرح ہے۔

تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ

www.taemeernews.com

مستئی بادسبک گام لئے
شبنمی شیشوں کو سیلائیں لچکتی شاخیں
اور مہتابِ زمستان کوئی پیغام لئے
یوں چلا آئے کہ در باز نہ ہو
کوئی آواز نہ ہو۔

یہاں اس کے زائمنگ پیٹرن کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا کیونکہ میرے خیال میں اس نظم کی سدا بہار دلکشی اور ہر دلعزیزی کا راز اس کے مخصوص رائمنگ پیٹرن اور اس کی نادر پیکر تراشی میں پنہاں ہے جس کا اندازہ مندرجہ بالا تراشے سے بھی ہو سکتا ہے۔

''بازدید'' جوانی کے دور کی تخلیق ہے۔ اور اس کا پورا ماحول نوجوانی کے رومانس کے مطابق ہے۔ لیکن اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عشقیہ شاعری منیب الرحمٰن کی شاعری کا ایک مرکزی موضوع ہے اور شروع سے آخر تک اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں عشق کے تجربے کو ہر پہلو سے پیش کیا گیا ہے اور ان میں پختہ عمر کے سنجیدہ اور بصیرت افروز تجربات بھی شامل ہیں اور شدت احساس کے ساتھ ساتھ خود شناسی اور حقیقت شناسی کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ ان کے مجموعہ اول 'بازدید' میں مکافات 'اس دیار میں' ہم سفر اور پتے، عشقیہ انداز کی کچھ قابل ذکر نظمیں ہیں اور شہر گمنام اور ان کے حالیہ شعری مجموعے ہجر و فراق کی نظموں میں خوشبو گفتگو یہ لمحہ، کہاں جاؤں اور آیا تیرا ہی ذکر حزنیہ انداز کی اثر انگیز عشقیہ نظمیں ہیں۔ مقالے کی حدود ان نظموں پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس لئے صرف عنوانات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اور اب میں دو اور نظموں پر مختصر طور پر روشنی ڈالنا چاہوں گی جو دوسرے عنوانات پر لکھی گئی ہیں اور 'بازدید' میں شامل ہیں۔ اور یہ دو خوبصورت اور معنیٰ آفریں نظمیں ہیں خواب، اور قطرہ۔

پہلی نظم 'خواب' ایک بہت ذاتی انداز کی نظم ہے جس میں شاعر نے خوابوں کی گریز پائی اور طلسماتی کیفیت کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کا شعری اسلوب، پیکر تراشی اور مترنم بحر خاص طور سے دلکش ہیں۔ کچھ حصے پیش کرتی ہوں۔

راہ مہتاب میں خوابوں کے گریزاں سائے
آگہی بن کے یکایک رگِ جاں تک آئے
میں نے چاہا تھا انہیں واقفِ اسرار کروں
ایک لمحے کے لئے مائل گفتار کروں

www.taemeernews.com

لے گئی بادِ سحر گاہ اڑا کر ان کو
آہ ڈھونڈوں کہاں جاکر ان کو
کون سی شاخ سے پوچھوں میں نشیمن ان کا
ہر کرن بن گئی مسکن ان کا

یہ نظم مبہم اور مجہول اجتماعیت اور جرأت آمیز تخلیقی انفرادیت کے تضاد کا ایک انوکھا اور معنیٰ آفریں اظہار ہے۔ اور نظم کے سبھی شعری پیکر۔ ہوائیں، بادل، قطرہ زمیں اور سیلاب ڈرامائی کرداروں کی طرح فعال اور جاندار ہیں۔ اور علامتی معنویت کے حامل ہیں نظم کا مرکزی خیال اپنی پوری شدت اور رعنائی کے ساتھ ہمارے ذہن میں اتر جاتا ہے۔

یہ سب نظمیں جن پر کسی قدر تفصیل سے اس مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے ان کے اولین مجموعۂ کلام 'بازدید' سے لی گئی ہیں۔ جو ان کی علی گڑھ اور لندن میں لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل ہے لیکن ان کے شاعرانہ رتبے کو سمجھنے کے لئے ان کی دوسری تخلیقات پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جو زیادہ تر اس دور میں وجود میں آئی جب منیب الرحمٰن امریکہ میں مقیم تھے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ ان کی شاعری میں تسلسل کے ساتھ ساتھ تبدیلی اور تنوع کے نقوش بھی ملتے ہیں اور خاص طور سے امریکہ کے دور قیام کی شاعری کا اپنا ایک الگ کردار ہے جس میں ہمیں ان کے موضوعات اور پیکر تراشی میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ منیب الرحمٰن کے ذاتی تجربات میں یہاں تنہائی اور نوسٹیلجیا (Nostalgia) کی کیفیت بیش از بیش ہے اور پیکر تراشی میں انہوں نے امریکہ کے فطری اور ثقافتی ماحول سے بھی کام لیا ہے جس کی ایک اچھی مثال 'برف کا آدمی' ہے۔ ان کی علامت نگاری کے بھی کچھ متنوع اور معنیٰ خیز نمونے ہمیں اس دور کی شاعری میں ملتے ہیں جس کی بہترین مثال ہے 'ندی کے اس پار میرا گھر ہے'۔ جو نقطۂ موہوم میں شامل ہے۔

ان کا حالیہ شعری مجموعہ 'ہجر و فراق کی نظمیں' جس میں وہ سب نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے اپنی شریک حیات کے انتقال کے بعد لکھیں ایک الگ مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے اور اس دور کی شاعری کے دوسرے پہلو بھی غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں لیکن یہاں ان پر مزید روشنی ڈالنے کی گنجائش نہیں۔ اس لئے ان جہات پر اظہار خیال کسی آئندہ مطالعے کے لئے ملتوی کیا جاسکتا ہے اور یہاں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ منیب الرحمٰن ایک اچھے اور جینوئن (Genuine) شاعر ہیں اور ان کے کلام میں جذبہ و فکر کا توازن۔ نادر پیکر تراشی مترنم بحریں۔ معنیٰ آفریں علامت نگاری، تخیل آفریں شعوری اظہار اور دلنواز شعری اسلوب ان کی شاعری کی قابل قدر خصوصیات ہیں۔ عصری شعری منظرنامے میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

●●

www.taemeernews.com

تالی

محمد یحییٰ جمیل

دھوپ اچھی لگنے لگی تھی
لیکن سویٹر کے جزوِ لباس ہونے میں کچھ دن اور تھے
بچوں کے لئے ضروری ہو جانے والے کپڑوں کی فکر
آگے بڑھ کر کہہ رہی تھی
ویل کم تو گولکنڈا فورٹ سر گائیڈ چاہئے آپ کو،
متعدد مرتبہ قلعہ کے زینے چڑھتے اترتے
سچ جھوٹے واقعات کے تانے بانے سے تاریخ بن کر
تکرار کے اکتا دینے والے عمل سے اکتائے بغیر
وہ کامیاب ہو جاتا ہے
اپنے مسئلہ بھر روپے کمانے میں
لیکن مسائل ختم بھی ہوتے ہیں کہیں
وہ تو محض شکل بدل کر ختم ہو جانے کا دھوکہ دیتے ہیں
گولکنڈہ کے قلعے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے جناب
کہ اس دروازے کے نیچے کھڑے ہو کر تالی بجائیں
تو اوپر سنائی دیتی ہے تالی کی آواز
آپ یہیں ٹھہریں میں نیچے جا کر تالی بجاتا ہوں
اور وہ تیزی سے نیچے اتر گیا بہتے پانی کی طرح
اس نے تالی بجائی اور مجھے سنائی دی
سترہویں صدی کے کسی غلام حبشی کی صدا
یوں تو بہت تیز ہوا کرتی ہے آواز کی رفتار
لیکن کبھی کبھی آواز کو کانوں تک پہنچتے پہنچتے
صدیاں لگ جاتی ہیں
اپنی ضرورت کے لئے بجائی گئی اس کی تالی
جانے کب سنائی دے

ایک سوال

بھیڑیے کی یونی میں پیدا ہونا
میرے لئے کبھی بھی
زیادہ سکھ کی وجہ نہیں بنا
چاندنی راتوں کو
اپنے وجود سے پرخطر بنا دینے میں
میری پسند ناپسند کا سوال ہی نہیں تھا
ہانپتے چوپایوں کو پھاڑنا
اور ان کے بطن سے جنم لینے والی
ایک پوری نسل کے امکانات کو ختم کر دینا
غیر معمولی بات ہوا کرتی ہے
میں نے کبھی نہیں سوچا
دلوں میں خوف بن کر دھڑکتا رہا
ان کے بھی
جو جنگلوں سے نا آشنا تھے
اور محفوظ مکانوں میں سوتے تھے
زندگی کو اپنے سامنے ہاتھ ملتے دیکھنا
میری مجبوری تھی لیکن
اے امینو! آسمانی صحیفوں کے
زندگی کو اپنے سامنے ہاتھ ملتے دیکھ کر
تم کیوں خوش ہوتے ہو؟

www.taemeernews.com

طویل نظم صادقہ کے تازہ حصے

زبیر رضوی

●

صادقہ!
ربطِ خاص کی ساعتیں ختم ہو گئیں
میں بھی کہیں پہ رُک گیا تم بھی کہیں بچھڑ گئیں
گردشِ ماہ و سال نے رختِ سفر بدل دیئے
اب کے ہماری راہ میں سنگِ گراں بھی رکھ دیئے
وہ جو نوا تھی آتشیں سر دالاؤ بن گئی
موجِ بلا سے اِس برس کشتیِ جاں کی ٹھن گئی

کیسا یہ اتفاق ہے
راہ کے پیچ و تاب میں
تم یہ کہاں پہ مل گئیں
کوئی ستارہ ٹوٹ کر
دامنِ دل میں آ گرا
غُرفۂ آسمان سے چاند نکل کے آ گیا

صادقہ!
تم ستارہ جو
واقفِ سمتِ رنگ و بو
گاہ شمیمِ آرزو گاہ نسیمِ جستجو
پوچھو نہ مجھ سے اِس پہر
گردشِ پا لیئے پھری عمرِ رواں کہاں کہاں

کیسے بدن دریدہ ہم، جبر و ستم کے درمیاں
سہتے رہے اذیتیں
تیرہ شبی میں آنکھ کے سارے اُجالے چھن گئے
اندھے کنوؤں میں اپنی ہی آہ و بکا کو سن کے ہم
کتنے اُداس ہو گئے

ایک ہجوم تھا اُدھر
ایک ہجوم تھا اِدھر
خلق کا یہ ہجوم بھی ہم کو اکیلا کر گیا
اپنے زوالِ بخت کی چارہ گری نہ کر سکا

صادقہ!
اب جو آئی ہو
پھر سے ہم ایک کتھا لکھیں
ایک کتھا زمین پر
ایک کتھا ہواؤں پر
قید و قفس کے نام پر
عدل کے امتحان پر
چھینی گئی رداؤں پر
چاک ہوئی قباؤں پر
صادقہ! اب جو آئی ہو!

www.taemeernews.com

●

صادقہ!
معجزات کی صورتیں سب بدل گئیں
حیرتیں آنکھ سے گئیں
فکر و خیال و جستجو
اپنی حدوں سے ہر قدم
اور بھی آگے بڑھ گئے
پاؤں کہاں کہاں اُٹھے
جست کہاں تلک گئی
زیرِ زمیں سکوت کو ہل چلیں کوئی دے گیا
نیلگوں آسمان کی خاک نما زمین پر
ایک جہانِ جستجو لے کے کوئی اُتر گیا
گہرے سمندروں میں آنکھ
کیا کیا نہ ڈھونڈتی پھری
خواہ زمیں ہو آسماں
یا ہو وہ بحرِ بیکراں
دشت و جبل ہو ریت ہو
نوکِ سنانِ فکر نے طے کئے سارے امتحاں
برق کی سی گتی کے ساتھ
جسم کی تازگی کے ساتھ
سڑکوں پہ دوڑ بھاگ ہے
دوڑے ہے رَخش بے لگام
سمتِ سفر سے بے نیاز
اب نہ کسی کا خواب ہے اب نہ کسی کا کوئی راز

صادقہ!
رات آئے گی
ساری زمین بے پناہ نور میں ڈوب جائے گی
سیم تن و شفق بدن
شوخیِ چشم و لب لئے
جام و سُبو اچھالتے
محفلِ شب میں آئیں گے
اور کسی بھی گود کو
اپنا ہرا بھرا بدن
سونپ کے بھول جائیں گے!

www.taemeernews.com

●

صادقہ!
یہ جہان سب جنگ وجدل سے بھر گیا
اور یہ سارا خاکداں تیرہ وتار ہو گیا
سارے الوہی فلسفے، فکر ونظر کے سلسلے
سوچ کے سارے زاویے حرفِ غلط گنے گئے
حرفِ خرد نہیں رہے
مذہب ورنگ ونسل کے چار طرف مجادلے
حسن وجمالِ خاکداں لوٹ کے سارا لے گئے
خودکشی، خوداذیتیں
حملہ وروں کی حکمتیں
خون اچھالتی رہیں موت کو بانٹتی رہیں
شرق سے اور غرب تک
امن کی فاختہ کے پَر نوچ دیے گئے مگر
فاختہ آسمان میں اڑتی رہی گری نہیں
کتنے ہزاروں لاکھوں ہاتھ
لے کے سرود اور ستار
دلرُبا، ونیا اور گِٹار
اوڈیسی، موہنی اٹم
اور کتھک، کتھاکلی
رقص کی لوک زندگی
امن کا پرچم بلند لے کے چلے ہیں چارسُو

صادقہ!
آؤ امن کے سیلِ رواں سے جا ملیں
امن کا پرچم بلند ہاتھوں میں اپنے تھام لیں
ناچتے گاتے جانبِ حلقۂ دلبراں چلیں!

www.taemeernews.com

سید امین اشرف

●

فضا پر خواب طاری اور آنکھیں دھو رہا ہوں میں
سرِ دیوار سرشارِ تمنا ہو رہا ہوں میں

نگاہِ نکتہ رس میں وہ ز سرتا پا لطافت ہے
تو پھر اک بوجھ سا کیوں فرق جاں پر ڈھو رہا ہوں میں

یہ بے بال و پری گردوں نما خوابوں سے دوری ہے
کوئی آواز دیتا ہے کہیں سے، سو رہا ہوں میں

دماغِ نشۂ دنیا بھی ہو کارِ زیاں جیسے
مجھے محسوس ہوتا ہے کہیں کچھ کھو رہا ہوں میں

یہ وحشت باعثِ تخلیق بھی ہے کارِ جاں بھی ہے
فضا میں پھول، صحراؤں میں تارے بو رہا ہوں میں

میں فاتح میرے دم سے نیّرِ اقبال بھی لیکن
میانِ تاج و تخت و لاؤ لشکر رو رہا ہوں میں

یہ جیسے منتظر ہوں صورِ اسرافیل کے شاید
قبیلے کا قبیلہ سو رہا ہے سو رہا ہوں میں

شکیب ایاز

●

جانے کیوں فقر کے رستے مرے گھر تک آئے
ان کو جانا تو وہ میزانِ گہر تک آئے

کوئے دمساز سے نکلے تو نگوں سر نہ ہوئے
واں سے لوٹے تھے جو پتھر، مرے سر تک آئے

کتنے پتوں نے ہواؤں سے لڑی جنگِ ہنر
کتنی مشکل سے ثمر ان کے شجر تک آئے

کتنے بے ساختہ آنسو تھے کفِ رنجش میں
کتنے رومال صبا، دیدہ تر تک آئے

کس سے معلوم کریں شعبدۂ جاں کیا ہے
کتنے منظر ہیں جو اس قیدِ نظر تک آئے

چومنے کس کے قدم گردشِ زنجیر آئی
اور ہم محض یہاں رسمِ سفر تک آئے

www.taemeernews.com

رونق شہری

●

راستہ آساں ہے تو مشکل بھی نکلتا ہوگا
دُھند سے چہرۂ منزل بھی نکلتا ہوگا

کشتیاں بیٹھ گئیں آب کی تہ میں جاکر
اُس طرف سبزۂ ساحل بھی نکلتا ہوگا

جس کی خود صحبتی مشہور ہے دنیا بھر میں
لُوٹنے کے لئے محفل بھی نکلتا ہوگا

آنکھ سے دل میں اترنے کا ہنر رکھتے ہوئے
حیثیت کا کوئی حائل بھی نکلتا ہوگا

ساتھ سورج کے جہاں ڈوب گئی آبادی
کوئی انجام سے غافل بھی نکلتا ہوگا

ہاتھ میں اس کے ہو شمشیر برہنہ نہ سہی
اپنے وہ مد مقابل بھی نکلتا ہوگا

دیکھنے کے لئے مکروہ ارادوں کا طلسم
خوب صورت کوئی قاتل بھی نکلتا ہوگا

طارق متین

●

تو سرایت ہے مری روح میں جاناں پھر بھی
مثل آہو ہے بہت مجھ سے گریزاں پھر بھی

گرچہ معمور ہے ہر شئے سے مرا دامنِ دل
میری آنکھوں میں ہے اک خواب پریشاں پھر بھی

گلشنِ دہر کو ہم نے ہی دیا جامۂ گُل
ہم ہی پھرتے ہیں یہاں چاک گریباں پھر بھی

سر کٹانے کا جگر سب کو کہاں ملتا ہے
ہم کہ اس نوکِ سناں پر ہیں فروزاں پھر بھی

ساری دنیا میں ہے دکھ درد کا پہرہ طارق
بجتی رہتی ہیں مگر بزمِ چراغاں پھر بھی

www.taemeernews.com

راشد طراز

●

یہ عمر گذری ہے اتنے ستم اٹھانے میں
کہ خوف آتا ہے اگلا قدم اٹھانے میں

زمیں کا مجھ سے حوالہ بھی ٹوٹ پایا نہیں
میں سرفراز رہا تیرا غم اٹھانے میں

دیا ہے دہر میں تاوان ذات اتنا خدا
کہ شرم آتی ہے اب کیف و کم اٹھانے میں

ہر ایک شئے پہ ہے یکسانیت کا غلبہ کیوں
یہ امتیازِ وجود و عدم اٹھانے میں

چمک کے کوچۂ قاتل میں نیزے کیا کرتے
کہ جوش خوں تھا ہمارے قلم اٹھانے میں

تمہاری یاد بھی آئی تو کس طرح آئی
حیات رک سی گئی چشمِ نم اٹھانے میں

شکست کھا نہ سکا میرا لفظِ حق راشدؔ
میں بے خطر رہا اس کا علم اٹھانے میں

فہیم جاوید

●

درد جب سے ملا ہے مخمل سا
سر پہ چھایا ہوا ہے بادل سا

صبح دم نور کی شعائیں ہیں
آنکھ سے بہہ رہا ہے کاجل سا

کس کے رونے کی یہ سخاوت ہے
شہر میں ہو گیا ہے جل تھل سا

اپنی صحرا نوردی رنگ لائی
ذہن میں اگ رہا ہے جنگل سا

کس کی آمد کی سوچ میں جاویدؔ
دل میں رستہ بنا ہے صندل سا

www.taemeernews.com

ارشد کمال

●

کس زباں پر ہے یہاں کون سی تقریر، نہ دیکھ
کون ہوتا ہے یہاں کس سے بغل گیر، نہ دیکھ

شیر میں آب ہے یا آب میں ہے شیر، نہ دیکھ
اس طرح ڈوب کے تو وقت کی تصویر نہ دیکھ

لوحِ دل پر ہے رقم جو بھی ذرا پڑھ لے اسے
پردۂ ذہن پہ لکھی ہوئی تحریر نہ دیکھ

اپنے احساس کو اظہار کا جامہ دیدے
کیوں ہیں خاموش زمانے کے مشاہیر، نہ دیکھ

زندگی سے ہے تعلق تو نبھا دے اس کو
'رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'

روز و شب جس کے گزرتے ہیں جہاں سوزی میں
کیسے بنتا ہے زمانے میں وہی میر، نہ دیکھ

شمعِ دوراں سے ہے جو کچھ بھی میسر ارشدؔ
باعث تیرہ شبی ہے، کہ ہے تنویر، نہ دیکھ

شاہد اختر (گیا)

●

نگاہیں جس کی تمنائی تھیں نہیں گزرا
مکانِ دل سے مرے وہ مکیں نہیں گزرا

یہ زندگی کا سفر ہے کوئی مذاق نہیں
یہاں سے کوئی بھی منزل نشیں نہیں گزرا

جھلس کے رہ گئے تہذیب کے لب و رخسار
یہ کار خانہ سلامت کہیں نہیں گزرا

گماں گزرتے رہے یوں کہ ہم بھی ہیں موجود
خود اپنے ہونے کا لیکن یقین نہیں گزرا

گزر چکے ہیں مہ و سال آرزو پھر بھی
وہ انتظارِ شبِ اولیں نہیں گزرا

نکل بڑے ہیں قناعت کی راہ میں یارو
کہ ہم پہ عرصۂ نانِ جویں نہیں گزرا

ہماری خود سے ملاقات کب ہوئی اخترؔ
ہمارے جیسا بھی گوشہ نشیں نہیں گزرا

www.taemeernews.com

فاطمہ تاج

●

ہماری آنکھ کے منظر بدل تو سکتے ہیں
نئی زمیں نئے رستے نکل تو سکتے ہیں

کسی کا ساتھ نہ ہم دے سکیں گے منزل تک
کسی کے ساتھ ذرا دور چل تو سکتے ہیں

سحر سے پہلے ہی بجھ سکتے ہیں چراغ مگر
یہ ابتدائے شبِ غم میں جل تو سکتے ہیں

فضا میں خوشبو کی صورت بکھرتے نغموں سے
سکوں ملے نہ ملے دل بہل تو سکتے ہیں

یہ جانتے ہیں کہ تعبیر کچھ نہیں لیکن
ہماری آنکھوں میں کچھ خواب پل تو سکتے ہیں

الگ الگ ہیں مقاماتِ جستجو اپنے
جو چاہیں راستہ اپنا بدل تو سکتے ہیں

حنیف ساحل

●

کسی صورت مرے بیاں سے نکل
کسی دلچسپ داستاں سے نکل

ہو رسائی جہاں وہاں سے نکل
میری سوچوں کے درمیاں سے نکل

عرش کی سیڑھیاں اتر کر آ
ان ستاروں سے کہکشاں سے نکل

ان دریچوں سے جھانک کمرے میں
چاند کی طرح آسماں سے نکل

ختم تو ہو یہ جستجو کا سفر
تو کبھی نقش سے نشاں سے نکل

بھید کے پردے سارے سرکا کر
منکشف ہو کے راز داں سے نکل

گفتگو کر نہ یوں اشاروں سے
لفظ بن کر کبھی زباں سے نکل

سارا آفاق منتظر ہے تیرا
تو حدودِ زماں مکاں سے نکل

www.taemeernews.com

بازخواں

فراق اور اردو غزل گوئی

● غالب اور اقبال کے بعد فراق اردو کے تیسرے جینئس Genius ہیں ان کی شعری کائنات ان کے خلاّق اور زرخیز ذہن کی زائیدہ ہے جو سب سے الگ اور منفرد اس طور تھی کہ غزل کو سپردگی، محویت اور ایک سرشار نئے طرز احساس کے ساتھ برتنے میں فراق کی تخلیقی آرزو مندی ظفر مند رہی یہ غزل نئی حسیت اور کیفیات کے اس وقت تک کے نامعلوم جہانوں اور ابعاد کی دید کی ایسی فضا سازی کرتی ہوئی گزرگئی جس سے 'تغزل'— جذبے، خیال اور کیفیات کے بادۂ ناب سے چھلک پڑا یہ تخلیقی انفرادیت (Creative originality) کا وہ تموج تھا جس میں فرسودہ خیالی خس و خاشاک کی صورت بہہ گئی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ فراق کی غزل اپنے لب و لہجہ کی تازگی اور ندرت کے باعث سر اٹھا کے چلنے لگی اس غزل نے 'تقلید' اور' تبتع کے گردو غبار سے دور اپنی بنائی روشوں پر تخلیقی وجدان کی پھواروں میں سرتا پہ شبنمی بن کر نئی منظر سازی کی یہ وہ غزل تھی جو نہ صرف غزل کی روایت اور اس کی تہہ داریوں میں رچی بسی تھی اس کے تخلیقی آمیزوں سے بھی پوری طرح باخبر تھی۔ فراق کی غزل شناسی کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ غزل کے خانۂ تاریک میں نظم کے روشندان کھولنے کی شعوری کوشش کا آغاز ۱۸۷٤ء کے اس تاریخی مشاعرے سے ہوچکا تھا جس کی سرپرستی کرنل ہالرائیڈ نے کی تھی اور جس میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالیؔ نے اپنی نظمیں سناکر اردو شاعری کو محدود احاطوں میں رہ کر زنجیرِ پا کے ساتھ رقص کرنے کی قید سے آزاد کرانے کی مہم شروع کی تھی ہجر و وصل کی گھسی پٹی کیفیات اور مجموعی طور پر مبالغہ آرائی کی جاگیر بنی غزلیہ شاعری کو وسعت دینے اور اس کے مضامین میں واقعیت اور حقائق کو راہ دینے کی جو وکالت مقدمہ شعروشاعری ، میں کی گئی تھی اور جس کی باز گشت اسماعیل میرٹھی، نظم طباطائی، نادر کاکوری ، ضامن کنتوری، سجاد حیدر یلدرم کی نظموں سے ہوتی ہوئی بالآخر ادبی رسالوں ،دلگداز، مخزن

www.taemeernews.com

اور ہمایوں میں ایک 'گونج' کی صورت پہونچی 'مخزن' کے پہلے شمارے میں اقبال کی نظم ہمالہ میں ذیل کے مصرعوں نے اردو کی شعری فضا کو تشبیہہ اور استعارے کے ایک نئے لطفِ سخن سے آشنا کیا۔

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر وہ درختوں پہ تفکر کا سماں چھایا ہوا

غزل کی ریزہ خیالی اور پریشاں گوئی پر شررؔ کے دلگداز ، سر عبدالقادر کے 'مخزن' کے جارحانہ ردعمل کے بعد نظم کے فروغ کی تحریک کو مہمیز کرنے میں رسالے 'ہمایوں' نے اس وقت کلیدی رول ادا کیا جب مولانا تاجورنجیب آبادی نے اردو نثر و نظم کی اصلاح کو اپنا ادارتی موقف اور پالیسی بنالیا تھا نظم کے فروغ نے ترقی پسند تحریک کے عروج میں نئی زندگی پائی اور غزل نئی صنف سخن 'نظم' کی خیرہ کرنے والی چمک دمک میں اپنی آب و تاب کھونے لگی یہی وہ موڑ تھا جب فراقؔ نے اپنی غزل شناسی کو جلا دی اور اور نیاز فتح پوری کے اصرار اور تحریک پر بیسویں صدی کی چوتھی دھائی میں جوشؔ کے رسالے 'کلیم' میں شائع ہونے والے 'غزل مخالف مضمون' کا ایک تفصیلی اور دانشورانہ جواب دینے کی حامی بھرتے ہوئے ایک طویل مضمون 'اردو غزل گوئی' کے عنوان سے لکھا جسے نیازؔ نے اپنے رسالے 'نگار' میں "انتقاداتِ عالیہ" کی مثال کہہ کر شائع کیا۔

فراقؔ کا یہ مضمون اردو کی شعری روایت ، ہندستانی شعریات اور عالمی شعریات خاص طور سے انگریزی کی شعری روایات پر ان کی غیر معمولی دسترس کا مظہر ہے ۔ یہ اردو کی دوبڑی اصناف کا غیر معمولی محاکمہ اور موازنہ ہی نہیں ان دونوں کی تخلیقی اہمیت کو اجاگر کرنے میں بھی معاون بنا ہے بقول نیازؔ ، فراقؔ کا 'سلیقۂ انتنقاد' دراصل خدا کا ایک ایسا عطیہ ہے جو ہزاروں ذہین دماغوں میں کسی ایک کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ 'اردو غزل گوئی" اور فراقؔ کی غیر معمولی کتاب 'اندازے' اس کا ثبوت ہیں۔

ہمارے آج کے سربراہ نقادوں کی تحریروں میں اردو شاعری اور غزل کی روایت اور اس کی سخن سنجیوں کی ایسی بلند پایہ آگہی اور دسترس ڈھونڈے سے نہیں ملتی ہمارے خیال میں غزل کی تفہیم کے لئے فراق کے اس مضمون کی بازخوانی آج کے حالات میں ضروری ہے ۔ ● مرتب

www.taemeernews.com

اردو غزل گوئی

● فراق گورکھپوری

ابتدائیہ

● ۱۹۳۶ء کی گرمیاں تھیں۔ اس زمانہ میں حضرت جوش ملیح آبادی دہلی سے ایک اردو ماہنامہ کلیم کے نام سے نہایت آب وتاب کے ساتھ نکالا کرتے تھے۔ ازراہ عنایت مجھے بھی ماہ بماہ وہ کلیم کے شمارے بھجوادیا کرتے تھے۔ ان دنوں کلیم کے کسی شمارہ میں جناب آزاد انصاری کے حال میں شائع شدہ دیوان پر کسی کا ایک بہت طول طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں غزل گوئی اور صنف غزل کو پانی پی پی کر کوسا گیا تھا۔ میں کئی برس پہلے سے سوچ رہا تھا کہ غزل کے متعلق اپنے محسوسات وخیالات سپرد قلم کروں اور اس امر کی پوری دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ کوشش کروں کہ ہمارے ادبی کلچر میں غزل کا جو مرکزی مقام ہے اسے اچھی طرح دلنشیں کرادوں۔ کلیم میں شائع شدہ مضمون نے میرے نیم خفتہ ارادہ کو جگادیا اور میں نے غزل اور دور حاضر (یعنی ۱۹۳۶ء) میں وہ جن منزلوں سے گذر رہی تھی اس کا ایک وجدانی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک بہت بڑا مقالہ تیار ہوگیا۔ جو رسالہ نگار میں حضرت نیاز فتح پوری کے زیر ادارت شائع ہوا۔

میرے اس مقالہ سے کئی بلند ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ پروفیسر عندلیب شادانی نے رسالہ 'ساقی' میں مسلسل مضامین لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوکر کئی سو صفحات میں سما سکے۔ میں نے اپنے مقالہ میں بیسویں صدی کی دوسری تیسری اور چوتھی دہائی میں اردو غزل کی قدروں اور کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس تہائی صدی کے عرصہ میں اردو غزل کے جن مشاہیر کا میں نے ذکر کیا تھا، وہ تھے حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی اور جگر مرادآبادی پروفیسر شادانی نے اپنے مضامین میں غزل کی قدر وقیمت کو تو تسلیم کیا لیکن میرے ممدوح شعرا پر اعتراضوں کی زبردست بھرمار کردی۔ بہرحال پورے سال بھر تک کئی ہزار ہم وطن غزل کے مبحث پر سوچنے اور غور کرنے کا موقع وسامان پاتے رہے۔

ہماری زندگی، شعور وجدان اور ہماری تہذیب میں غزل کا کیا مقام ہے اور انہیں سنوارنے

www.taemeernews.com

میں یا ان کی داخلی ضرورتوں کی تکمیل میں غزل کا کیا حصہ ہے۔ اس مسئلہ پر میں نے اپنے مقالے میں بحث کی تھی۔ عموماً غزل کے خلاف مندرجہ ذیل اعتراضات غزل کے مخالفین پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ غزل کے اشعار میں تسلسل و ربط نہیں ہوتا۔ غزل سے ذہنی اور جذباتی انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ غزل گو اپنے حقیقی محسوسات و جذبات غزل میں قلمبند نہیں کرتا بلکہ قافیوں کو پہلے سے سادہ صفحہ پر لکھ کر بندھے ٹکے رسمی مضامین میں انہیں قافیوں کو باندھ دیتا ہے یہ حقیقی و خلاقانہ شاعری نہیں ہے۔

۳۔ غزل میں شریفانہ جذباتِ محبت کے بدلے رکیک، پست اور بے غیرت جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ غزل میں محبوب کا تصور غیر فطری و مخرب اخلاق ہے۔ مرد کو امردوں کا عاشق بنا کر غزل میں پیش کیا جاتا ہے جو ایک بڑی گھناؤنی بات ہے۔

میں نے اپنے مقالے میں ان کا سچائی سے جواب دینے کی کوشش کی ہے مجھے کہاں تک اس کوشش میں کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اس کتاب کا ہر پڑھنے والا خود سوچ سمجھ کر کرے گا۔

میرا یہ مقالہ اب سے اندازاً بیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس وقت کے جن مشاہیر غزل کا ذکر میرے مقالے میں ہے ان میں حسرت، فانی اصغر اب دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ جگر اور یگانہ ہماری خوش قسمتی سے اب بھی ہمارے درمیان ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ بھی اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۳۶ء سے اب تک ان مشاہیر کے علاوہ اردو شاعروں کی واقعی بہت بڑی تعداد میں غزلیں کہی جا رہی ہیں۔ ان غزلوں کو دیکھ کر جو باتیں محسوس ہوتی ہیں اور جو نتائج ہمارا ذہن مرتب کرتا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ خیال، جذبہ اور طرز بیان میں عموماً سچائی و سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ شعرا اپنی غزلوں میں ایک سطح کو قائم رکھتے ہیں اور اس سطح سے بہت کم نیچے اترتے ہیں۔

۲۔ مضامین و زبان کے لحاظ سے فرسودگی، بے کیفی اور رسمی انداز بیان سے یہ غزلیں عموماً پاک رہتی ہیں۔ نئے ڈھنگ سے بات کرنے کی صلاحیت کا ثبوت ان غزلوں میں اکثر ملتا ہے۔ ادبی کاریگری کے لئے نئے نمونے گزشتہ پندرہ بیس برس کی غزل گوئی میں اکثر دیکھنے میں آئے ہیں۔ اس طرف کی غزلوں میں بسا اوقات غیر مروف غزل کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ قافیہ و ردیف کی کئی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ زمینیں بھی آج کل کے غزل گو شعراء نئی پیدا کرتے ہیں۔ آج کل کی غزل کا لب و لہجہ پچھلے ادوار کی غزلوں کے لب و لہجہ سے نمایاں طور پر مختلف نظر آتا ہے۔

۳۔ اس دور کی غزل گوئی سنجیدہ اور ہموار ضرور ہے۔ خیالات و جذبات میں صداقت و خلوص اور بسا اوقات جدت تو ضرور ملتی ہے لیکن وجد آفرینی، کیفیت گھلاوٹ تاثیر، ترنم، آفاقیت، گہرائی و بلندی عموماً نظر نہیں آتی۔ شاعر کی پوری شخصیت کسی حقیقت میں تحلیل ہو جائے ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سپردگی غزل کی جان ہے محویت غزل کا ایمان ہے، یہ چیزیں اس دور کی غزل گوئی میں ذرا کم ہی نظر آتی

www.taemeernews.com

ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کل کی غزل گوئی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے شاید کچھ زمانے کے بعد کوئی ایسا غزل گو شاعر پیدا ہو جسے ہم میر و غالب کا ہم مرتبہ سمجھ سکیں۔

۴۔ اردو میں آج کل رسالوں کی ایک وبا آ گئی ہے۔ کئی رسالے محض فلمی و جاسوسی ہیں یا سنسنی خیز عشقیہ افسانوں پر مشتمل ہیں۔ ان رسالوں میں غزلیں بھی ہوتی ہیں جن میں رکاکت نہ سہی لیکن رقاقت ضرور ہوتی ہے۔ ایک بری قسم کی سبکی و سطحیت اور ہیجان قسم کی چوما چاٹی یا رنگ رلیاں ان رسالوں کی غزلوں میں نظر آتی ہیں۔

۵۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے کچھ شاعروں کو ترقی پسند غزلیں لکھنے کی طرف مائل کیا۔ ایسی غزلوں میں کامیاب تغزل صرف کبھی کبھی نظر آتا ہے۔ لیکن اس دور کی غزلوں میں بہت بڑی تعداد ایسے اشعار کی ملتی ہے جو اچھے بھی ہیں اور اس دور کے نظریات حیات اور مسائل حیات کی کامیاب ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے اب تک کی غزلیں یا ان کی ایک خاصی تعداد دور حاضر کی اردو نظم گوئی بلکہ پورے اردو ادب کے ترقی پسندانہ رجحانات کا ساتھ دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

غزل گوئی ہو یا نظم نگاری، دونوں کے لئے جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں سپردگی و محویت کی آخری منزلوں تک شاعر کو پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ حیات و کائنات کا سنجیدہ اور رچا ہوا شعور ان پر اٹل ایمان اور ان کے لئے اس حد تک وجد آفریں جذبات جنہیں پرستش کے جذبات کہنا بے جا نہ ہوگا زندگی کی انتہائی طہارت اور پاکیزگی کا احساس، زندگی کی بلند ترین قدروں کا شعور میں منعکس ہونا۔ مانوس امور کے ایک معجزہ ہونے کا احساس انتہائی اضطراب کا انتہائی سکون بن جانا ہے۔ ان میں سے کچھ باتیں جو بلند شاعری کو جنم دیتی ہیں۔ تنقید حیات اسی وقت وہ بلند سنجیدگی حاصل کر سکتی ہے جو آفاقی ادب کا طرہ امتیاز ہے۔ آج کے اردو غزل گو یا نظم گو شعرا میں ایسے بہت کم ہیں جن میں یہ صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ہماری زندگی ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے۔ گھریلو زندگی تعلیمی اداروں کی زندگی، سماجی و سیاسی زندگی، اقتصادی زندگی سب کی سب اس بحران کا شکار ہیں جس پر فتح پائے بغیر وہ ذہنی و شعوری طمانیت نصیب نہیں ہو سکتی جس کے بطن سے بڑا ادب جنم لیتا ہے۔

الہ آباد۔ ۳۔ اگست، ۱۹۵۵ء

● فراق گورکھپور

● فراق کا یہ مضمون ''اردو غزل گوئی'' ادارۂ فروغ اردو لاہور سے ۱۹۵۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

www.taemeernews.com

مقدمہ

● اردو غزل گوئی پر یہ مضمون ہمارے عزیز دوست جناب فراق گورکھپوری کا ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ مئی کے رسالہ کلیم میں کسی صاحب کا مضمون نقاد کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں آزاد انصاری کے ایک مضمون کو سامنے رکھ کر جس میں غزل گوئی کی حمایت کی گئی تھی، نہ صرف آزاد بلکہ تمام غزل گو شعراء کا ذکر لب لعل شکر خارا سے کیا گیا تھا۔

مجھے اس مضمون کا علم فراق صاحب ہی کی تحریر سے ہوا، کیونکہ اس وقت تک کلیم کا یہ پرچہ میری نگاہ سے نہ گزرا تھا۔ بعد کو میں نے بھی اسے دیکھا اور آخر کار فراق اس کے لئے تیار ہو گئے کہ وہ اس کا جواب لکھیں۔ پھر اگر یہ جواب صرف اسی طرح کی دشنام طرازی پر مشتمل ہوتا جو نقاد کے مقالہ کی اصلی بیک گراؤنڈ ہے تو شاید میں اسے شائع نہ کرتا، لیکن چونکہ یہ مقالہ نفس غزل گوئی پر انتقادات عالیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ (جس کی مجھے جناب فراق سے پوری توقع تھی اس لئے میں اسے شائع کرتا ہوں۔)

فراق کی غزل گوئی پر میں جون کے رسالہ میں ایک سرسری نگاہ ڈال چکا ہوں جس سے قارئین نگار کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ذوق کے لحاظ سے ان کی شاعری میں کتنی پاکیزگیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ راز میرے سوا شاید کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا ذوق تغزل ثانوی چیز ہے اور پہلی چیز جو قدرت نے ان کو عطا کی تھی وہ غیر معمولی سلیقہ انتقاد ہے۔

ایک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لئے ذہن جس توازن و تعادل (Equilibrium) کو چاہتا ہے، اس کے عطا کرنے میں فطرت بہت بخیل واقع ہوئی ہے اور معلوم نہیں کتنے ہزار ذہن دماغ پیدا کرنے کے بعد انتہائی پس و پیش کے ساتھ وہ کسی ایک کا انتخاب اس ودیعت کے لئے کرتی ہے اور مجھے یہ ظاہر کرنے میں قطعاً تامل نہ کرنا چاہئے کہ اس وقت فراق بھی منجملہ ان چند نفوس کے ہیں جو قدرت کے اس عطیہ پر عرفی کی زبان میں بجا طور سے کہہ سکتے ہیں:۔

دراں دیار بہ سود اردو دلم کہ دہند
جوئے ملال بہ عمر ابد بہ بسیاری

آپ یہ سن کر غالباً حیرت کریں گے کہ انتقادی ذوق، شعر گوئی سے بالکل علیحدہ چیز ہے، یہاں تک کہ ایک بہترین شاعر بھی اس کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھا نقاد ہے میر کو دنیا خدائے سخن مانتی ہے، لیکن جب یہ خدائے سخن خود اپنے کلام کا انتخاب کرتا ہے تو یہ پیغمبری کے درجہ سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے اور

www.taemeernews.com

خود اسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس کے بہترین اشعار کونسے ہیں۔

مجھے فراق کی اس خصوصیت کا علم آج نہیں بہت عرصہ سے تھا۔ اسی وقت سے جب اول اول میں ان سے یہاں لکھنؤ میں ملا تھا اور سمجھتا تھا کہ ان کے اس ذوق کا کسی نہ کسی دن پختہ ہو کر ظاہر ہو جانا لازم ہے اور آخر کار، آبگینہ کو تندی صہبا سے پگھل جانا پڑا۔

اس مقالہ میں فراق کا خطاب یوں تو بظاہر نقاد سے ہے، لیکن ان کا مقصود فی الحقیقت تمام ممکن زاویوں اور پہلوؤں سے غزل گوئی پر روشنی ڈالنا ہے۔ اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس فرض سے عہدہ بر آ ہونے میں انہوں نے وسعت و گہرائی کی کسی حد کو مس کئے بغیر نہیں چھوڑا، اور فطرت اور آرٹ سے متعلق تغزل کی جو معیاری خصوصیات ممکن ہیں، ان سب کا احاطہ کر لیا ہے۔

کچھ زمانہ سے ہندستان میں نظم گو شعراء کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنی منظومات سے زبان و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ نظم کہنے والے کو غزل گو سے یا غزل گو کو نظم نگار سے عناد کیوں ہو۔ تاہم غور کرنے سے اس کا ایک نفسیاتی سبب متعین کیا جا سکتا ہے۔

نظم کی ابتدا کا زمانہ اردو شاعری میں اس وقت سے ہوتا ہے، جب ملک انتہائی نکبت و ذلت کے دور سے گزر رہا تھا اور نہایت ضعیف سا احساس اس انحطاط کا مفکرین ملک کو پیدا ہو چلا تھا۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ نظم نگاری کی بنیاد کا سبب احساس کی وہ ضرب کاری تھی جس نے دفعتاً ارباب وطن کو ایک جگہ ٹھہر کر سوچنے اور زندگی کے ہر شعبہ میں عمل کی نئی راہیں ڈھونڈھنے پر مجبور کر دیا۔

انہیں سوچنے والوں میں ایک جماعت شعرا کی بھی تھی جنہوں نے ملک کے عام انحطاط سے متاثر ہو کر اپنے دائرہ کے اندر بھی یہ غور کرنا شروع کیا کہ آخر ہمیں کیا کرنا ہے؟، پھر چونکہ اس دوران میں مغربی تعلیم کے اثرات بہت کافی پھیل چکے تھے اس لئے ان کو اس نئی راہ متعین کرنے میں زیادہ دشواری پیدا نہیں ہوئی اور بجائے غزلوں کے قومی نظموں کی طرف عام توجہ پیدا ہو گئی اور اسی سلسلہ میں آہستہ آہستہ محاکاتی، جذباتی اور غنائی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں۔

پھر ان نظم کہنے والوں میں دو قسم کے شعرا تھے، ایک وہ جو اچھے غزل گو تھے اور دوسرے وہ جو غزل تو اچھی نہ کہہ سکتے تھے، لیکن نظم کچھ بہتر کہتے تھے۔ اس لئے اول الذکر جماعت میں تو اس بنا پر کہ وہ غزل و نظم دونوں خوب کہتے ہیں اور موخر الذکر گروہ میں اس لئے کہ وہ کامیاب نظم گو ہیں، افتخاراً ایک جذبہ تفوق پیدا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اس پندار سے کہ ایک نظم گو کا نام قومیات کے سلسلہ میں بھی آ جاتا ہے، ایک عام بیزاری غزل کی طرف سے پیدا ہو گئی اور تغزل بے موسم چیز سمجھا جانے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ احساس غلط نہ تھا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ غزل گوئی

www.taemeernews.com

لغو مہمل چیز ہے اور اس میں ترقی کی گنجائش نہیں۔ فکر و خیال کی انتہائی بے اعتدالی ہے۔ چنانچہ اس کی تردید خود اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ گذشتہ ربع صدی کے اندر اگر منظومات کا اچھا ذخیرہ اردو میں آ گیا ہے تو غزلیات کا اس سے بہتر فراہم ہو چکا ہے اور اس سے بہتر ردعمل انحطاطِ غزل گوئی کا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ فاضل انتقاد نگار نے منجملہ اور تمام باتوں کے اس مسئلہ پر بھی کافی شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ جو اہل تغزل کی طرف سے بہترین دفاع (Defence) کی صورت رکھتی ہے۔

نظم لکھنے والوں کی یہ کوشش کہ غزل گوئی مٹ جائے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا تعلق انسان کے ان جذبات سے ہے جو تمدن کے ہر دور میں پائے جائیں گے اور جن کا تعلق انسان کے اس احساس سے ہے جو نشر و اشاعت کو پسند نہیں کرتا۔ پھر اگر انسان کو اس بات پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے چوٹ لگے اور محسوس نہ کرے تو بیشک آپ تغزل کو بھی دنیا سے محو کر سکتے ہیں۔ ورنہ ایسا خیال کرنا یکسر طلب محال ہے۔ نظم و غزل دونوں آہنگ رکھتے ہیں لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ آہنگِ نظم ایک ملکیت عامہ کی شکل رکھتی ہے اور آہنگ غزل بالکل خاصہ کی چیز ہے۔ اس کا مقصود دوسروں کے کانوں تک پہونچنا ہے، اس کا صرف اپنے سامع کو متاثر کرنا، اس میں ہنگامہ کی کیفیت ہے، اس میں سکون کی، وہ ایک رائے زنی ہے جو انتقاد و تبصرہ چاہتی ہے اور یہ اس سے بے نیاز ہے۔ اس میں تحریک پیدا کرنے کے لئے دوسروں کے جذبات کی شرکت ضروری ہے اور اس میں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں، اس کی تحلیل کے بعد ایک صدائے بازگشت پیدا ہوتی ہے اور اس کے تجزیہ کے بعد صرف کراہ یا وہ ایک ایسا دریا ہے جو چٹانوں سے ٹکراتا ہوا گزرتا ہے اور یہ ایک ایسا چشمہ ہے جو ساحل کی جھاڑیوں کو چھوتا ہوا خاموش گزر جاتا ہے۔ بہ حالت مسرت اگر وہ قہقہہ ہے تو یہ صرف تبسم اور بہ صورت الم پزیری اگر وہ فریاد ہے تو یہ محض آہ سرد۔ وہ بغیر خیال آورد کے از خود وجود میں نہیں آتی اور یہ صرف آمد ہے جس میں بسا اوقات قصد و ارادہ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ موسیقی دونوں میں ہے لیکن فرق گانے اور گنگنانے کا ہے کہ اس سے مقصود دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے اور اس سے خود متاثر ہونا۔ فنی رکھ رکھاؤ کا دونوں میں لحاظ رکھنا ضروری ہے لیکن اس پر فن غالب آ جاتا ہے اور یہ فن پر فکر و تامل (Musing) دونوں کے لئے درکار ہے لیکن اس میں متعدی ہے اور ایک خاص حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، اس میں یہ کیفیت ذرا انفعالی صورت رکھتی ہے اور اس کی حد کو ہم صرف لانہایت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

الغرض غزل اور نظم میں بہت فرق ہے لیکن یہ فرق ایسا ہی ہے جیسا ایک آغوش میں پلنے والے دو بچوں کا کہ ان میں سے کسی ایک کا صدمہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اس لئے کہ اگر نظم نگار شعراء، غزل گو حضرات کو برا کہتے ہیں تو اس کو طفلانہ وحشت کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ منظومات کے اکثر وہی اشعار اثر انداز ہوا کرتے ہیں جن کو ہم نظم سے علیحدہ کر کے ہر وقت غزل مین شامل کر سکتے

www.taemeernews.com

ہیں، اور غزل کے وہی ابیات مکمل سمجھے جاتے ہیں۔ جو مجرد حسن و عشق کے حدود میں پہنچ کر وہی وسعت اختیار کرلیں جس پر منظومات کی کامیابی کا انحصار ہے۔ لیکن اگر مجھے مجبور کیا جائے کہ میں ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دوں تو میرا فیصلہ یقیناً غزل کے حق میں ہوگا کیونکہ صحیح معنے میں شاعری کی ابتدا دنیا میں غزل سے ہوئی ہے اور اس کا تعلق ایک ایسے فطری جذبہ سے ہے جس کی تکمیل پختگی کے لئے من وتو کے سوا کسی تیسری چیز کی ضرورت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات تو من بھی غائب ہوجاتا ہے اور صرف تو رہ جاتا ہے۔ بر خلاف اس کے نظم کا کاروبار اسباب کا بہت تنوع چاہتا ہے اور وہ محتاج ہے قوت مشاہدہ کا کہ اگر مدرکات و محسوسات دونوں کو مٹا دیجئے تو نظم حیز وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔

علاوہ اس کے جب ہم واقعات وحالات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندستان میں وہ شعرا بہتر نظم لکھنے والے ہیں جو کسی وقت اور شاید اب بھی بہترین غزل کہہ سکتے ہیں، اس لئے نظم کی کامیابی تو بغیر تغزل کے لگاؤ کے ممکن نہیں اور غزل گوئی اس کی محتاج نہیں۔ یہ ایک دبستانی چیز ہے جو شاعر میں نظم لکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اور اس منزل سے گزرے بغیر مقصود تک پہنچنا دشوار ہے۔ یہی اور اس سے بہت زیادہ باتیں ہیں جنہیں فراق نے اپنے مقالہ میں نہایت دقیقہ سنجی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس حد تک مفہوم ومعنیٰ کا تعلق ہے یہ مقالہ اپنی نوعیت کا بالکل پہلا مقالہ ہے جسے نثر نگاری سے قطع نظر صرف اس کی معنویت کے لحاظ سے بار بار مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

● نیاز فتح پوری

اردو غزل گوئی

● مئی کے کلیم میں حضرت نقاد کا مضمون غزل گوئی کے عنوان پر میں نے بھی پڑھا مضمون بہ ظاہر بہت گرمجوشی سے لکھا گیا ہے۔ لیکن مقالہ نگار اگر اظہار عتاب میں اس قدر بے اختیار نہ ہوجاتے تو بہتر تھا۔ طاقت واثر کا راز اعتدال ہے۔ نرم وشستہ انداز بیان اختیار کرکے وہ اپنے مضمون کی شان اور اس کا اثر بڑھا سکتے تھے۔ اگر حکیم آزاد انصاری کے دیباچہ میں بھی سخن گسترانہ بات آگئی تھی تو اتنی جلی کٹی سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر حضرت آزاد وانصاری نے غزل ہی میں سہی کچھ ایسے اشعار تو ضرور کہے ہیں جو غالباً حضرت نقاد کے نزدیک بھی پاکیزہ اور بلند ادبی مذاق کے نمونے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ صاحب مضمون کا مطلب غزل سے ہے کیا۔ کیا ان کا مقصود صرف حضرت آزاد کی غزلوں سے ہے۔ یا اردو غزل گوئی کی ابتدا سے اب تک ہزاروں بلکہ لاکھوں تک بند، کمزور اور

www.taemeernews.com

ناکامیاب غزل گویوں سے ہے یا کئی سو محض وقتی اور مقامی استادوں اور کہنہ مشقوں سے ہے یا اردو کے معدودے چند چوٹی کے متغزلین سے ہے، یا سعدی اور حافظ شیرازی وغیرہ کو بھی وہ قابل عتاب ٹھہراتے ہیں؟ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے واضح ہے کہ وہ ہر غزل گو بلکہ نفس غزل و غزلیت سب سے بیزار ہیں، موصوف حضرت آزاد کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں:

آزاد صاحب کہتے ہیں۔ ایک اعتراض غزل پر یہ ہے کہ غزل کا وجود فارسی و اردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں پایا جاتا۔ بلاشبہ یہ اعتراض ہے لیکن مطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصور میں نہیں بلکہ متعارف و متداول غزل پر بے ربط و بے آہنگ غزل پر متضاد و باہم متصادم غزل پر! قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر، — نہ کہ اس غزل پر جو ہے۔

افسانۂ آں شبے کہ بایار گزشت
سخن شناس نہ "دلبرا خطا اینجا است"

موصوف آخر کہہ کیا رہے ہیں؟ کسی کی غزل ہی کا ایک شعر ہے جو برجستہ یاد آ گیا:۔

چھیڑ دینا تھا کہ بھر مارتھی دشناموں کی
ایک صیغہ تھا کہ فرفر اسے گردان گئے

اندھیر تو یہ ہے کہ ایک ہی سانس میں موصوف اپنی بات نہایت بے تکلفی سے کاٹ بھی جاتے ہیں۔ بلاشبہ اعتراض ہے۔ لیکن مطلقاً غزل پر لفظ مطلقاً پر نظر ڈالئے اور پھر لیکن کو دیکھئے۔ اس کے بعد مطلقاً کے ساتھ نہ کہ اس غزل پر کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے! ممکن ہے کہ موصوف نے مطلقاً غزل پر کے بجائے مطلقاً غزل پر نہیں۔ لکھا ہو خیر اس متضاد و باہم متصادم طرز دشنام کو نظر انداز کیجئے۔ اور اگر مطلقاً غزل پر کے بعد لفظ "نہیں" صاحب مضمون کے یہاں مان بھی لیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے حکیم آزاد کو اس غلط اور لوچ قسم کی غزل گوئی کا حامی کیونکر مان لیا اس سلسلہ میں ایک بات سے بہت کم لوگ واقف ہیں وہ یہ کہ غزل صرف فارسی و اردو کی چیز ہو، لیکن تنگنائے غزل میں تو محدود وسعتیں ہیں اور جاپان کی شاعری میں اس صنف کو کیا کہئے گا جس میں ہر شعر صرف آٹھ لفظوں میں ختم ہو جاتا ہے اور بجائے خود ایک مستقل نظم ہوتا ہے اسی طرح مذہبی کتابوں کی غیر مربوط اور کہیں کہیں متضاد و تصادم عبارتوں کو کیا سمجھا جائے ہندی دوہوں کو کیا سمجھا جائے متضاد اور متصادم اور یک رنگی کے پیچیدہ اور نازک مسئلہ پر میں کچھ اور کہوں گا۔ اس وقت جب میں ردیف و قافیہ و بحر کے سلسلہ میں تناسب اور سانچہ (یعنی Pattern) کا ذکر کروں گا۔

میں پہلے یہ بتا دوں کہ کامیاب لطیف اور بلند نظم ہو یا غزل یا شعر میں سب کی دل سے قدر کرتا ہوں کیونکہ میں سب میں اپنی روح کے لئے غذا اور اپنے وجدان کے لئے سامان کیف و سرور پاتا ہوں۔

www.taemeernews.com

حالی اور آزاد کے وقت سے تو اردو نظم کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا ہے اور یہ دور آج اپنی پوری جوانی پر ہے۔ لیکن لوگ اس بات کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ نظم (بری بھلی دونوں قسم کی) اردو شاعری کے آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اور یہ سمجھنا تو سخت گمراہی ہے کہ دور حاضر میں اردو نظم نے تو ترقی کی لیکن اردو غزل محض جھک مار رہی ہے اور قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی، کی مصداق بن رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور غزل کے لئے بھی ٹھیک اسی طرح نشاۃ الثانیہ ثابت ہوا ہے جیسا نظم کے لئے۔ سنئے حقیقت کیا ہے۔ داغ کے بعد دلی میں شمع سخن اگر بجھی نہیں تو اس کی لو اداس اور افسردہ ضرور ہوگئی تھی۔

لیکن امیر مینائی کے بعد لکھنؤ میں خدنگ نظر کے مشاعروں نے اردو غزل گوئی میں نئی روح پھونکی۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ قالب غزل میں اہل لکھنو نے مریض کی آہ سرد اور فاسد ہوائیں، اور مہلک جراثیم بھی بھر دئے۔ اسی زمانہ سے اردو غزل کا جذباتی اسکول (Sentimental School) قائم ہوتا ہے اور جیسا ہر اسکول کا قاعدہ ہے اس کے اہل کمال تو اعجاز بیان کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتے ہیں (حالانکہ کبھی کبھی اہل کمال بھی اس کی بدترین مثالیں پیش کرتے ہیں) لیکن نقال جھک مارتے ہیں۔ اس اسکول کا سب سے زبردست نمائندہ عزیز لکھنوی ہے — سنئے:

شمعیں افسردہ جہاں ، پھول ہیں پژمردہ جہاں
دل کو اس گور غریباں میں پکارا ہوتا

ہاں نہ چھیڑو اے طلبگارانِ سامانِ نشاط
ہم یونہی اپنے تصور سے بہلتے جائیں گے

عمرِ عزیز گزری حسرت پرستیوں میں
ایسی بھی زندگی کا یارب حساب ہوگا

ہنس رہا ہے دیر سے یہ کون تجھ کو دیکھ کر
سر اٹھا اے دل سے باتیں کرنے والے سر اٹھا

یہ ہیں جذباتی اسکول کی شاعری کے بہترین اور لطیف ترین نمونے لیکن باکمالوں اور نقالوں دونوں کی لغزشیں دیکھئے۔ بیخود لکھتے ہیں:۔

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاک نشیمن پر

www.taemeernews.com

موصوف نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاست بیان، سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں مگر یہی جزئی ''خوبیاں'' اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں۔ غزل میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک اور اہم ذمہ داری لینا ہے جس کی کامیاب مثالیں ملاحظہ ہوں:

بنال بلبل اگر بامنت سرِ یاریست
کہ ما دو عاشق زاریم وکارِ ما زاریست

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

دوسرا مصرع یوں ہوتا تو غالباً شعر میں رونے کا اثر بڑھ جاتا:

کبھی روئے کبھی چپ ہو رہے شاخ نشیمن پر

دو شعر حضرت صفی کے بھی سنئے:

دیکھئے کیوں، کوئی تربت ہوگی
آپ کو مفت ندامت ہوگی

یہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شب فرقت کا غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

عزیز کا جو پہلا شعر میں نے نقل کیا ہے اس کو حضرت صفی کے شعر کے ساتھ پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ عزیز کے شعر میں جذبہ رقیق اور کمزور نہیں ہونے پاتا لیکن حضرت صفی کے دونوں اشعار میں رقاقت (رقت نہیں) اور کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔ پہلا شعر ایسے اشعار کی یاد دلاتا ہے:

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

یا

رات کا خواب الٰہی تو بہ
آپ سنئے گا تو شرمایئے گا

جذباتی اسکول کے شعرا میں عزیز کے بعد حضرت محشر ابتذال سے محفوظ ہیں۔ ان کا یہ شعر دیکھئے:

www.taemeernews.com

فقط اک گور ہے آگے خدا کا نام اے محشر
کسی سے حالِ اربابِ عدم دیکھا نہیں جاتا

حضرت ثاقب لکھنوی بھی اس اسکول سے کچھ الگ اور کچھ متاثر ہیں۔ ان کا یہ شعر دیکھئے:

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے

میری غرض یہ ہے کہ اس اسکول میں نزع، ماتم مرگ، جنازہ، گور غریباں، رونا دھونا عام موضوعات شاعری ہیں لیکن ان پر لطیف شعر کہنا بہت نازک کام ہے۔ ذرا پھسلے کہ کیچڑ سے لت پت ہو گئے۔ بات تو میں نے کہہ دی مگر سوال یہ ہے کہ اس اسکول کی شاعری میں سوائے اول درجے کے اشعار کے دویم درجے کے اشعار بھی ابتذال میں کیوں پڑ جاتے ہیں؟ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اس اسکول میں غزل کا حسن رعنائی و دلفریبی کا سا حسن ہے جو ایک ایسے حسین نازک اندام نوجوان میں نظر آتی ہے۔ جسے تپ دق ہو چکی ہو اور جس کے چہرے کی سرخی صحت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ مرض کی دھیمی آنچ کی وجہ سے ہو چہرے کی یہ سرخی حقیقتاً احتراق کی سرخی ہے اور یہ نزاکت اس لاغری اور کمزوری کی وجہ سے ہے جو مریض کو گھلا رہی ہے۔ پھر چونکہ مدقوق کی یہ حالت سوز و ساز سے خالی نہیں اور اس میں موت کی دلفریبی پائی جاتی ہے اس لئے اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو ایک جھلملاتی ہوئی شمع اور مرجھائی ہوئی کلیوں کا سا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ جو نزاکت و لطافت سے خالی نہیں لیکن جہاں شاعر سے ذرا لغزش ہوئی اور گڈھے میں گرا یہ ایک انحطاطی دور کی شاعری تھی اور اس کا نباہنا بہت مشکل تھا۔

اس کے برعکس داغ اور امیر کا جو رنگ تھا اس میں باوجود سوقیت اور تصنع کے ایک امنگ اور زندہ دلی اور البیلا پن ہے۔ ظاہر ہے کہ داغ اور امیر کے نقال ان باکمالوں کی شاعری کا پورا چربہ تو کیا اتارتے لیکن چونکہ یہ شاعری اتنی نازک ولطیف اور احتیاط طلب نہ تھی۔ اور یہاں پھسلنے میں بھی وہ کیفیت تھی جب پھسلنے والا اور دیکھنے والے دونوں قہقہے لگاتے ہیں اس لئے — آپ پیام یار کے پرانے پرچے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ امیر اور داغ کے ساتھ ساتھ ساری دنیا شاعر، ہوگئی ہے اور سب کے جیب و دامن پر ہولی کا سرخ و زعفرانی رنگ نظر آ رہا ہے یہاں تک کہ معمولی تک بندوں کی شاعری اس معنی میں ہم کو بیزار نہیں کرتی جس معنی میں جذباتی اسکول کی شاعری کی مبتذل مثالیں بیزار کرتی ہیں ہنسی کھیل چھیڑ چھاڑ کی شاعری معمولی تک بندوں کے یہاں بھی اور کچھ نہ کرے گی تو گدگدا ضرور دے گی۔ ہنسنے میں اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں ہے جتنی رونے میں چنانچہ امیر اور داغ اور ان کے معاصرین جب گرتے ہیں تو بھی ذلیل نہیں معلوم ہوتے صرف مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں اور ان کی یہ مضحکہ خیز (Doggerel) شاعری اتنی گری اور گھنونی نہیں معلوم ہوتی جتنی ماتم اور رقت والی شاعری کی ہچکیاں اور

www.taemeernews.com

سینہ کوبیاں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اردو غزل گوئی میں کوئی رنگ لے لیجئے۔ میر درد، غالب، آتش یا آج کل کے مشہور غزل گو حسرت موہانی، یگانہ، اصغر، جگر، فانی، اقبال وغیرہ ان سب کا مخصوص رنگ ناکامیاب شکل میں بھی ماتم وسینہ کوبی والی شاعری کی بگڑتی شکل کی طرح متبذل نہیں نظر آئے گا۔

میں نے یہ باتیں کیوں کہیں؟ اس لئے کہ آج کل مطلقاً غزل یا متعارف ومتداول غزل دونوں پر لوگ جلدی سے اظہار رائے کر دیتے ہیں۔ اور تنقید کی پیچیدگیوں اور ذمہ داریوں سے جان بچا کر مسائل کو سہل وصاف سمجھ لینے کی فطری لیکن اہم غلطی کر جاتے ہیں۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے بڑے بڑے نقاد بڑے بڑے شاعر اور بڑے بڑے غزل گو یہاں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ غزل پر رواداری میں حکم لگانے، اس کو برا کہنے یا اس کی مدح کرنے سے بھی کام نہیں چلتا۔ یہ سب رائے زنی ہے۔ داد تنقیدیوں نہیں دی جاتی۔ غزل بہت دق کرنے والی چیز ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے مولانا حالی نے غزل کے خلاف جو آواز بلند کی تھی اور ڈاکٹر نذیر احمد اور دیگر مصلحان ادب وقوم نے جو غزل سے اظہار نفرت کیا تھا، اس میں یہ بزرگ ممکن ہے اپنی حد سے آگے بڑھ گئے ہوں لیکن اس کی وجہ پر ذرا غور کم کیا جاتا ہے۔ بات یہ تھی کہ ان بزرگوں نے اردو غزل پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اپنے وقت کی رائج اور مقبول عام غزل گوئی سے اظہار برہمی کیا ہے اور ایسا کرنا ضروری تھا۔ امیر وداغ کی عریانی وشوخی میں زندہ دلی ضرور تھی مگر یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری غزل گوئی آنچل اور محرم کے لئے وقف ہو جائے اسی زمانے میں خود حالی نہایت لطیف قسم کی غزل گوئی کر رہے تھے۔ مگر حالی کے اس شعر کے مقابلہ میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

داغ کے اس شعر پر مشاعرہ کی چھتیں اڑ جاتی تھیں۔

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

اسی زمانہ میں جلال نے سوز وگداز کا عنصر لکھنوی غزل گوئی میں سمونا شروع کر دیا تھا۔ تسلیم کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ آسی غازی پوری بقول مجنوں گورکھپوری کے اس دور میں ناسخ اسکول کے میر تھے۔ اس دور کا سب سے زبردست غزل گو شاد عظیم آبادی اردو غزل کو بام فلک تک پہنچا رہا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کنوئیں میں بھنگ پڑی ہوئی تھی اس کے سماوی نغموں کو سنتا کون۔ خود شاد نے امیر مینائی کو باصرار لکھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا فطری اور حقیقی غزل گوئی کی طرف دو چار کو چھوڑ کر کسی کی نظر ہی نہ تھی۔ یہ باتیں محرک ہوئیں حالی کے مقدمہ شعر وشاعری میں غزل کے خلاف اس اعلان جہاد کی جس کو آج نصف صدی بعد دہرانا ہنر ماسٹرس وائس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

www.taemeernews.com

حالی کے وہ اعتراض جو انہوں نے نصف صدی پہلے غزل پر کئے تھے ان کا آج دہرانا اس لئے غلط نہیں ہے کہ بات پرانی ہوگئی بلکہ حالی کے اعتراض آج اس لئے غلط ہیں کہ امیر و داغ کے بعد اردو غزل گوئی کے کئی دور ختم ہو چکے اور اس میں حیرت انگیز انقلابات پیدا ہو گئے ہیں۔ چوتھائی صدی تک تو جذباتی اسکول Sentimental School کا اثر قائم رہا اور اس رنگ کی بھدی اور ذلیل مثالوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس کے کامیاب کارنامے اہمیت سے خالی نہیں۔ حضرت نقاد ایک بار سر محمد اقبال کا وہ خط پڑھیں جو انہوں نے گلکدہ کے بارے میں عزیز کو لکھا تھا جس میں اقبال کہتے ہیں کہ آج کل اردو شاعری کی نظر معارف و حقائق پر ہے۔ گلکدہ اور خورشید محشر تو دو خالص کارنامے اس اسکول کے ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں غزلیں خدنگ نظر کے مشاعروں میں ایسی پڑھی گئیں کہ آج ان میں سے منتخب غزلوں کا مجموعہ نکال دیا جائے اور اس کا مقابلہ — پیام یار کے فائلوں سے کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اردو غزل گوئی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ یہ اسی اسکول کا اثر تھا کہ ریاض خیر آبادی، جلیل، مضطر خیر آبادی، داغ و امیر کے مقلد ہر درجہ کے تمام شعراء نے سنجیدہ طرز بیان ترک کر دیا اور اصلیت و اثر کی طرف مائل ہوئے۔ نوبت رائے نظر، پنڈت بشن نرائن درا برا اور چکبست کی غزلیں شروع سے سنجیدہ تھیں۔

یہ اسکول اپنا کام کر چکا اور اس کا اچھا حصہ اردو شاعری کو مستقل فائدہ پہنچا گیا۔ برا حصہ کچھ عارضی نقصان پہنچانے کے بعد اب مٹتا چلا ہے اور بہت جلد بھلا دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ دور آتا ہے جس میں اردو غزل گوئی لکھنو اور دلی کی تاریک گلیوں سے نکل کر دوسرے شہروں صحراؤں اور قید خانوں میں نئی آوازوں میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ چنانچہ بجائے لکھنوی اور دہلوی کہلانے کے چوٹی کے غزل گو حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور فانی بدایونی کہلائے۔ لکھنو میں رہ کر لکھنو کے جذباتی اسکول پر جس شخص نے دھاوا بول دیا وہ یگانہ چنگیزی تھے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے —— ان لوگوں میں حضرت نقاد نے فانی کو مرگھٹ کا رونے والا شاعر بتایا ہے معلوم نہیں کہ موصوف اگر Houseman کا "Shropshire" اور T.S.Eliot کا "Waste Land" اور Hardy کے "Wessex Poems" دیکھیں تو کیا کہیں گے۔ بچارے مرگھٹ کے ان شعرا کو تو پورے نظام شمسی پر ماتم کرنے والا بتائیں گے۔ آخر ایک نسائی ماتم اور فلسفیانہ یاس و غم میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ فانی کے یہاں لکھنوئیت، کہیں کہیں تیز رنگ میں ضرور نظر آتی ہے۔ مگر وہ اچھی نہیں ہے فانی کی طرز ذرا معتدل اور حلاوت لئے ہوئے ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن فانی کے نغمۂ غم میں اس کے مفکرانہ انداز کی اہمیت کو حضرت نقاد نے نہایت عجلت کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ فانی اپنے دور میں اردو کا پہلا غزل گو ہے جس کے یہاں فلسفیانہ احساس اور انداز بیان کا تیکھا پن پایا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

صاحب مضمون نے میرزا یاس یگانہ، جگر مرادآبادی، اور اصغر کی غزل گوئی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ لیکن حسرت موہانی کا ذکر ان کے یہاں بھی آ ہی گیا خواہ اسی وجہ سے سہی کہ حکیم آزاد انصاری نے اس بادشاہ متغزلین کا ذکر کر دیا ہے۔ حسرت کے ذکر سے حضرت نقاد، نے بہت رواداری میں پیچھا چھڑایا ہے یہ کہہ کر ''لیکن حسرت بھی بیسویں صدی کا شاعر کیوں کر مانا جا سکا ہے'' حضرت نقاد کے دل کا چور پکڑنا ہو تو لفظ ''لیکن'' اور لفظ ''بھی'' پر غور کیجئے میں نہایت ادب سے پوچھوں گا کہ حسرت کی زبان اور طرز ادا کیا اردو زبان کے ان ارتقائی مدارج کو طے کئے بغیر وجود میں آسکتی ہے جس کی درمیانی منزلیں مومن، جرأت، مصحفی، اور حسرت سے قبل کے تمام اردو شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ حسرت کے اسٹایل میں اردو غزل گوئی کی صدیوں کے مختلف اسٹایلوں کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی حسرت کے اسٹائل کی ندرت ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نفسیات عشق و حسن کو بے کم و کاست جچے تلے انداز سے پیش کرنا اور واردات نگاری کی اتنی کثیر مثالیں حسرت کے کلام میں ملنا نفسیات (Psychology) اور نفسیاتی واقعیت (Psychological realism) کے بغیر جو اپنی موجودہ شکل میں صرف دور حاضر کی چیز ہے ممکن نہ تھا، نفسیات اور خاص کر نفسیات حسن و عشق کے نظر انداز ہو جانے والے پہلوؤں کا تجزیہ و تحلیل مومن نے شروع کیا لیکن مومن کے یہاں اس کی مثالیں نہ اتنی کثرت سے ملتی ہیں اور نہ اس قدر نرم و آسان طور پر جتنی حسرت کے کلام میں نظر آتی ہیں اور نہ اس قدر نرم و آسان طور پر جتنی حسرت کے کلام میں نظر آتی ہیں یہ سب دور حاضر کے کرشمے ہیں۔ اس دور حاضر کے جسے کچھ لوگ سرے سے غزل کا زمانہ ماننے کو تیار ہی نہیں۔ اس دور حاضر کے جس میں کچھ لوگ سرے سے غزل کو بے وقت کی راگنی بتانا سنجیدہ ادبی تنقید سمجھتے ہیں۔

نقاد نے محسوس ہی نہیں کیا کہ حسرت کے سوانح حیات طرز زندگی اور حسرت کی غزل گوئی میں کس قدر لطیف ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور محسوس کرنا ممکن بھی نہ تھا کیونکہ حسرت کا احساس عشق اور نظریہ حسن و عشق ایک بیمار تخئیل کے بس کی بات نہیں فراق یار میں گھل گھل کر بستر مرگ اور گور غریباں کے ذکر سے معشوق کو متاثر کر کے حسرت شعر نہیں کہتا۔ پچھلی جنگ عظیم میں سپاہیوں کے پاس کثرت سے کتابیں بھیجی جاتی تھیں لیکن یہ بہادر حسن و عشق کی نظموں اور افسانوں پر جان دیتے تھے۔ درسِ عمل اور ضرورت ملک و قوم والا ادب نہیں پڑھتے تھے۔ میں پھر کہوں گا کہ نپولین کو جوزیفائیں کی اداؤں میں کرشن کو رادھا کی کشش میں انٹونی کو کلیوپیٹرا کی دلفریبیوں میں پرتھوی راج کو سنجوگتا میں جو بات ملتی تھی وہ دیوان حسرت میں ہے۔ اگر عشق کی زندگی اور عشق کی شاعری میں بگڑی ہوئی اور ذلیل مثالیں ملتی ہیں۔ تو عمل کی زندگی سیاسیات کی زندگی، اقتصادیات کی زندگی، خدمت خلق، کی زندگی، اصلاح اور انقلابات کی زندگی میں بھی اتنی کثرت سے رکیک مثالیں نظر آجاتی ہیں کہ دنیائے عمل ظلم و حماقت اور رکاکت کے سوا اور کچھ نہیں معلوم

www.taemeernews.com

ہوتی ہے۔ پیام عمل کی شاعری بھی سمع خراش چیخ پکار، رجعت پسندی، حجازیت اور فرقہ پرستی ہو کہ رہ گئی ہے۔ بری غزل کی بہترین اصلاح اچھی غزل ہے اور بری نظم کی بہترین اصلاح اچھی نظم، عمل اور جدو جہد ہر شکل میں اچھی چیز نہیں ہے۔ انقلاب فرانس اور انقلاب روس بھی انقلابات رجعی (Counter Revolution) کے خطروں سے دوچار ہیں۔ ہندستان کی جنگ آزادی بیکار رہنے والی قوم کے مقابلہ میں نہیں ہے جس طرح انفرادی اور اجتماعی حیات کو صحیح عمل کی ضرورت ہے اسی طرح اسکو صحیح معنی میں عشق کی بھی ضرورت ہے اور حسن و عشق کی معنویت کی ترجمانی جس لطیف انداز اور جس نشریت سے غزل کر سکتی ہے وہ قدر اول کی چیز ہے۔ حسرت کا شعر ہے:

کسی پر مِٹ کے رہ جانا ہے حسرتؔ
ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

ذرا اس شعر کا جواب سوچ کر نکالئے لیکن غزلوں میں نہیں دیگر اصناف سخن میں شاید حضرت نقاد مٹ کر رہ جانا کے معنی فراق یار میں گھل گھل کر مر جانے کے لیں گے۔ یہ نہ سہی لیکن یہ شعر بھی بیسویں صدی یا دور حاضر کی شاعری کہاں ہے۔ معلوم نہیں حضرت جوشؔ کا مشہور نظم ''سہاگن بیوہ'' جس میں ستی کی پرانی رسم اور بابا تلسی داس کا حال درج ہے، اسے جناب نقاد کس سدی کی چیز بتائیں گے؟

کہا جاتا ہے کہ غزل بڑی پٹی ہوئی چیز ہے نہایت فرسودہ و پامال صنف سخن ہے اس کے کل امکانات ختم ہو چکے اور حسن و عشق کا مضمون اب کوئی باقی نہیں رہا اس لئے حضرت نقاد غزل کو اس طرح دفن کرنا چاہئے ہیں جس طرح کچھ لوگ ایک فرضی جنازہ نکال کر موسیقی کو عہد اورنگ زیب میں دفن کر دینا چاہتے تھے جس پر اورنگ زیب نے کہا تھا کہ ہاں ایسا دفن کرو کہ پھر اٹھے۔ ایسے لطیفے اور ایسی بذلہ سنجیاں بغیر غور فکر کے اس شخص کے شایان شان نہیں جو اپنے کو نقاد لکھے۔ حضرت نقاد کو اپنے زعم میں یہ بتانے کی بھی فرصت نہ ملی کہ وہ ولی اور میر اور غالب سے لے کر اب تک کی متعارف اور متداول غزلیں دفن کرنا چاہتے ہیں یا مطلقاً غزل کو اور اپنے وسیع ترین خیال والی غزلوں کو یا حضرت جوش ملیح آبادی اور اقبال کی غزلوں کو یا بیسویں صدی کی اب تک کی غزلوں کو یا آئندہ کی غزلوں کو بھی جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی ہیں۔ کیا تجہیز و تکفین اور جنازہ بازی کی رسم انہیں اتنی پسند آگئی ہے کہ وہ ماضی حال اور مستقبل سب کی غزلیں اچھی اور بری سب بیک وقت دفن کر دینا چاہتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ مشاعروں میں اور اپنے طور پر پر اردو زبان کے آغاز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں غزلیں کہہ ڈالی گئی ہوں گی اور کئی ہزار غزلوں کے دیوان مرتب ہوئے ہوں گے۔ لیکن زمانے نے اپنے فیصلے کے مطابق تین سو برس کے اندر مشکل سے تیس چالیس غزلوں کے دیوان محفوظ رکھے اور باقی کو بغیر حضرت نقاد کے مشورہ کے دفن کر دیا گیا ہے۔ یہ ہر زبان کی تاریخ میں ہوا ہے ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لندن، پیرس، برلن اور ماسکو میں لاکھوں آدمی ڈراما

www.taemeernews.com

اور فلم آپریا یا گیتوں سے روز لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ بے شمار افسانے اور منظومات روز شائع ہوتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں بکتے ہیں۔ شاندار تبصرے ان پر نکلتے ہیں جو دوسرے دن بھلا دیے جاتے ہیں یا کچھ دن زندہ رہ کر دفن ہو جاتے ہیں۔ ایک غزل ہی پر کیا موقوف ہے دوسرے اصناف سخن میں بھی دیرپا یا زندۂ جاوید چیزیں آئے دن نہیں تیار ہوتیں۔ حضرت نقاد، ہومر اور ورجل و فردوسی وغیرہ کا نام نظموں کی حمایت میں خواہ مخواہ لیتے ہیں۔ آج اردو میں کالیداس یا فردوسی کون ہے لیکن کیا اس وجہ سے اقبال اور جوش کے کارناموں کو دفن کر دیا جانا چاہئے۔ اس کو بھی جانے دیجئے باوجود اختلاف میں کہوں گا کہ اگر حضرت نقاد نے جیسا مضمون غزل گوئی پر لکھا ہے بالکل اسی طرح کے مغالطوں سے بھرے ہوئے مضامین پندرہ بیس لکھ ڈالیں تو میں کہوں گا کہ اپنے مضامین کا مجموعہ ضرور شائع کر دیں لیکن ایسا کرنے سے حضرت نقاد کے مضامین ارسطو کے شعریات (Poetics) اور لانگینس (Longinus) کی Essay on the Sublime یا سانت بود (Saint Beauve) کے "Essays" یا کارلائل Carlyie اور ہیزلٹ (Hazlitte) کے تنقیدی مضامین نہ ہو جائیں گے۔ سنئے دفن ہونے کے لئے تو سب پیدا ہوئے ہیں مگر قبل از مرگ واویلا مچانا کہاں کی زندہ دلی ہے۔ الغرض میں تو یہی کہوں گا کہ جس طرح حضرت نقاد کی نثر کوئی بڑا ادبی کارنامہ نہیں بلکہ وہ دوسرے حاضر کے خیالات کا بھی وہ صحیح عکس نہیں۔ پھر بھی حضرت نقاد نے اسے لکھا۔ ٹھیک یہی حال اس زمانہ کی قریب قریب تمام نظموں کا ہے کہ وہ کہی گئیں پھر حضرت نقاد صرف غزل کو کفنانے دفنانے کے لئے اتنے بے چین کیوں ہیں؟ بات یہ ہے کہ آپ کو غزل بہت لطیف چیز معلوم ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس لطافت کے احساس اور اپنی فطرت میں آپ تصادم محسوس کہتے ہیں آپ کا معیار حیات آپ کا وجدان آپ کی فطرت غزل کی لطافتوں کا احساس تو کرتی ہے لیکن اس کی مہذب غزلیت (Cultured Lyricism) سے اپنے آپ کو محروم پاتے ہیں۔ غزل کی لطافتوں رنگینیوں اس کے خلوص اس کی سپردگی اور اس کی شرافت نفس اس کی روحانی ماورائی اور سماوی فضا کا احساس کرتے ہوئے جب اپنی نارسائی محسوس کرتے ہوں گے تو حضرت نقاد خود اپنی نظروں سے گر جاتے ہوں گے، پھر ایسی حالت میں غصہ آنا ضروری ہے۔ آزاد ان کے شاید دوست ہوں گے بہترین اور لطیف ترین مثالوں نے جب انہیں بیک وقت متاثر اور متنفر کیا تو اپنے اندر ہم آہنگی نہ پا کر لگے کہنے لیکن اور بھی حسرت کا جو شعر میں نے ابھی نقل کیا تھا۔ اس شعر یا اسی قسم کے متعدد اشعار سن کر حضرت نقاد اپنی تنقید کرنے لگے ہوں گے اور اپنی نفسیات کو متضاد و متصادم پا کر یوں تسلی دی ہوگی کہ لیکن حسرت بھی دور حاضر کا شاعر کہاں۔ صحیح ہے نہ خرام ناز دور حاضر کی چیز ہے نہ نگاہ ناز۔ دور حاضر کی چیزیں ہیں موٹر کار اور دوربین، اگر ان باتوں سے حضرت نقاد کی خودداری مجروح ہوتی ہے تو میں ان کے زخم کا اندمال یہ کہہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کا تو خیر کیا ذکر ہے بڑی بڑی کامیاب ہستیوں کا بھی ایسے اشعار سے وہی حال ہو گیا

www.taemeernews.com

ہے جو حضرت نقاد کا لیکن معمولی آدمی نہیں تھا میکالے معمولی شخصیت کا آدمی نہیں تھا۔ لیکن وہ ہرگز ورڈ سور تھ کی شاعری کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ میری ان باتوں سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا ازالہ ہو جائے۔ جو کچھ میں نے اب تک جمالیات اور وجدانیات کے اس نازک و دقیق مسئلہ پر کہا میرا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ حضرت نقاد اور ان کے ہم مذاق چھوٹے بڑے شعراء بلند و لطیف یا رنگین تغزل سے بالکل بیگانہ ہیں میں جانتا ہوں کہ حافظ کے یہاں جوش و رنگینی کے ساتھ ساتھ حیات کا اتنا ابھار موجود ہے اور داخلی و خارجی پہلو کا اتنا فطری و حیرت انگریز اتحاد و اجتماع اس کی غزلوں میں پایا جاتا ہے کہ ہر مذاق والا اس سے برابر متاثر ہوگا۔ حضرت نقاد کو اور لطافتیں نہ سہی، صرف زندہ دلی اور رنگینی کا سامان اس قدر افراط سے حافظ کے یہاں مل جاتا ہے کہ بار بار وجد کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن کلام حافظ کی اندرونیت اور اس کا جذب نہاں، Inwardness جس نے حافظ کو لسان الغیب بنا دیا ہے، ان زندہ دل حضرات کے بس کی چیز نہیں کیونکہ — یہ مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں۔ حسرت کے منقولہ بالا شعر کے علاوہ میر کے ان اشعار پر بھی یہ حضرات اپنے اندر ایک تکلیف محسوس کریں گے۔

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

سوز و ساز، درد و گداز، سپردگی افتادگی، متضاد کیفیات کو شیر و شکر کر کے ایک خاص بے تکلف نرمی (Spontaneous tenderness) سے ان تمام باتوں کو قابل یقین حد تک پہنچا دینا، یہ وہ باتیں ہیں جو ان زندہ دل حضرات کو لطف نہیں دے سکتیں۔ مومن کے اس شعر پر اپنی نااہلیت کا احساس کر کے ایسے آدمیوں کو بہت غصہ آتا ہے:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ایسے لوگ سرمستی و رنگینی کو پسند کرتے ہیں، کیف و تاثر سے ذرا چونکتے ہیں۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض حضرات کو شکسپیئر کی طربیہ تمثیلیں اس کی حزنیہ تمثیلوں سے زیادہ پسند ہیں اور ان حضرات میں ملٹن اور جانسن تک شامل ہیں۔ کسی نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ہر شخص یا تو افلاطون کے گروہ کا ہوتا ہے یا ارسطو کے گروہ کا۔ اردو شاعری میں بھی یا تو ایک شخص میری ہوگا یا سودائی۔

رہا یہ امر کہ غزل کے مضامین پامال اور انداز بیان فرسودہ چیزیں ہیں سو بظاہر یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ میر سے لے کر مومن تک حسن و عشق کا وہ کونسا ماجرا تھا جسے اردو شعرا نے چھوڑ دیا ہو پھر بھی داغ نے بیان عشق ہی کو اپنا موضوع بنایا — شاد عظیم آبادی نے حسن و عشق ہی

www.taemeernews.com

پر پاکیزہ اشعار کا زندہ جاوید ذخیرہ چھوڑا۔ حسرت موہانی نے عاشقانہ غزل گوئی ہی کو نوائے سرمدی بنادیا اوران کے علاوہ سیکڑوں شعرا نے داغ کے بعد بھی اس زمانے میں معاملات حسن وعشق پر ایسے ایسے شعر کہے ہیں جن کے سامنے منظومات صحافت کا نام لینا ان کا منھ چڑھانا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جذباتی اور عاشقانہ شاعری میں جب اس کا ذریعہ اظہار (Vehicle) غزل ہو فرسودگی و پامالی کا بہت احتمال ہوتا ہے۔ لیکن تاروں بھری رات نسیم صبح، طلوع آفتاب، فطرت کے تمام مظاہر اور واردات حسن وعشق بھی بیک وقت پرانے اور نئے مظاہر ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ حسن وعشق پر اب کونسی نئی بات کہی جاسکتی ہے لیکن بالکل یہی سوال نظم کے باب میں بھی کیا جاسکتا ہے۔

اس میں نیا مضمون نئی معنیٰ آفرینی مرکزی تخیل (Central ideal) کیا ہے حضرت جوشؔ کی مشہور نظم جنگل کی شاہزادی، یا حضرت حفیظ جالندھری وحضرت روش صدیقی کی نظمیں یا میری آپ کی عاشقانہ نظمیں کیا یہ سب کوئی نئے معنیٰ کوئی نئی حقیقت، کوئی نیا مرکزی تخیل ایسا پیش کرسکتی ہیں جو غزلوں میں نہیں ہے یاد رکھئے کہ غزلوں میں اب بھی نہ صرف اچھوے مضامین بلکہ حسن وعشق کے باب میں تخلیقی جدت (Creative originality) کی بڑی گنجائش ہے۔ عاشقانہ نظموں میں خارجی تنوع بہ نسبت غزل کے زیادہ ممکن ہے لیکن نفس مضمون میں تنوع یا جدت یا خلاقی کا ذکر آپ نہ کریں تو اچھا ہے یہ صحیح ہے کہ محض نقالی یا سرقہ یا توارد یا فرسودگی کا خطرہ غزل میں بہ نسبت نظم کے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ناسخ نے اور تمام اہل لکھنو نے غزل میں خارجی اجزا کثرت سے داخل کردئے اور غزل کو نظم یا قصیدہ بنادیا۔ نئی تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار کردی۔ تمثیلی شاعری کی داغ بیل ڈال دی، صائب کی غزل گوئی کا تتبع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی خالص داخلی شاعری پھر زندہ ہوئی اور غزل نظم ہونے سے بچ گئی۔ علاوہ اس کے میں یہ پوچھتا ہوں کہ ملتے جلتے مضامین یا متوازیات (Parallelism) کس ادب اور کس زبان کی شاعری میں نہیں ہیں۔ مفہوم میں مشابہت ہونا اور چیز ہے اور فرسودگی و پامالی یا سرقہ بالکل دوسری چیز ہے۔

حضرت نقاد کا یہ فرمانا کہ غزل گوئی کا موضوع محض حسن وعشق ہے نہایت عامیانہ مذاق ظاہر کرتا ہے حسن وعشق نہ صرف غزل بلکہ تمام دینائے ادب کے اجزائے اعظم رہے ہیں۔ اس لئے وہ محدود ہوسکتے ہیں نہ فرسودہ آخر آتش کا یہ شعر قطعہ میں کھپے گا یا رباعی میں یا کسی نظم میں یا کہاں:۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

آتش تو غزل میں ایسے مضامین کا بادشاہ ہے لیکن حیات کے بے شمار پہلوؤں پر اگر اردو کے پہلے غزل گو کے وقت سے آج تک کی غزلوں میں سے اشعار کا مجموعہ شائع کیا جائے تو ہزار ہا اشعار اور

www.taemeernews.com

سیکڑوں پوری پوری غزلیں حسن وعشق میخانہ وبہار وجنوں وغیرہ غزل کے تمام رسمی الفاظ سے یکسر آزاد ملیں گی، اور تو اور منظر نگاری کے وہ وہ شعر غزل میں ملیں گے جو بڑی معرکہ آرا نظموں پر بھاری ہیں۔ سنئے اب سے انداز انصف صدی پہلے کا یہ شعر:۔

یہ کس نے آخر شب داستان شوق دہرائی
زمیں نے کروٹیں بدلیں فلک لیتا ہے انگڑائی

وہ حسن وعشق ہو یا تصوف بہار وخزاں ہو یا زنداں وصحرا حیات واخلاقیات ہو یا نفسیات کے بے شمار پہلو سب غزل کے موضوع میں داخل ہیں، لیکن جناب نقاد کی مثال اس شخص کی سی ہے جو آگرہ جائے اور تاج محل کی نقاشی ومصوری سے بے خبر رہے۔

میں متعدد مقامات پر بتاتا جارہا ہوں کہ حضرت نقاد اردو نظموں کو جتنی نئی چیز سمجھتے ہیں اتنی نئی وہ نہیں اور بیسویں صدی کی اردو غزلوں کو جتنی فرسودہ اور پرانی چیز وہ سمجھتے ہیں اتنی پرانی چیز وہ نہیں۔ جذباتی اسکول کے شعرا سے لے کر اس وقت تک کے غزل گو شعراء کے نغمے بیسویں صدی کے نغمے ہیں۔ اس صدی کی غزلوں میں کچھ عناصر ایسے ہیں، طرز بیان اور احساس میں کچھ ایسا نیا پن ہے کہ قدیم رنگ میں کہنے والے متعدد شعراء جیسے حضرت جلیل، حضرت ریاض، وغیرہ کے یہاں بھی پرانی باتوں کی جگہ نئی باتوں نے اس طرح لے لی ہے کہ اس خاموش مگر عالمگیر انقلاب کا تصور بیسویں صدی کے قبل کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اساتذہ ہی نہیں بلکہ ہندستان کے گمنام وغیر معروف شعرا کی غزلوں میں بھی فکر واحساس کی ندرت پائی جاتی ہے اور یہ دور حاضر کی خصوصیت ہے کچھ لوگوں پر اس صدی کی اردو غزلوں کا یہ فرق نمایاں ہے، ایسے نقاد وادیب اس ہندستانی رئیس کی طرح ہیں جو انگریزی ذرا کم جانتے تھے انہوں نے کسی نوجوان گریجویٹ سے فرمایا کہ میرے لئے کوئی انگریزی اخبار تجویز کردیجئے۔ چنانچہ یہ حسب مشورہ کلکتہ کا Statesman خریدنے لگے جس کے پہلے ہی صفحہ پر تمام Wanted بھرا ہوا تھا۔ ایک نظر پہلے صفحہ پر ڈالی اور اخبار رکھ دیا۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی کیا اور کئی دن تک یونہی، اخبار بینی کرتے رہے۔ جب اس نوجوان گریجویٹ سے دوسری بار ملاقات ہوئی تو انہوں نے شکایت کی کہ آپ نے اچھا اخبار تجویز کیا روز روز ایک ہی خبر wanted چھاپ دیتا ہے۔ بیسویں صدی کی غزل گوئی پر حضرت نقاد کی ناراضگی کچھ اسی قسم کی ہے میں اسے تسلیم کرچکا ہوں کہ غزل صنف سخن ہے جس میں فرسودگی کا خطرہ اور اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ ہے اور اسی سے سخن شناس ناواقف نہیں کہ غزل میں فرسودگی ابتذال اور سیکڑوں دوسری طرح کی لغزشوں سے بچنا مشکل ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ داخلی شاعری کی وسعتیں اور اس کے عنوانات بھی داخلی ہوتے ہیں۔ الغرض غزل بڑی دق کرنے والی چیز ہے۔ یا بقول مجنوں گورکھپوری غزل بہت کٹر صنف سخن ہے۔

www.taemeernews.com

اس کے علاوہ پروفیسر ویریٹی کا یہ قول بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کہ ادب صدائے بازگشت کا تسلسل ہے۔ Literature is a series of echoes غزل بیک وقت نئی چیز بھی ہے اور پرانی بھی مشہور فرانسیسی مورخ ادب انگریزی نے انگریزی ادب کے تسلسل Continuity of English Literature پر بڑا زور دیا ہے۔ نیا پن اور پرانا پن نہ صرف فنون لطیفہ بلکہ عالم موجودات کا نہایت نازک لطیف واہم مسئلہ ہے وہی ادبی کارنامہ زندہ جاوید ہوتا ہے جس کی جڑیں ادب وحیات کی قدیم ترین روایات تک پہنچ جاتی ہیں اور جس میں صبح ازل سے لے کر آج تک کی زندگی کی صدائیں گونج رہی ہوں۔ تخصیصت (Particularism) اور عارضیت (Immediacy) سے بچنے کا یہ کرشمہ ہے کہ معمولی سے معمولی واقعات اہم سے اہم موقعوں اور نازک سے نازک اوقات Crisis پر اگر حاوی ہو سکتے ہیں تو وہ صرف غزل کے اشعار ہیں مسدس حالی یا حب وطن یا انقلابی منظومات یا دیگر خطیبانہ نظموں کے اشعار کام نہیں آتے۔ علم وادب کا یہ بھی ایک اصول ہے کہ بلند اور ہمہ گیر ادب وہ ہے جو ہر موقع ومحل پر حاوی ہو اور اس کی بے تکلف ترجمانی کر سکے۔

میں نہایت ادب لیکن نہایت وثوق سے عرض کروں گا کہ اردو غزل میں سراج دکنی اور ولی دکنی بلکہ اس غرض سے لے کر جو کبیر سے منسوب کی جاتی ہے آج تک کی غزلوں میں کائنات وحیات کے وہ نغمے جو ساز ہستی پر مبتدائے بے خبر ہو کر چھیڑے گئے ہیں سنائی دے رہے ہیں:۔

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

فانی

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہوگا
چھڑا ہے ساز ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

یگانہ

کیا اردو کی کسی نظم میں نظیر اکبر آبادی اور سودا کے وقت سے لے کر اس وقت تک کی نظموں میں یہ کچھ اور اتنا کچھ ہوتا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی مرتے وقت صرف ایک پل میں زندگی کے تمام واقعات کچھ لوگوں کو یاد آجاتے ہیں۔ غزل کے مختصر الفاظ یہی کام کرتے ہیں بلکہ انفرادی حیات اور دور حاضر سے گزر کر کائنات کی پوری تاریخ یاد دلا جاتے ہیں:۔

دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہوگئی قسمت نے مجھ کو آج یہ بیدست وپا ملا

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

www.taemeernews.com

رہی ہر دور کی نئی اسپرٹ اور نئی ذہنیت، سو بیسویں صدی کی غزل میں کیا کچھ ہوا اور کیا کچھ ہو رہا ہے مختصراً واضح کر چکا ہوں بچپن سے لے کر مرتے وقت تک ایک شخص کی صورت و سیرت قائم بھی رہتی ہے اور بدلتی بھی جاتی ہے۔ نشو ونما، ترقی و انقلاب کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ کسی چیز کا پہچاننا ناممکن ہو جائے۔ بیسویں صدی کی اردو غزل گوئی کوئی فرسودہ چیز نہیں ہے۔ اردو غزل اپنے داخلی اور خارجی ماحول کے لحاظ سے متاثر ہوتی رہی ہے اور بدلتی رہی ہے۔ مجھے سر محمد اقبال کی شاعری میں ملت اسلام اور حجازیت کی رٹ پسند نہیں لیکن موجودا سپرٹ اور عمرانیت کے مطالعہ نے نیز 'پنجاب' کی 'آب و ہوا' نے حیات کے وہ نئے اور قیمتی عناصر ان کی غزلوں میں بھر دیے ہیں، جو دور ماضی اور دور حاضر کے کسی غزل گو کے یہاں نہیں ملتے۔ یہ کہنا کہ اقبال غزل گو شاعر نہیں ہے قابل رحم تنقیدی سہل پسندی ہے۔ تمام ہندستان کے غزل گو کبھی اسے حقیقت منتظر والی غزل پر طبع آزمائی کر کے دیکھ چکے ہیں، لیکن آج تک اس کا جواب ممکن نہ ہوا۔ اسی طرح حفیظ جالندھری کی غزلوں میں پنجاب کی مردانہ اسپرٹ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی غزلیں چاہے کچھ ہوں لیکن وہ ان کے ایک ممتاز شاعر ہونے کا پتہ ضرور دیتی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی غزلیں احساس مردانہ کی کتنی زبردست ترجمان ہیں۔ ان میں کتنی شوخی، ٹھٹھول ہے۔ اگر خدائے غزل میر کو بھی ایسی غزلیں کہنی ہوں تو اسے بیسویں صدی میں پھر جنم لینا۔

۔ ہماری زندگی اور ہمارے ماحول سے فرسودگی دور ہونے دیجئے اسکول اور کالج سے نکل کر لکھنو' شہروں کی تنگ و تاریک اور گندی گلیوں سے ہمارے نوجوان شعرا کو نکلنے دیجئے انقلاب اور آز عام ہونے دیجئے کشمکش حیات کے عنوان بدلنے دیجئے۔ کوہ سمندر اور صحرا اور دیگر ممالک ہماری تنگی چشم دور ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اردو غزل کیا چیز ہوتی جاتی ہے۔

افسوس ہے حضرت نقاد کے سامنے تاریخ ادب کا یہ نکتہ نہیں ہے کہ د مشتمل ہوتا ہے کئی ادوار پر عزیز لکھنوی کا جذبہ غم فانی کی قنوطیت، اصغر کا نشاط رنگ بے اختیارانہ عشق، حسرت کا لطیف فسوں کارانہ تغزل، اقبال کی مفکرانہ پرجوش اسی ایک دور کی رنگا رنگ بزم آرائیاں ہیں جنہیں حضرت نقاد' و Nietzsche نے ٹھیک کہا ہے کہ رائے زنی غور و فکر کے لئے افیون

ɔinion is the opium of thought?

باجود تنوع اور باوصف ہزار ہا مختلف خارجی اجزاء رکھنے کے ا شیرانی، خواجہ مسعود علی ذوقی اور اسی طرح کے متعدد اردو نظم ذہنیت کا تعلق ہے) اس اچھوتے پن اس نرالی شخصیت ا پتہ اپنی نظموں میں کیوں نہیں دیتے جو انہیں کے معاص

www.taemeernews.com

چڑیوں کی طرح آدمی بھی روپ رنگ کے لحاظ سے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں لیکن جتنا تنوع انسانوں میں ملے گا وہ تنوع پرندوں میں نہ ملے گا ٹھیک یہی حال نظم اور غزل کا ہے۔ بیرونی وخارجی لوازم اور لفاظی سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فرسودگی اور کہنگی کا بہت کافی خطرہ نظموں میں بھی ہے۔

برخلاف اس کے بیسویں صدی کی غزلیں وہ جیسی بھی ہوں، ان میں کتنا ہی آورد کیوں نہ ہو وہ تغزل سے کتنی ہی باہر کیوں نہ ہو جاتی ہوں لیکن وہ فرسودہ نہیں ہیں۔ ان میں ٹھیٹھ دور حاضر کے عناصر موجود ہیں مثلاً موجودہ زندگی کی کشمکش نے نظر بازی اور عشق بازی کی آزاد فضا ہم سے چھین لی ہے۔ وہ شوخی وہ چھیڑ چھاڑ وہ سرمستی و بے فکری وہ فرصت کے رات دن وہ عیش بافراغت کے مزے اب ممکن نہیں الغرض عاشقانہ غزل گوئی میں ایک انقلاب ظہور پذیر ہوگیا۔ پھر دیکھئے کیا ہوا۔ حسرت نے تو معاملہ بندی کی روایت قائم رکھی معاملہ بندی کو بھی تبدریج لطیف تر کرتے گئے اور اس کی سرحدیں نفسیات حسن وعشق سے ملا دیں لیکن حسرت کے علاوہ عاشقانہ غزل گوئی حسن وعشق کی ماہیت، اس کے شعوری نیم شعوری اور غیر شعوری اثرات کی طرف مڑ گئی۔ شعرا نے اکثر حسن وعشق کا تخیلی تصور (Idealised conception) اپنا موضوع قرار دیا۔ جب حسن وعشق کا ڈرامہ ختم ہوگیا تو حسن وعشق کی معنویت اس کی شکست وفتح اس کی حسرت وناکامی اور اس کے بے شمار اثرات اور اس کے فلسفہ کو اپنی تخیل کا اور غزل سرائی کا جولاں گاہ بنایا۔ اس دور کی غزلوں میں حسن وعشق کا لفظ اپنے مجرد مفہوم (Abstract sense) کے ساتھ جس کثرت سے آیا ہے وہ اس دور سے پہلے صرف میر کے متعدد اشعار میں نظر آتا ہے۔ الغرض حسن وعشق کی داستان بالکل بدل گئی اور اسی کے ساتھ آج کل کی غزل گوئی جدید فلسفہ وجدید سائنس اور جدید علوم سے بھی متاثر ہوتی رہی اس کے علاوہ دور حاضر کی اردو غزل میں تذبذب اور تشکیک (Scepticism) جو اتنی نمایاں شکل میں نظر آتا ہے۔ خاص اس دور کی چیز ہے شعور انسانی میں انسان کی تنہائی کا احساس جو پرانی طرز زندگی کے بدل جانے کا نتیجہ ہے ان سب کا اظہار مختلف عنوانوں سے ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہوش وعقل، جنوں صحر، زنداں، بہار، خزاں ساقی اور بزم مے یہ تمام علائم دور حاضر کی ذہنیت اور احساسات کے مطابق ایک نئی معنویت ایک نئے انداز سے لائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی ایک نئی چیز ہے اردو غزل کی روایات تمثیلوں کے علاوہ آج کل کی غزل گوئی نے ناسخ اور لکھنو اسکول کی خشک و بے کیف تمثیلی شاعری کو نئی رنگینی ولطافت اور ایک نئی موسیقیت کے ساتھ فطری وحقیقی شاعری کی شکل میں پھر سے زندہ کر کے دکھایا دیا۔ ذوق نے کہا تھا:

نازک مزاجیاں مری توڑیں عدو کا دم
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

ذوق کی دوسری پشت میں سنئے جگر مرادآبادی کیا کہہ رہا ہے:

www.taemeernews.com

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

امیرؔ مینائی نے کہا تھا

جنت میں روح جسم ہے نیچے مزار کے
کشتی ہماری ڈوب گئی پار اتار کے

اب اس دور میں ہادی مچھلی شہری کا یہ شعر سنیئے:۔

درد سا اٹھ کے نہ رہ جائے کہیں دل کے قریب
میری کشتی نہ کہیں غرق ہو ساحل کے قریب

امیرؔ مینائی

اے برق حسن یار یہ کیسا ظہور تھا
دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

اس دور کا ایک شاعر کہتا ہے:۔

اللہ اللہ شوز عشق یار کا اتنا اثر!
میں ابھی تک جل رہا ہوں طور ٹھنڈا ہوگیا

امیرؔ کا شعر ہے:۔

پھر چلتے چلتے وعدہ دید اس نے کرلیا
پھر اٹھ کھڑا ہوا وہی روگ انتظار کا

دور حاضر کا تغزل دیکھئے:۔

تجھ سے حجاب کیا مگر اے ہم نشیں نہ پوچھ
اُس دردِ ہجر کو جو شب غم اٹھا نہیں

ایک استاد کا مشہور شعر ہے:۔

اسیر پنجۂ عہد شباب کرکے مجھے
کہاں گیا میرا بچپن خراب کرکے مجھے

اب وفا رامپوری کا مطلع سنئے۔ خود شناسانہ آوردا سے کہتے ہیں:۔

غبار قافلۂ اضطراب کرکے مجھے
عدم کی آنکھ میں بھیجا ہے خواب کرکے مجھے

وفاؔ کی اسی غزل کا ایک اور شعر سنئے:۔

www.taemeernews.com

وہ میں کہ دیکھ رہا ہوں نقاب بن کے تجھے
وہ تو کہ چھوڑ دیا ہے نقاب کر کے مجھے

وفا کے مطلع کے ساتھ اصغر گونڈوی کا یہ مطلع بھی غالب، مومن اور شیفتہ کے مطلوعوں کے بعد دیکھئے:

میخانۂ ازل میں جہان خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

غالب نے کس قیامت کا شعر کہا تھا:۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اس کو تو اپنے آپ کو کھو آئے

یاس نے پانسا پلٹ دیا:۔

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان سنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

درد کے اس شعر میں رسمیت اور تغزل کی حیرت انگیز آمیزش دیکھئے:۔

رات محفل میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے رخ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

اب عصر جدید کا یہ شعر سنئے:۔

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلوے کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

فرسودگی فرسودگی کی رٹ لگانے سے کام نہیں چلتا، ان اہم اور قابل غور خصوصیات کے علاوہ کہ ہر فرد بشر کی شان و اہمیت اور اس کی پراسرار تقدیر کا احساس یہ نئی خودی یا عرفان نفس دور حاضر کی غزل گوئی کی وہ درخشاں خصوصیت ہے جس کے حجابات میں انقلاب کی خونیں صبح انگڑائیاں لے رہی ہے۔ سنئے:۔

تمہارا فرض ہے اپنی سی کوشش چاہے تم کر لو
مگر آساں نہیں ہے میری ہستی کا مٹا دینا

عزیز

تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کستا جا

یاس یگانہ

www.taemeernews.com

وبال دوش سے یہ ہوگئے ہیں ان فضاؤں میں
مری پرواز میں حائل رہیں گے بال و پر کب تک

(راقم الحروف)

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اقبالؔ

یوں نہ مایوس ہو اے شورشِ ناکام ابھی
مری رگ رگ میں ہے اک آتش نے نام ابھی

اصغرؔ

کسی کے وحشیوں نے کرلیا پیوند پیراہن
گریبان لحد کو دامن شہر خموشاں کو

راقم الحروف

دور ماضی کا استاد داد سخن یوں دیتا تھا:۔

تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
سئے جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے

اس شعر میں اور اس سے اوپر کے شعر میں جو بعد المشرقین ہے مخفی نہیں، ورنہ یوں تو رسمی، فرسودہ، پامال اور ہزاروں بار کے دہرائے ہوئے الفاظ ہی سے دونوں شعر مرتب ہوئے ہیں۔ انسان کی عظمت کا یہ احساس انا الحق یا رسمی تعلی نہیں ہے؛

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

یہ باتیں صرف رسمی نہیں ہیں۔ یہ مہمل گوئی نہیں ہے۔ یہ مقامات ہر صبح انقلاب کے قبل شعور انسانی کے سامنے آیا کرتے ہیں۔ انسانی عظمت کے اس نئے احساس کے ساتھ ساتھ تمام مناظر قدرت تمام فضا اور ماحول، مادی دنیا، نباتاتی اور حیواناتی دنیا سب کا احساس اردو غزل گوئی نئے سرے سے کر رہی ہے۔ گل و بلبل، ذرہ و آفتاب، گلشن و صحرا سب کے معنی جیسا ابھی کہہ چکا ہوں، جدید دور غزل میں بدلتے

www.taemeernews.com

جارہے ہیں۔ اردو غزل گوئی آج نئی آزمائش اور نئی تربیت سے گزر رہی ہے۔ آج کے غزل گو نئے اضطراب وسکون، نئی تنگیوں اور وسعتوں، نئی مجبوریوں اور آزادیوں نئی امید و ناامید، جدید نور وظلمت، پرانے تجربات کی نئی آگاہیوں، نئے انبساط اور نئی افسردگی سے گزر رہے ہیں۔

جب اس دور کی روحانی سوانح عمری اور ذہنی تاریخ کا مرتب کی جائے گی تو اکثر غزلوں اور غزلوں کے ہزار ہا اشعار سے مدد لینی ہوگی۔ حقیقی ادب، فطری اور داخلی ادب کسی دور کے سمجھنے کے لئے صحافت اور خطابت سے زیادہ قابل اعتبار ہوتا ہے اور ''کسان مزدور انقلاب'' اور ''درس عمل'' اور سیکڑوں مختلف العنوان نظمیں ان غزلوں کے سامنے جو دور حاضر کی اسپرٹ کی نمائندگی کر رہی ہیں عموماً صحافت خطابت اور خارجی شور وشغب سے زیادہ حیثیت نہ پائیں گی۔

نغمۂ تغزل میں نئے درد، نئی چوٹ کا پتہ چلتا ہے۔ بہر حال بجائے فرسودگی کے اردو غزل نے نشو ونما کا وہ ثبوت اس دور میں دیا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے آئی سی ایس کے امتحان میں یہ سوال پوچھا گیا:

Explain the modern tendencies in Urdu Ghazal and show how far they are in agreement with the proposition that the scope of the Ghazal is confined to themes of love and beauty.

اگر حضرت نقاد اس سوال کے جواب میں اپنے وہی خیالات لکھ آتے ہیں جن کا اظہار موصوف نے اپنے مضمون میں کیا ہے تو جو نمبر وہ پاتے اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں۔ خیر۔

یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ جذباتی اسکول کا اثر جب سے مٹنے لگا اور یاسؔ، حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ، فانیؔ، وغیرہ کا دور شروع ہوا اس وقت سے اردو غزل گوئی لکھنؤ کی تنگ وتاریک گلیوں سے نکل کر ہندستان کی کھلی فضا میں آگئی۔ یہ امر محض اتفاقیہ نہیں ہے کہ ان مشاہیر میں کوئی بھی لکھنو کا شاعر نہیں۔ صرف یاس کچھ دنوں وہاں رہے ضرور اور غالباً فانی بھی۔ استادی اور شاگردی کا سلسلہ بھی ان مشاہیر نے قائم نہ رکھا اور ان میں سے کسی نے بھی باقاعدہ شاگرد نہیں بنائے۔ ان کے کلام شائع ہوتے رہے، مشہور ہوتے رہے اور مختلف عنوانوں سے ہندستان بھر کے سیکڑوں ہزاروں غزل گو ان کو اپنا رہنما بناتے رہے مگر فن، زبان اور استادی کے نام پر شاگرد کے ذاتی تخیل اور احساس کا خون کر کے غزلوں کی اصلاح کا سلسلہ بند ہو گیا اردو غزل گوئی کو اس دور میں سوراج مل گیا اور اگرچہ آزادی کی رو میں اکثر نوجوان غزل گو بھی بہکنے لگے لیکن آزدی کا صحیح استعمال کرنے والے بھی کم نہیں تھے۔ اب اردو غزل کی شہرت ومقبولیت نہ لکھنو اور دلی کے مشاعروں پر منحصر ہے نہ لکھنو اور دلی کے استادوں اور ان کے مختلف گروہوں اور جماعتوں یا امتوں کی سرپرستی یا پروپیگنڈا پر ''ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں''۔ اسی زمانہ سے اردو رسالوں کا دور شروع ہو جاتا ہے مشاعروں کی اہمیت اردو رسالوں کے حصہ نظم میں منتقل ہو جاتی ہے اور نظموں کے ساتھ

www.taemeernews.com

غزلوں کی بھی کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ اس منتشر لیکن کثیر التعداد پبلک کے ہاتھ میں آجاتا ہے جو رسالے پڑھتی ہے۔

رسالہ پڑھنے والوں نے سامعین مشاعرہ کی جگہ لے لی اور رسمی تقریظ لکھنے والوں کی جگہ اس ریویو اور تنقید وتبصرہ نے لے لی جو رسالوں میں شعرا پر نکلنے لگے یا جو تعارف یا مقدمہ کی شکل میں شعرا کے مجموعہ کلام کے ساتھ شائع ہوئے اور مغرب کا اثر رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کا اثر ہندستان کی بدلتی ہوئی معاشرت اور متغیر ذہنی فضا کا اثر، ہندستان کی جنگ آزادی اور دنیا بھر میں جمہوریت و انقلاب کی بڑھتی ہوئی طاقتوں کا اثر، انفرادی اور اجتماعی حیات میں جو کایا پلٹ ہو رہی تھی اور ہو رہی ہے اس کا اثر ہزار ہا کشاکش پنہاں کا اثر دور حاضر کی غزل گوئی پر پڑا اور کافی پڑا، چنانچہ غزل گوئی محض فن نہیں رہ گئی اسے حیات کے مسائل سے اور اپنے ماحول سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں اب نئی ناہمواریاں پیدا ہونے لگیں، نئی عریانیاں اور نئی سنجیدگیاں غزل میں رونما ہونے لگیں، پرانی باتیں نئے انداز اور نئی باتیں پرانے انداز میں کہی جانے لگیں۔ پچھلے بیس سال کے اندر اردو غزل میں اس قدر کثرت سے نئی ترکیبیں وضع کی گئیں کہ ان کی مثال مومن اور مومن اسکول کے علاوہ اردو غزل گوئی کے آغاز سے تین سو برس بعد تک نہیں ملتی۔ یہ ترکیبیں محض ادبی تکلف یا تصنع نہیں، بے سروپا مضمون آفرینی نہیں جسے کسی شاعر کے یہاں دیکھ کر اگلے وقتوں کے بھولے بھالے لوگ یہ کہہ کر داد دیا کرتے تھے کہ یہ آپ کا حصہ ہے۔ بلکہ یہ ترکیبیں احساس ووجدان کی اس داخلیت (Inwardness) کا پتہ دیتی ہیں جو غزل کو اظہار معنیٰ کا بہترین آلہ بنا دیتی ہے۔ غزل اب پنچایتی چیز نہیں رہی وہ دن بدن انفرادی ذہنیت وشخصیت کے اظہار کا پردۂ ساز بنتی جا رہی ہے۔

یہاں لگے ہاتھوں ادبیات کے ایک اور نکتہ پر بھی کچھ کہہ دوں وہ یہ کہ حیات وادب کے ہر نئے دور میں محض یہی نہیں ہوتا کہ ادب میں تبدیلی رونما ہو بلکہ وجدانیات یعنی ادبی ذوق شعور میں بھی غیر محسوس طور پر تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ بھی ہوتا ہے ک پرانا ادب نئی روشنی میں آجاتا ہے پرانے ادب کا وہ حصہ جسے کچھ دن پہلے خرافات کا دفتر سمجھ لیا گیا تھا، یا کم از کم نظر انداز کر دیا گیا تھا، پھر کچھ نئے محاسن کا حامل نظر آنے لگتا ہے بازار علم میں پرانی جنس کی قدو قیمت پھر سے گھٹنے بڑھنے لگتی ہے۔ چنانچہ آج سے تقریباً تیس برس پہلے جب ملک کو اپنی گری ہوئی حالت کا اپنی کھوئی ہوئی آزادی کا اور رافسردہ فضا کا پہلے پہل احساس ہوا تو مایوسی کے اس دھندلکے میں داغ وامیر کے اسکول کی شوخ شاعری سے طبیعت بیزار ہوگئی اور اس شاعری کو مبتذل سمجھ کر جذباتی اسکول کی داغ بیل مذاق سلیم کی حمایت میں شعرا نے ڈالی۔ آج جب ملک کی فضا امید افزا ہو چلی ہے جب ہم صبح انقلاب کے منتظر ہیں تو امیر وداغ کی سوقیت میں تو ہمیں رنگینی وزندہ دلی ملتی ہے اور اسے ہم اپنی سرمستیوں سے ہم آہنگ پاتے ہیں، لیکن

www.taemeernews.com

تاریخ ادب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جذباتی اسکول کی سینہ کوبی مبتذل معلوم ہوتی ہے۔ آج امیر کا یہ شعر:۔

یہ ابھرے ابھرے جوبن یہ کچھ ان کو گدگداتے ہیں
کہ لوٹ جاتے ہیں مارے ہنسی کے پھول ہاروں کے

اور یہی شعر نہیں بلکہ۔ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے والا شعر بھی شبابیات کی ایک بے ضرر فحاشی (Healthy obscenity) کا مزا دیتا ہے لیکن مذاق سلیم کو اس شعر پر

یہ اپنا حال ہے اب شدت بیماریٔ دل سے
سمجھتے ہیں مرے احباب میری بات مشکل سے

صفی

بجائے رقت کے ابتذال کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ معاملہ محض یاس و امید کا نہیں ہے بلکہ بے چارگی و مجہولیت (Passivism) کے مقابلہ میں جس کا دور آیا اور گزر گیا، اس خود اعتمادی اور فعالیت (Activism) کا ہے جس کا دور اب آیا ہے۔

بہر حال پچھلے صفحات میں اس انقلاب اور اس کے داخلی و خارجی تغیر کا بہت کچھ ذکر اغیار جن کے اثرات اردو غزل میں منعکس ہیں۔ آج اگر پچھلے بیس پچیس سال کی غزلوں کا ایک ایسا مجموعہ شائع کیا جائے جو ہر لحاظ سے اس دور کی نمائندگی کرے تو یہ مجموعہ کم و بیش ایک ہزار غزلوں تک پہنچ جائے گا۔ اسی بیس پچیس برس کے اندر جو چھوٹی بڑی نظمیں چھوٹے بڑے شعرا نے کہی ہیں سلیقے سے اگر ان کا بھی مجموعہ شائع ہو تو یہ چیز بھی قابل قدر ہوگی لیکن ان کے اندر وہ تمام باتیں وہ تمام خصوصیات جن کا ذکر پچھلے کئی صفحات میں ہوا ہے، اس معنویت کے ساتھ اور اس تیز داخلی انداز میں اس مستقل اور مستحکم تیور کے ساتھ، ذہنی انقلاب کی نمائندگی کرتے ہوئے، اتنے کھلے ملے طور پر، اس حلاوت کے ساتھ شاید ہی ملیں جس نہج سے وہ غزل میں پیوست اور جاری و ساری ہیں۔ بانگ درا۔ بال جبرئیل اور ضرب کلیم کے وہ حصے جو تغزل سے باہر ہیں، بجائے آج کی چیزوں کے کچھ کل کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں یعنی ان میں ذرا فرسودگی آ چلی ہے:۔

وقت سبک خرام کا کھایا کئے فریب
فردا کا انتظار تھا دیکھا تو دوش تھا

رضا علی وحشت

میں نے اس جانچ پڑتال کو ذرا طویل کر دیا اور اگر ساتھ ہی ساتھ اپنے ہر بیان کے ثبوت میں غزلیں، اشعار بھی پیش کرتا تو یہ مضمون دفتر ہو جاتا۔ بہر حال شروع سے اب تک میں نے جو کچھ کہا اس کی کچھ مثالوں کے لئے یہ تھوڑے سے اشعار پیش کئے دیتا ہوں۔ ان میں کچھ شعر مومن کے ہیں اور دو چار۔

www.taemeernews.com

اشعار دوسرے مشہور شعراء کے ہیں باقی سب بالکل غیر معروف شعرا کے ہیں۔ اب یہ اشعار محض رکی یا فرسودہ ہیں یا ہر شعر بجائے خود ایک دنیا ہے، ایک پیغام حیات ہے جس کی وسعتوں کے سامنے بڑی بڑی نظموں کے دفتر بیک وقت رکی اور فرسودہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا فیصلہ حضرت نقاد پر چھوڑتا ہوں۔ جہاں تک بلندی، گہرائی، وسعت، لطافت، رنگینی، جامعیت اور ہمہ گیری کا تعلق ہے آپ دیکھیں گے کہ یہ اشعار کہاں ہیں اور نظمیں کہاں۔ نظموں میں تمام خارجی سجاوٹ اور بناوٹ، تشبیہ واستعارہ، مصوری و موسیقیت اور زور بیان کے باوجود ہر طرح کی جدت اور نئے پن کے باوجود وہ شعریت ونشریت وہ بھیتری چوٹ کہاں جو ان اشعار میں ہے۔ نظمیں توپ وتفنگ اور ربم کے گولے سہی لیکن جو اُپی تلواران اشعار میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ نظموں میں کہاں؟ دیکھئے:۔

تمام رات ستاروں نے مجھ کو سمجھایا
کہ فکر کر کوئی دنیا نئی بسانے کی

میرے سرِ نیاز کی محوتیں مٹا نہ دے
موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے

قاتل سے انتقام نہیں چاہتا مگر
میں جس کا صید ہوں وہی میرا شکار ہے

یہ گمراہی یہ خود نا آگہی اچھی نہیں اے دل
کسی وادی میں کھوجا اور اپنی جستجو کرلے

ہم کہے جائیں گے حق لگتی سنو یا نہ سنو
یہ جدا بات ہے ہم صاحب مقدور نہیں

لطف وستم، وفا جفا، یاس و امید، قرب و بُعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند تو ہمات میں
بساطِ ناز پر سب وسعت عالم سمٹ آئی
یہ دنیا تنگ ہے اُس پر جو اٹھا تیری محفل سے

www.taemeernews.com

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں ہر عالم
چل پڑے تو صحرا ہے رک گئے تو زنداں ہے

ترے وحشی سے کوئی اس کی حقیقت پوچھے
وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانوں میں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

کہیں وہ بھی تو نا امید نہ ہو
جس نے ہم کو امید وار کیا

ٹھیرے ہوئے دل آج بھی ٹھیرے ہوئے ہیں اور
تیرِ نگاہِ ناز نشانے اڑا چکے

اب ماورائے وہم و گماں ہے سکوتِ ناز
وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے

گزرے گا ہو کے شہر خموشاں سے آج کون
سو مرتبہ چراغ لحد جھلملا چکے

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

www.taemeernews.com

دئے ساقی نے مجھ کو چند جام آہستہ آہستہ
ہوئی یہ بزم مے مجھ پر تمام آہستہ آہستہ

اور کچھ باتیں کرو اے ہمصفیرانِ وطن
یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھ کو آرام آگیا

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل
کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

حیاتِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم عہدِ شوق کی کہانیاں سنائے جا

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے
سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

نگاہِ یاس ہے آئینہ غمِ فردا
نظر کے سامنے سامان ہیں قیامت کے

جو آگیا ہے تو بس ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا

ذہن جدید

www.taemeernews.com

نگاہِ شوق کی بے باکیاں بھی کیا قیامت ہیں
گلوں کا رنگ اڑتا ہے بہارِ بے خزاں ہو کر

تمہارے درد مندوں کا تمہیں پر بس نہیں چلتا
الٹ دیتے ہیں محشر کو جو دل پر ہاتھ دھرتے ہیں

صدا یہ آتی ہے جنبش سے تیرے دامن کی
نسیم میری ہے گلزار میں صبا میری

دامن کو چاک کرکے رسوا ہوئی ہے کیا کیا
تھی عصمتِ زلیخا یوسف کے پیرہن میں

جُنبشِ برگ شجر سے تابہ طوفان حیات
ایک ہی پیغامبر تھا ایک ہی پیغام تھا

اب قفس میں بھی کسی صورت سے جی لگتا نہیں
ہاں مگر جب تک قفس میں تھے قفس بدنام تھا

پامال اک نظر مین قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہہ التفات ہے

فریب رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے وحشی تو کب کے لے اڑے ہوتے گلستاں کو

دل مایوس اتنی نا امیدی!
کہے گی وہ نگاہ آشنا کیا!

www.taemeernews.com

ہم سے کیا ہوسکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

بے دماغی سے نہ اس تک دلِ رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

وہ لڑکپن کے تھے دن اور یہ جوانی کی بہار
پہلے بھی رخ پر ترے تل تھا مگر قاتل نہ تھا

چند گھڑیاں شمع و پروانے کی اچھی کٹ گئیں
جلوہ تیرے حسن کا جب تک سرِ محفل نہ تھا

کٹ گئی اب رات سورج کی کرن آ ہی گئی
آخر اک دن نوبت دارو رسن آ ہی گئی

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

قفس سے چھٹ کے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگِ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہوکر

حسبِ منشا دل پُر شوق کی باتوں کا جواب
دیدیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے

www.taemeernews.com

یہی حیا ہے یہی جان ہے محبت کی
جو نیچی نظروں سے کہتی ہے ہم تمہارے ہیں

دخل کچھ اپنا نہ تھا یارب مزاجِ یار میں
غیر سے ناراض وہ کیا جانیں کیونکر ہوگیا

رشک صد لطف و کرم ہے یہ نیا رنگِ ستم
کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا
کس قدر شوخ لگاوٹ نگہ ناز کی تھی
یوں ملی جیسے اسے درد نہ درماں ہونا
ہیں امیدیں بھی تغافل سے ترے، گو سچ ہے
اسے ہمدرد نہ ہمراز نہ پُرساں ہونا
اسے ہمدرد بنانے کی تمنا ہے مجھے
بارِ خاطر ہے جسے خونِ تمنا کرنا
باغِ عالم میں بڑی چیز ہے یہ اے بلبل
گل تو گل خار سے بھی رابطہ پیدا کرنا

عجب کیا ہم جو کچھ کھوئے سے رہتے ہیں ترے آگے
ہمارے درمیاں اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

گو ترے رونے والے کی حسرت دل نکل گئی
راز مگر نہیں کھلے گر یہ زار زار کے

تاثیر محبت کی اللہ ری مجبوری
ہر بُعد میں ایک قربت ہر قرب میں ایک دوری
خود اپنے لئے بلبل تجویزِ قفس کرلے
اس پر بھی جو کھل جائے صیاد کی مجبوری

ذہن جدید

www.taemeernews.com

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

مری ضد میں چمن کو بجلیوں نے خاک کر ڈالا
کہاں سے کنج میں پھولوں کی طرحِ آشیاں رکھ دی

● یہ تمام اشعار قلم برداشتہ حافظے کی مدد سے نقل کئے گئے ہیں اگر کہیں اصل شعر کچھ بدل گیا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔

یہ اشعار غزلوں کے ہیں اور متعارف و متداول اردو غزلوں کے ہیں، اس انتخاب کو میں نے دورِ حاضر یا کسی خاص دور تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ہر دور ہر طبقہ اور ہر مرتبہ کے شعرا کے کلام سے یہ نمونے لئے گئے ہیں اچھا اب دورِ حاضر سے قطع نظر میں غزل کے متعلق براہ راست حضرت نقاد سے کچھ اصولی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا چاہتا ہوں۔ مگر ایک جملہ معترضہ کے بعد وہ یہ کہ جو کچھ اور جتنا کچھ غزل کے ایک لطیف ترین شعر میں ہوتا ہے اگر پوری غزل اس معیار پر اتر گئی جو اس ایک شعر کا ہے یا اگر ایسے اشعار کا ایک مجموعہ یا انتخاب مرتب کر لیا جائے تو کوئی نظم جس کا ہر شعر بجائے خود غزل کے ایسے اشعار سے گھٹیا ہے محض تسلسل بیان اور تسلسل خیال کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی اعلیٰ ادب کے معیار پر غزل کے ایک ایک شعر یا غزلوں کے انتخاب سے کیونکر زیادہ قیمتی چیز ثابت ہو سکتا ہے۔ جب نظم کا ایک ایک شعر بمقابلہ غزل کے اشعار کے گھٹیا ہے جب نظم کے اجزائے ترکیبی گھٹیا ہیں تو نظم بحیثیت اعلیٰ ادب کے غزل سے کیسے بڑھ جائے گی۔ آنسو کے ایک قطرے سے ہزار ہا مردہ اور بے حس موتی سبقت نہیں لے جا سکتے اور دلفریب حسن کے ایک موج تبسم سے آنکھیں خیرہ کر دینے والی بجلی زیادہ قیمتی نہیں۔ ہٹ دھرمی کی بات اور ہے۔

اب میں ذرا اصولی بحث پر آتا ہوں۔ غزل پر قافیہ کے باہم بے ربط ہونے پر ''اصولی'' اعتراض کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک شعر اثر کے لئے کیونکر کافی ہو سکتا ہے۔

آپ قافیہ اور ردیف کا رونا کہاں تک روئیں گے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ورس لائبر (Verse Libre) کے حامیوں نے بحر و وزن ہی کو سرے سے غیر شاعرانہ چیز بتایا ہے جس منطقی یا اصولی نقطہ نظر سے آپ قافیہ ردیف کو بیکار ثابت کرتے ہیں، اسی قسم کی کند ذہن منطق سرے سے ہر قسم کی شاعری بلکہ ادب ہی کو لغو چیز بتاتی ہے مگر حضرت نقاد غالباً غزل میں ردیف و قافیہ کے خلاف ہیں، دیگر اصناف سخن میں نہیں۔ اگر قافیہ و ردیف کی غیر فطری قید خلوص جذبات اور اصلیت نگاری کا خون غزل میں کرتی ہے تو نظم کے لئے حلال کیوں؟ کلیم کے اسی نمبر میں حضرت جوش ملیح آبادی کی جو نظمیں درج ہیں جن کی مخصوص بحر ہے، مخصوص قافئے ہیں اور مخصوص اسلوب (Technique) ہے، اس لئے ان کے

www.taemeernews.com

بتائے ہوئے اصول کے مطابق فطری انسان فطری خیالات یا فطری جذبات ان میں نہ سمانا چاہئے۔ غزل کے لئے قافیہ وردیف کو غلط وغیر فطری بتانا اور خاقانی کے قصاید۔ فردوسی کی مثنوی عمر خیام کی رباعیوں اور نظم گو شعراء کے مسدس، قطعات اور منظومات میں ردیف و قافیہ کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے کیا "In memorium" لکھتے ہوئے ٹینی سن Tennyson کے پر خلوص جذبات غم انہیں قافیوں کی شکل میں پیدا نہیں ہوئے جن میں وہ نظم لکھی گئی ہے۔

مختلف العنوان اور باہم بے ربط اشعار جو غزل میں ہوتے ہیں ان کا اصول آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے غزل کہنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر چونکہ آپ کی غزلوں کے اچھے شعر بھی نظمیت سے بالکل پاک نہیں ہو سکتے تھے اور ٹھیٹھ تغزل اپنی غزلوں کے ایک شعر میں بھی آپ پیدا نہیں کر سکے اس لئے آپ کو اپنے اوپر غصہ آیا اور تحلیل نفسی (psycho-analysis) کے قوانین کے مطابق وہ غصہ آپ نے اتارا غزل پر

سرزم سے اس کی جو ہم ہو کے بتنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

اگر نقاد کی طبیعت کو بجائے غزل کے نظم سے فطری مناسبت ہے تو انہیں اس قدر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اگر کوئی نظم گو ایک شعر کے مصرعوں کو اتنا جامع و مکمل نہیں بنا سکتا تو یہ کیوں کر لازم آیا کہ محض ایک شعر کے دو مصرعوں میں وجدان کا چھکا دینے والا بھرپور اثر پیدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ہر شراب بیر (Beer) اور اسٹاؤٹ (Stout) نہیں ہوتی۔ آپ غزل اور غزل کے اشعار کو کہتے ہیں۔ کیا حضرت بلالؓ کی موت کی روایت آپ بھول گئے۔ صرف اذان کے رسمی متعارف اور متداول اور مختصر الفاظ کے پڑھتے ہی ان کا دم نکل گیا۔

میں جاپان کی اس شاعری کا ذکر کر چکا ہوں جس میں ایک نظم صرف آٹھ الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ہندی دوہوں کا بھی ذکر چکا ہوں۔ آخر رباعی کے چار مصرعے اور ہر رباعی کے موضوع اور مفہوم کا باہم بے ربط ہونا اور کبھی کبھی متضاد اور متصادم ہونا وجدان میں تشنگی کا احساس یا تکلیف دہ ہیجان کیوں نہیں پیدا کرتا۔ انگریزی Sonnet یا چار سطر کا Stanza اور کبھی کبھی ایک مصرع یا آدھا مصرع کیوں قیامت ڈھا دیتا ہے۔ جب مہادیو سے پاربتی نے پوچھا کہ میں آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہوں تو انہوں نے کہا کہ کسی گیت یا ترانہ کی اس کڑی کی طرح جو پوری نہ سنائی پڑے، میں پوچھتا ہوں کہ حضرت نقاد کے نزدیک تغزل کا مقیاس (Lyric unit) کیا ہے۔ ہم آپ اور حضرت نیاز سب دہریے سہی لیکن اس سے تو انکار نہیں کہ کروڑوں اربوں آدمیوں کے تخیل نے اسے مان لیا ہے کہ صرف ایک لفظ کن کے اثر سے پوری کائنات کی تخلیق ہو گئی۔ بندہ نواز غزل کے ایک شعر میں اتنا اثر کیوں ہوتا ہے اس کے ثبوت میں اگر

www.taemeernews.com

دلائل پیش بھی کئے جائیں تو وہ سورج کو چراغ دکھانا ہوگا کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جہاں تک غزل کا تعلق ہے غزل کے آغاز آفرینش سے آج تک کروڑوں آدمی غزل کے ایک شعر سے تڑپ تڑپ اٹھے ہیں۔ ایک ایک شعر نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اب اگر کسی کو غلط یا مبتذل شعر پر وجد آجائے اور کسی کو لطیف و بلند شعر پر پھریری تک نہ آئے تو پھر یہ سوال ذوق و وجدان کا نہیں بلکہ کسی دماغی مرض کا ہے اور اس سے ہمیں کوئی علاقہ نہیں انگریزی میں ایک کہاوت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دو ہم پیشہ آدمی کبھی ایک رائے نہیں ہوتے حضرت نقاد نظم ضرور کہتے ہیں اور غزل کہنے میں انہیں تکلف ہوتا ہے اسی سے وہ غزل سے دست و گریباں ہیں۔ مندرجۂ بالا انگریزی کہاوت کے باوجود بھی میں کہوں گا کہ حقیقی غزل گو بڑا اسیر چشم اور بے نیاز ہوتا ہے اور وہ نظم کہنے والوں سے الجھتا نہیں۔ دیکھئے آتش نے بقول محمد حسین آزاد، میرزا دبیر کی کتنی مختصر اور جامع تنقید کر دی تھی۔ یہ غزل گو چند الفاظ میں دبیر کو عمر بھر کے لئے اصلاح دے گیا۔

چمن میں کھیلتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل سے
مگر باد صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اگر چہ اردو غزل جو فارسی کے مقابلہ میں کل کی چیز ہے ایسے ہزار ہا اشعار پیش کر سکتی ہے جن کے دو دو مصرعوں میں ایک ایک دنیا ہے لیکن ایسے اشعار کن مصیبتوں سے ہوتے ہیں اس کا اندازہ حضرت نقاد نہ لگائیں تو اچھا شمع و پروانہ کتنا عام پامال اور فرسودہ موضوع ہے۔ اب غالب کے تین شعر اس موضوع پر لیجئے:۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ان کے بعد ذوقؔ کا یہ شعر پڑھیئے:۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

غالبؔ کے شعروں کا ہر ہر لفظ ایک دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ذوق کا شعر ان کے

www.taemeernews.com

سامنے بہت ہلکا اور سونا معلوم ہوتا ہے۔

آسی غازی پوری کا شعر ہے:۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یاد گار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

عزیز لکھنوی کہتے ہیں:۔

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یاد گار حسن وعشق ایک داغ دل پر رہ گیا

یاس کا شعر ہے:۔

زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشنا بدلی
اٹھے سب بزم سے بیگانہ شمع سحر ہوکر

الغرض ایک شعر میں دنیا بھر دنیا آسان کام نہیں ہے۔اسی قسم کے اشعار میں وہ شعر بھی داخل ہیں جنہیں سہل ممتنع کہتے ہیں۔ دنیا بھر کے شعرا نقاد اور فلسفی اس امر میں متفق ہیں کہ شعر وادب کے تمام محاسن تمام سحر کاریوں کے مقابلے میں وہ بے نام صفت دماورائے لفظ بیان خصوصیت جو شعر کو سہل ممتنع بنادے کہیں بڑھ کر ہے۔ دنیا کی الہامی کتابوں میں یہ صفت کثرت سے ملتی ہے۔لیکن ہر آیت یہاں بھی سہل ممتنع نہیں۔اس کے بعد صرف غزل کو ایسے اشعار نصیب ہوجاتے ہیں۔ عظیم ترین اردو نظم میں بھی سہل ممتنع کی مثالیں شاید ہی ملیں۔ایک اور بات اور بڑی اہم بات لگے ہاتھوں کہہ دوں کہ پوری نظم یا بہترین نظم کے بہترین اشعار میں بھی وہ ٹھیٹھ انسانیت اور وہ مانوسیت نہیں پیدا ہوتی جو غزل کی جان ہے۔ نہ وہ شاعرانہ معصومیت (Lyric innocence) نہ وہ خلاقانہ سادگی (Creative simplicity) آسکتی ہے جو غزل اور صرف غزل کی پاکیزہ ترین خصوصیت ہے۔ نہ پوری نظم میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے جو غزل کے متعدد اشعار میں پیدا ہوجاتی ہے مثلاً

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہیں لطافتوں کو نظم میں نہ پاکر حضرت نقاد رہ رہ کر غزل پر دانت پیستے ہیں۔ کسی ماہر نفسیات نے سچ کہا ہے کہ عتاب معتوب کی تقلید کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ حضرت نقاد پر گوئی کے قائل معلوم ہوتے ہیں وہ طویل اور مفصل اور سیر حاصل نظموں سے نیچے بات نہیں کرتے مگر شاعر کے بارے میں اہل یونان کے ان نکات سے بے خبر ہیں کہ (The part is greater than the whole. (جز وکل سے بڑا ہے)

Sow with the hand and not with the wholsack. (کاشت ہاتھ سے

www.taemeernews.com

کرو بورے سے نہ کرو)

غزل کی داغ بیل ڈالنے والے اور غزل کے اصول مرتب کرنیوالے اس راز کو سمجھتے تھے اسی سے غزل میں زیادہ لنگر دار اشعار مستحسن نہیں سمجھتے تھے اور جامعیت واختصار کو انہوں نے اتنی اہمیت دی۔

اب میں پلٹ کر مطلع، مقطع، ردیف، قافیہ اور غیر مربوط اشعار غزل یعنی غزل کے اسلوب (Technique) کی بحث پر آتا ہوں۔ سنئے انگریزی شاعری میں (Sonnet) کا اسلوب بظاہر اتنا سہل ہے کہ ہر تک بند سانیٹ کے چودہ مصرعے اس کی مخصوص بحر اور مخصوص ترتیب قوافی کے مطابق موزوں کر لیتا ہے مگر اس کے اسلوب کی پیچیدگیوں کو نباہنے میں شیکسپئر تک کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ ٹھیک یہی حال غزل کا ہے۔ کے بار بتاؤں کہ غزل بہت دق کرنیوالی چیز ہے۔ اس سے مشکل کوئی صنف سخن نہیں ہے موجودہ زمانہ میں فنون لطیفہ کی تنقیدی اصطلاحات میں ایک لفظ بہت کارآمد ثابت ہوا ہے۔ وہ لفظ ہے (Pattern) یعنی نمونہ یا سانچہ غزل اور نظم تو درکنار پروفیسر سنٹیس بری Professor Saintsbury نے اپنی کتاب History of English Prose Rhythm میں شروع سے آج تک کی انگریزی نثر کی تقطیع کر کے۔ رکھدی ہے۔ آرٹ کی ہر تخلیق میں غیر شعوری طور پر Pattern یا سانچہ بن جایا کرتا ہے غزل کی موج ترنم متعینہ بحر میں دو برابر ہلکورے لیتی ہے۔ بحر کے ساحل یعنی ردیف پر پہلی موج کو لپیٹتی ہوئی دوسری موج ٹوٹی مطلع بنا اور غزل کا راگ مل گیا۔ (غزل گو کے لئے لازم نہیں کہ پہلے مطلع کہے یا مطلع کا پہلا مصرع پہلے کہے۔ نظم کہنے میں بھی یہ ضروری نہیں یہاں بحث آرٹ کی مکمل تخلیق سے ہے۔ اس کے جزوی مدراج عمل (Proesses) سے متعلق نہیں پھر موج پلٹی اور بحر کی پہلی سرحد سے پھر ابھری اور نقاش کے قلم کی طرح پہلی داغ بیل یعنی Pattern کے بنیادی حصے کو ادنیٰ تغیر اس نے دہرایا اور یوں دوسرا شعر پیدا ہوا اور اسی طرح جزر و مد اور زیر و بم کے ساتھ تموج کا یہ سلسلہ مقطع پر جا کر ختم ہوا۔ غزل سات شعر نو شعر گیارہ شعر پر ختم ہوئی۔ بہت لوگوں نے غزل کی طرح کے لغوی معنیٰ پر غور نہیں کیا۔ طرح کے معنیٰ ہی نمونہ یعنی Model یا Pattern ہیں۔ غزل کے معنیٰ طرح میں مضمر ہوتے ہیں۔ مختلف بحروں میں الفاظ کے بلیغ ارتعاشات بدل جاتے ہیں۔ اگر آپ پوچھیں کیوں ایک مقررہ تعداد پر اشعار ختم ہو جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ ہر فنی عمل Work of art کا حجم Size فنکار کے وجدان اور اس کے قوت ممیز (Artistic discretion) کی چیز ہے۔ بتا یہ رہا ہوں کہ قافیہ میں آواز کی یکسانیت وحدت و کثرت، تنوع اور ہم آہنگی، تکرار و تجدید کے اس لطیف رابطہ سے متعلق ہے جو ایک Pattern کی خصوصیت ہوتی ہے جس سے غزل کی تشکیل میں یکرنگی Unity پیدا ہوتی ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بحر زمین مطلع، مقطع، قافیہ اور ردیف یہ سب غزل کے سانچے کے نہایت دھندلے عکس یا نشانات ہیں۔ کچھ اور دھندلے عکس بھی ہیں۔ یعنی بحر کے ارکان جو غزل کے

www.taemeernews.com

Rhythm یعنی زیر و بم، تال وسم حرکت وسکون، چڑھاؤ اتار کے حدود ہیں۔ معاملہ یہاں بھی ختم نہیں ہوتا۔ شعر کے الفاظ، ان الفاظ کی آواز، ان میں حروف علت کی آوزوں (Vowel Sounds) حروف صامت کی آوازوں (Consonant sound) کی ترتیب اور صوتی اثرات (Sound effects) بحر وارکان بحر کے لئے وہی کام کرتے ہیں جو مصوری میں خطوط کی نرمی (softness) ان کی قوت (Vigout) ان کا لوچ، ان کی معنویت، ان کا اثر، اور پھر بعد کو رنگ آمیزی یہ سب الگ الگ اور مل جل کر کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان الفاظ اور ان کے سماعی تال سم (Sound rhythm) اور معنوی تال سم Sense rhythm کی خلاقانہ آئینہ داری شروع ہوتی ہے اسی فن کے داخلی و خارجی اجزا کے نازک ربط کا راز مضمر ہے۔ یہیں سے نقالی وخلاقی کا پتہ چل جاتا ہے یہیں شعر کے فرسودہ ورسمی یا ایک زندہ فنی تخلیق (A living work of art) ہونے کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور شعر کے انہیں اجزائے ترکیب کی تشکیل اور باہم ربط واثر میں اس کی تکمیل Finish کا راز پنہاں ہے۔ یہ تجزیہ وتحلیل بھی کہاں کافی ہے شعریت ایک ماورائے ''لفظ وبیان'' اور ماورائے مفہوم چیز ہے۔ جمالیاتی روح یا جوہر Aesthetic (Content) شعر کا بعد رابع (Fourth dimension) ہے جو انتہائی سادہ اور انتہائی پیچیدہ چیز ہے۔ اضافیات شعری Poetic relativity میں جمالیاتی روح کا وہی درجہ ہے جو فلسفہ میں واقعیت کا۔ اس کے اثر سے اجزائے شعر وجود میں آتے ہیں۔ باہم مربوط منسلک اور ہم آہنگ ہوتے ہیں اور یہی شعر کی رگ وپے میں جاری اور ساری رہ کر شعر کے تمام محسوس ومعلوم اجزا سے ماوراء ابھی ہوتی ہے۔ میں اشعار کی یہ جراحی کر.نے زیادہ خوش نہیں۔ بہر حال یہ تجزیہ وتحلیل حساب دوستاں درد دل کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے۔

لیکن سانچے یا نمونے کے خطوط اور اثرات کی یک رنگی وتنوع (Unity and variety) تکرار وتجدید (Repitition and renewal)

شعر کے اجزائے ترکیبی اور پورے شعر سے آگے بڑھ کر ایک متموج تسلسل کے ساتھ نظم یا غزل کے آخری شعر یا مقطع ہو جاتے ہیں۔ اور غزل یا نظم کا مکمل سانچہ عالم اکبر میں عالم اصغر (A microcsm in a macrocosm) کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے چنانچہ ایک غزل یا نظم کے تمام اجزائے ترکیبی اور پوری نظم یا غزل میں تشکیل کے وہی رابطے اور ضابطے کارگر اور رونما ہوتے ہیں جو خلیوں (Cells) اور ایک جاندار (Organism) میں نظر آتے ہیں۔

میں نے ابھی ابھی نظم وغزل دونوں کا ذکر کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سانچہ (Pattern) کی اس تشریح میں غزل ونظم کو ایک دوسرے سے الگ کیوں کر کریں؟ غزل بھی موزوں اور منظوم کلام کی ایک صنف ہے اور اس کی ایجاد جمالیات کی تاریخ میں اتنا بڑا معجزہ ہے کہ اگر تہذیب ایران کے تمام کارنامے

www.taemeernews.com

بھلا دیئے جائیں تو بھی یہ تنہا ایجاد ایران کے مہذب وجدان کے روایات و اثرات کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ عجمیت نے غزل کی ایجاد پیش کر کے انسانی تمدن کی جلا اور ارتقائے نفس کے لئے وہ سحر کار آلہ دے دیا ہے جو حیات کی تابندگی اور لرزش کو رشک مہر و ماہ بنا سکتا ہے۔

عجمیت تھی جس نے دنیا میں
کفر و ایماں کا کر کے پاک حساب
ٹھیٹھ انسانیت کو سمجھا تھا
سب کے بس کا نہیں یہ جوہر ناب
خوشہ چیں اس کے لاکھ ہوں ہشیار
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب

جسے آج ہم نظم کہتے ہیں، اسی میں اور غزل میں کیا فرق ہے۔ نظم یا تو بیانیہ ہوگی یا منظریہ یا مفکرانہ اور جذباتی، بیانیہ اور منظریہ نظم کے سانچہ (Pattern) میں خارجی پہلو نمایاں اور غالب ہوگا۔ مفکرانہ اور جذباتی نظم غزل کے بہت قریب آجاتی ہے۔ یہاں نظم اور غزل کی سرحدیں ملنے لگتی ہیں۔ نظم اور غزل کے درمیان رباعی اور قطعہ گم شدہ کڑی (Missing link) کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ یہاں اسالیب نظم سے براہ راست بحث نہیں ہے مگر اسے بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بیانیہ اور منظریہ نظم میں داخلی پہلو کے محدود و مخصوص مادی لوازمات کی متابعت کی وجہ سے اس کے داخلی پہلو میں بھی ایک قسم کی تخصیصیت (Particularism) آجاتی ہے۔ اس میں بجائے حیات اور آفاق کے لامحدود اثرات کے مخصوص و متعین واقعات و مناظر کا محدود اثر پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے نہ ہوتے ہوئے سنسکرت، یونان اور یورپ کی دوسری زبانوں کے ادب میں منظریہ شاعری کم مگر رزمیہ (Epic) اور ڈرامہ سے لے کر مختصر بیانیہ نظمیں ایک مرکزی معنویت کی تحت میں مرتب ہوئی ہیں اور ان میں ایک مرکزی حقیقت ہمہ گیر وسعت کے ساتھ رونما ہوگئی ہے۔ نظم کے خارجی اجزا اس حقیقت و معنویت کے بیک وقت حامل بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان کے تابع بھی۔ درڈس ورتھ کی بیانیہ نظم مائیکل (Michael) اس کی شاندار مثال ہے۔ مگر نظیر اکبر آبادی، سودا، انیس، حالی، اقبال، اور جوش کی بیانیہ نظموں اور اردو کی متعارف و متداول نظموں میں اس مرکزی حقیقت و معنویت کی اتنی اچھی مثالیں کم ملتی ہیں۔ اردو کی بہت سی متعارف و متداول نظمیں ہنوز ایک حسین طول عمل سے زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں سانچہ ہی سانچہ ہے۔ اب رہیں جذباتی یا مفکرانہ نظمیں سو یہاں بھی اردو کی متعارف و متداول نظموں میں صورت حال زیادہ بہتر نہیں اور غزل کے اشعار کی تکمیل اور جامعیت کو یک گونہ کمزور کر کے اسے منطقی یا شاعرانہ استدلال و بیان کا مرہون منت کر دیا جاتا ہے۔ اور جذبات کے غیر منقسم اثر کو ایک خوشگوار انتشار کی شکل میں پیش کر دیا

www.taemeernews.com

جاتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی یہی بات یوں کہی ہے کہ عموماً اردو نظم اردو غزل کا بہروپ یا اس کی تلبیس ہے۔

نظموں سے گزر کر جب ہم غزل پر نظر ڈالتے ہیں تو خانہ سانچہ یا نمونہ (Pattern) کے بارے میں جو کچھ اب تک کہا گیا ہے یا جو کچھ سمجھا گیا ہے اس سے زیادہ نازک طرز بیان اور نازک احساس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک مولوی صاحب سے ایک لڑکے نے ایک نہایت بے تکے مصرع کو سمجھنا چاہا۔ وہ مصرع یہ تھا:۔

ہے سپستاں فارسی، ہندی لسوڑا سانپ کا

پہلے پانچ لفظوں سے جو فقرہ بنا ہے اس کا مطلب تو لڑکا سمجھ گیا مگر اخیر کے دو لفظ یعنی سانپ کا اس فقرہ میں کیوں جوڑ دئے گئے اسے لڑکا سمجھ نہ سکا۔ مولوی صاحب نے کہا اب 'سانپ کا' تو ردیف ہے اسے تو لانا ہی پڑے گا۔ غزل کے اسلوب میں قافیہ، ردیف اور بحر کے قیود کے ساتھ مختلف مضامین کے اشعار کا ہونا جن میں منطق و نفسیات یا مانوس و متعارف انداز گفتگو کی رو سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ ایک عجیب صنف سخن معلوم ہوتی ہے جو حضرات اپنی عتاب آمیز حیرانی کا یا حسرت آمیز عتاب کا اظہار غزل کے اسلوب اور سانچے پر کرتے ہیں وہ اپنے کند وجدانی احساس کی حمایت میں غزل گو شاعر سے مسلسل غزل یا قطعہ یا نظم لکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے وجدان میں وہ لوچ، وہ لطافت وہ ذکاوت نہیں جو ایک شعر سے آسودہ ہو سکے اور مختلف عنوان سے بظاہر بے ربط اشعار میں لطیف و پنہاں ربط کا پتہ پا سکے۔ اشعار غزل کے ارتباط (Unity) کا سوال یوں سمجھئے کہ ڈرامہ کے روابط یا تمثیلی آحاد (Unities of the Drama) کا پرانا سوال ہے جس پر ارسطو کے شعریات میں بحث کی گئی ہے اور اس بحث میں بڑے بڑے فن کار اور نقاد ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ شیکسپیر نے تو ان روابط و آحاد کے نباہنے میں مروجہ مفہوم و نظریات کے وہ پرزے اڑائے اور زمان (Place) مکان (Time) اور حرکت (Action) میں وہ نیرنگیاں پیدا کیں، المیہ (Tragedy) مذاحیہ (Comedy) رومان (Romance)

فطرت اور فوق الفطرت Nature and supernatural کردار نگاری (Characterisation) شاعری اور نہ جانے کتنے غیر متعلق و متضاد و اجزء کو ملا کر وہ شاعرانہ مزاج Poetic anarchy پیدا کر دیا کہ لوگ اب تک اس بات پر کٹ مر رہے ہیں کہ شیکسپیر تمثیل نگار (Dramatist) تھا یا شاعر (Poet) اور ایک نقاد نے تو یہ لکھ دیا ہے The shakespearean world is a jungle without law. شیکسپیر کی دنیا ایسا جنگل ہے جس کا کوئی قانون ہی نہیں۔

بظاہر بالکل بے ربط خیالات یا احساسات یا واردات میں مطابقت و یک رنگی پیدا کرنا اور وہ

www.taemeernews.com

بھی تنگنائے غزل میں فنکاری کا اعجاز ہے۔ رابطہ (Unity) کا تصور (Conception) منطقی استدلال و تسلسل سے ماوراء ہے۔ یہ رابطہ یا اعادہ ہے کیا چیز؟ ایک آم کے پھل کو لے لیجئے۔ اس کا رنگ روپ اس کا اثر اور اس کے دوسرے صفات و خصوصیات میں کون سا منطقی ربط ہے۔ صورت و سیرت کے ان مختلف اجزء کا ناگزیر طور پر ترکیب پا جانا کن اسباب یا کس قانون کے زیر اثر ہے اگر ہمارا ذہن وجدان سے علیحدہ (Divorced) ہو کر آم کا احساس کرے تو آم کی وحدت کا تصور ہو ہی نہیں سکے گا۔ غزل تو دور رہی نظام شمسی اور اس کی ہر واحد ہستی اور اس کے اجزاء بالکل اُنمل اور بے جوڑ چیزیں نظر آئیں گی اگر ہم آپ اور حضرات نقاد ہیوم (Hume) کے فلسفہ اور لاجواب کر دینے والے دلائل سے استفادہ کریں تو کسی چیز کے اجزاء و صفات میں کوئی ربط نہ ملے گا مثلاً شکر کی سفیدی اور شیرینی میں کوئی ربط نہ ملے گا۔ Kant کا قول ہے کہ کائنات کے غیر مربوط اور منتشر اجزاء میں نظام (System) اور اتحاد (Unity) انسان میں عقل (Reason) پیدا کرتا ہے لیکن منطق اور عقلیت کی اس لاچاری سے قطع نظر کر کے جو تنوع و بے ربطی میں الجھا کر رکھ دیتی ہے جب ہم وجدان کی مدد سے کسی شئے یا تمام کائنات پر نظر کرتے ہیں تو ترتیب (Order) و نظام (System) اور ذرا غور کرنے سے سانچہ (Pattern) کا صاف احساس ہو جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ منتشر اور بالکل غیر متعلق اجزا سے تمام کائنات کی تخلیق و تشکیل ہوئی ہے گویا یوں سمجھئے کہ فطرت بڑی دور سے مصرعے لگاتی ہے۔

غزل میں مختلف بے ربط عنوانات محض کسی خارجی قانون کی پابندی سے بحر اور قافیہ و ردیف کے شکنجے میں نہیں کس دئے جاتے ہیں۔ غزل کے اشعار کا اتحاد (Unity) محض خارجی اتحاد نہیں ہے یہ اتحاد سراسر داخلی ہے۔ غزل کے مختلف اشعار کے مختلف مفہوم و معانی ایک آہنگ احساس کی تحت میں رونما ہوتے ہیں اور اسی آہنگ احساس سے غزل کا سانچہ تیار ہوتا ہے ہم بیک وقت مختلف اشعار کے معانی و مفہوم میں تنوع و یکسانیت، تفرقہ و اتحاد نیرنگی و ہم آہنگی کا احساس کرتے ہیں اور اس احساس کے محض خارجی محرکات تو بحر ردیف و قافیہ ہیں مگر اس کا اصلی راز وہی آہنگ احساس ہے وہی ایک غیر منقسم کیفیت ہے جو غزل کے ہر جزو میں جاری و ساری ہے۔ انگریزی لفظ Wit کی ایک یہ تعریف کی گئی ہے کہ بے ربط اور غیر متعلق خیالات میں ربط کا احساس کرنا Wit کا کام ہے غزل کے مختلف اشعار بیک وقت بے ربط اور باربط ہیں۔ ہر شعر کا اثر دوسرے اشعار دوسرے معانی سے ہم نوا اور ہم آہنگ ہو کر نغمہ غزل کے تموج کی ایک لہر بن جاتا ہے جس کا انفرادی وجود معنوی و سماعی ترنم سے مل کر تیز تر ہو جاتا ہے کیا انفرادیت کا راز اپنے ماحول اور اپنے ہم جنسوں سے ایک پنہاں مطابقت اور لطیف ہم آہنگیوں میں ہے یا محض منطقی مطابقت اور خارجہ ہم آہنگی میں ہے؟ فنون لطیفہ بہت بلند ارتقائی مدارج پر پہنچ کر کسی ایک تخلیق (Creation) میں مختلف عنوانات اور غیر مربوط اور ایک دوسرے سے دور افتادہ موضوعات کو مربوط و

www.taemeernews.com

یکجا کر پاتے ہیں۔فن لطیف کی ایک تخلیق جتنی بلند اور لطیف ہوگی اس کی یک رنگی اتنی ہی پر تنوع اور پیچیدہ ہوگی۔شیکسپیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کردار ہی ماجرا ہے اور تماشا گاہ انسان کا دل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل کا ایک شعر بالکل مکمل ہوتا ہے کبھی کبھی تو ایک مصرع بذات خود اور بجائے خود ایک دنیا ہوتا ہے اور سننے والے کہہ دیتے ہیں کہ دوسرا مصرع پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر غزل کے دوسرے اشعار بھرتی کے نہیں ہیں تو غزل کے اشعار ایک دوسرے کے اثرات کو اور چمکا دیتے ہیں۔اور مل جل کر پوری غزل کا ایک مجموعی اثر بھی پیدا کرتے ہیں۔کلیات اکبر آلہ آبادی میں نہ جانے کتنے اشعار اسی وجہ سے دفن ہو کر رہ گئے کہ وہ مفردات کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔نظم یا غزل میں ایک چیز وہ ہوتی ہے جسے ہم مفہوم کہتے ہیں دوسری چیز اس کا مجموعی اثر Total effect ہوتا ہے اور تیسری چیز ایک اور ہے جسے ہم فضا کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں جو مفہوم کے تسلسل کے علاوہ احساس و کیفیت کا تسلسل بھی رکھتی ہے غرض کہ سانچہ کا تصور یک رنگی کا تصور، مطابقت کا تصور اور تناسب کا تصور غزل کے باب میں حد درجہ نازک و لطیف ہو جاتا ہے یہ نزاکت و لطافت غیر مربوط اجزاء میں ہم آہنگی رونما ہونے سے پیدا ہوتی ہے غزل سماعی تخیل کی بہت نازک و پنہاں لرزشوں سے پیدا ہوتی ہے نظم میں تو مادی، خارجی، خیالی اور منطقی تسلسل بحر اور قوافی کے الفاظ کے سانچے میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔غزل میں ہر طرح کا عدم تسلسل آہنگ احساس اور آہنگ سماعی یعنی بحر و قافیہ کے الفاظ کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔اسی سے غزل کے الفاظ اور ان کے معانی و ترنم میں جو حلاوت اور تحت الغزل صفت پائی جاتی ہے اور اس کی نواؤں میں جو خموشیاں سموئی ہوتی ہیں، وہ نظموں میں مفقود ہوتی ہیں۔غزل کے شعر اور اس کے الفاظ میں ایک نرمی و مانوسیت اور یگانگت ہوتی ہے اور تیز آہنگ الفاظ تو کیا زیادہ رنگین الفاظ بھی غزل کے نازک سانچہ میں بے محل ہیں۔غزل ایک مکمل مگر بہت نرم و نازک صنف نظم ہے خواہ مخواہ مختلف غیر مربوط اشعار کو بحر اور قافیہ و ردیف کے قیود میں لا کر یکجا کر دینے کا نام غزل نہیں ہے۔ مسلسل غزل ایک تناقضی اصطلاح A contradiction in terms ہے۔غزل کی مسلسل اور واحد العنوان بنانے کی کوشش بالکل ایسی ہے جیسے کسی زندہ جمیل پیکر انسانی سے ایک سڈول لکڑی ہو جانے کا احمقانہ مطالبہ کیا جائے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر ہمارے ذوق شاعری کی رگیں واقعی حساس ہیں تو اعلیٰ قسم کی غزل فنون لطیفہ میں سانچہ کے سحر کارانہ استعمال کا ایک معجزہ ہے جس سے وجدان کو تنوع و یکسانیت کا وہ احساس ہوتا ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں۔میر نے نصر کے ایک مطلع پر وجد کرتے ہوئے قدر شناس و محبت آمیز رشک کے ساتھ کہا تھا کہ تخلص نے نصیر سے مطلع کہلوالیا۔وہ مطلع ہے:

خیال زلف دوتا میں نصیر پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

لیکن اور لوگ میر کے احساس وجدان سے بے بہرہ ہوتے ہوئے محض خارجی و میکانکی تک

www.taemeernews.com

بندیوں کو غزل سمجھتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ رواں دواں مصرع یا شعر یا اچھی خاصی غزل میں نہ شاعر کا خلوص کارگر ہے نہ تجربہ نہ تخیل بلکہ زمین غزل نے اتفاق سے شعر کہلوالئے۔ ٹینیسن نے A dull mechanic exercise کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شعر کہنے میں اتفاق یا حسن اتفاق یا خوش توفیقی وہ پر اسرار معمہ ہے جس کے قائل ماہرین نفسیات اور ماہرین جمالیات بھی ہیں۔ لیکن جس کا تجزیہ و تحلیل اور جس کے اسباب کی جڑوں تک پہنچنا سائنس فلسفہ اور عقل کسی کے بس کا کام نہیں۔ اسی کو مذہب میں (Grace) کہا گیا ہے۔ کوئی زمین خواہ کتنی شگفتہ ہو شاعر سے اعلیٰ غزل نہیں کہلوا سکتی۔ شاعر کے کلام کو زمین نہیں چمکاتی بلکہ شاعر کی عظمت اس کا کمال اور اس کا آہنگ احساس زمین غزل کو چمکا دیتا ہے:۔

خرام جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسم بہار نہ تھا

غزل میں قافیہ و ردیف کا مضحکہ اڑانا بھی ایک عامیانہ حماقت ہے۔ تک بندی نظم میں بھی ہوتی ہے غزل ہی میں نہیں لیکن قافیہ اور ردیف کا برمحل اور خلاقانہ استعمال ہر ماسٹرس وائس Master Voice کی مثال نہیں ہے۔ بلکہ قافیہ اور ردیف کا اتنا فطری اور سحر کارانہ استعمال خود نہ کر سکنے پر اس احساس معذوری کے ردعمل کے لئے ایک عام غلطی کا سہارا لے کر قافیہ و ردیف کو برا بھلا کہنا خود اپنی بد ذوقی کی غمازی کرنا ہے۔ غزل کے سانچہ میں قافیہ و ردیف وہ منزلیں ہیں وہ سخت و نازک مقام ہیں کہ بڑے بڑے غزل گو شعرا کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ شاعر کی شخصیت کی سب سے گہری تہیں یہیں پنہاں ہیں۔ ہر ہر قافیہ میں شاعر کے واردات حیات، تجربات احساسات اور نقد حیات کے راز مضمر ہیں۔ قافیہ و ردیف، تحلیل نفسی کے ان محرکات Psycho-analytical suggestion کا کام کرتے ہیں جو حیات شاعر کے بظاہر فراموش لیکن حقیقتاً کبھی فراموش نہ ہونے والے واقعات اور واردات کی ترجمانی میں محرک اور معاون ہیں۔ تجرباتی نفسیات کا یہ مسلم قاعدہ ہے کہ معمولی (Subject) کو کچھ الفاظ سناتے ہیں جن سے اس شخص کو بھولے ہوئے واقعے اور تحت الشعور احساسات یاد آجاتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں صدہا آدمیوں کو بم پھٹنے یا کسی اور اچانک صدمے کی وجہ سے نسیان Aphasia ہو گیا تھا۔ ان کی یادداشت کے احیا کے لئے یہی طریق عمل اختیار کیا جاتا تھا اور اکثر کھوئے ہوئے حافظہ اپنے گمشدہ شعور یا اپنے کو پھر سے پا جاتے تھے۔ غزل میں قافیہ اور ردیف کا یہی کام ہے۔ شاعر کی سوئی ہوئی شخصیت کو قافیہ اور ردیف جگا دیتے ہیں۔ مگر یہ صرف غزل میں داخلی اور نفسیاتی شاعری میں ممکن ہے نظم میں بالکل ناممکن ہے قافیہ نظم میں محض گانے بجانے کی چیز ہے۔ غزل میں قافیے شاعر کی نفسیاتی سوانح عمری کے علامات ہیں۔ قافیہ شاعر کے ذہن کے لئے ایک لحاظ سے پہلا قدم اور دوسرے لحاظ سے منزل پر آخری قدم کا کام دیتا ہے۔ قافیہ بیک وقت غزل کا سنگ بنیاد اور اس کا آخری کنگرہ ہے۔ نظم کی قافیہ پیمائی

www.taemeernews.com

اس ہم آہنگی سے بے بہرہ ہے۔اور دنیا کے بڑے بڑے نظم گو شاعر قافیہ کا استعمال اتنا انسانی، سچا، پرخلوص ،فطری اور اصلی معنی میں نہیں کر سکے، جیسا غزل میں بار ہا ہوا ہے۔غزل میں قافیہ اور ردیف کے کامیاب استعمال کو دیکھتے ہوئے نظم اور نظم کے بہترین حصوں میں قافیہ کا استعمال تک بندی اور ایک خارجی پیوند سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔غزل میں قافیہ اور ردیف کے داخلی انداز کے سامنے نظموں کے ردیف وقوافی میں ایک ذلیل خارجیت ایک بے کیف زیادتی کا احساس ہوتا ہے جو شاعرانہ وجدان کے لئے اکثر تکلیف دہ ہوتا ہے۔اگر کہیں نظم کے قافیوں میں چستی رنگینی یا ترنم مل بھی جائیں تو اشعار کے نفس معانی سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔محض خارجی آہنگ سے یہ باتیں نظم کے قافیوں میں کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک نظم گو کے بلند ترین کارنامہ میں بہتر سے بہتر بند کو لے لیجئے اور جو قافیہ وردیف کا استعمال اس میں ہوا ہے اس کے مقابلہ کے لئے دور کیوں جایئے۔انہیں صفحات میں غزل کے جو اشعار دئے گئے ہیں ان کو دیکھئے تو معنیٰ آفرینی اور قافیہ پیمائی کا فرق معلوم ہو جائے گا۔میرا دعویٰ ہے کہ نظموں میں جو بھی قافیہ آیا ہے وہی غزلوں میں کچھ اس انداز سے آتا ہے کہ کھوٹے کھرے کا بھید کھل جاتا ہے قافیہ غزل کے سانچے کی شعر بہ شعر یا منزل بہ منزل شاندار تکمیل ہے، قافیہ کا دہرانا اسی وجہ سے مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔قافیہ غزل کا طرۂ کمال ہے۔

یہاں تک تو غزل میں مطلع، بحر قافیہ اور ردیف کی بحث تھی اب مقطع کو ملاحظہ فرمایئے۔مقطع غزل کے سانچہ کا وہ نشان ہے جس میں پوری غزل کا احساس تغزل اپنے پورے چڑھاؤ اتار، تیزی ونرمی کے ساتھ غزل کی آواز بازگشت کی پوری تھرتھراہٹ کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے۔اور جہاں زمزمہ تغزل کی سرحدیں سکوت ابدی سے مل جاتی ہیں۔مقطع سوفی صدری داخلی چیز ہے اور اس میں فنسیاتی اور وجدانی ارتعاشات آخری بار جلوہ نما ہوتے ہیں۔اسی سے اول تو مقطع بیشتر نظموں میں ہوتا ہی نہیں اور جہاں ہوتا ہے تو نظم کے قافیوں کی طرح ایک زبردستی کی چیز معلوم ہوتا ہے چونکہ بڑے سے بڑے نظم گو کا وجدان خارجیت کا شکار ہوتا ہے اس لئے ایسا شاعر یا ادیب بہترین غزلوں کے مقطعوں کے نفسیاتی خلوص اور ان کی تیز داخلیت کی تاب نہیں لا سکتا۔ایسے مقطعوں سے اسے چوٹ لگتی ہے۔اور وہ فوراً خارجی غزل گوئی کی آڑ میں چھپ جاتا ہے اور غزل کے خارجی یا رسمی مقطعوں پر اعتراض کرتا ہوا شکست کا حال چھپاتا ہے۔اب آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ غزل ایک مکمل نظم ہے اور غیر مربوط یا منتشر اشعار کا مجموعہ نہیں ہے۔ غزل کے الفاظ میں صرف اسم ضمیر فعل اور صفت ہی نہیں بلکہ حرف جار تک میں جو نرمی، زور، سادگی، رنگینی ،اور ترنم وتاثر پایا جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں نظم کی شاعری ایک شور بے ہنگام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔غزل کا ایک ایک لفظ معجزہ کا حکم رکھتا ہے۔نظموں کی تعریف میں یہ کبھی نہیں سنیئے گا کہ نظم کے ایک ایک لفظ میں ایک ایک دنیائے معانی ہے۔بڑے سے بڑے نظم گو کو زبان میں فصاحت کی ضرورتیں پوری

www.taemeernews.com

کرنے کے لئے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ مگر فصاحت سے گزر کر جب بلاغت سے پالا پڑتا ہے تو نظم کی ساری قصیدہ خوانی دھری رہ جاتی ہے۔ اگر کسی بڑے سے بڑے نظم گو شاعر سے کہا جائے کہ اپ کی کسی نظم میں ایک لفظ یا کئی لفظ بہت بلیغ ہیں تو بقول حسرت موہانی یہی ہوگا کہ:

اے عشق کی بے باکی کیا تو نے کہا ان سے
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

کیونکہ ادب کی اس اہم خصوصیت اور نظم گوئی میں پرانی لڑائی ہے بلاغت اور نظم کا بیک وقت ذکر ہی نہیں ہوسکتا۔ ذیل کے اشعار غزل میں صرف ایک لفظ کہاں کی بلاغت کا احساس کیجئے اور اس لفظ کا یا کسی اور لفظ کا اتنا بلیغ استعمال کسی اردو نظم میں دکھا سکتے ہیں تو دیکھائے۔

دل چاہتا ہے بزمِ طرب میں انہیں مگر
وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں

بات بھی پوچھی نہ جائے گی جہاں جائیں گے ہم
تیری محفل سے اگر اٹھے کہاں جائیں گے ہم

کسی کی آرزو پوری ہوئی ہے
کہاں جیتا رہوں گا امتحان تک

جو ترے دیار میں آرہے ارے کیسے تجھ سے جدا رہے
مجھے کچھ تو اپنا پتہ رہے یہ نہ پوچھ ہم سے کہاں کے ہیں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

دوسرے اور چوتھے شعر میں ''کہاں'' معنویت و بلاغت کا ذکر ہے۔ اور قافیہ کے اس سحر کارانہ استعمال کی مثال ہے جس پر پہلے بحث کر چکا ہوں پہلے اور پانچویں شعر میں یہی لفظ دینائے معانی اور اتھاہ کیفیتیں لئے ہوئے شعریت اور بلاغت کی جان ہو کر ردیف کے خلاقانہ استعمال کی مثال ہے تیسرے شعر میں تو یہ لفظ اس نشریت کے ساتھ استعمال ہوا ہے جہاں تنقید کی سانس رک جاتی ہے۔ محاورہ کا استعمال بول چال کی چاشنی گہرے اور اتھاہ جذبات کے اظہار میں یوں دی جاتی ہے۔ الفاظ کے

www.taemeernews.com

انسلاکات Associations جس پر ورڈس ورتھ جان دیتا تھا اور جن کے امکانات پر Lyrical Ballads کے دیباچہ میں اس نے ناقابل فراموش مقالہ لکھا ہے، ہمیں اپنی روزمرہ کی مانوس زندگی کا وجدانی احساس کراتے ہوئے وہاں لے جاتے ہیں جہاں ورڈس ورتھ ہی کے الفاظ میں We feel that we are greater than we know. بلاغت کا استعمال ہوکر الفاظ اپنے اندر چھپی ہوئی دنیائے معانی کی جھلک دکھاتے ہوئے اپنے لغوی مفہوم سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور مانوس احساسات کو ازل اور ابد کی سرحدوں سے ملا دیتے ہیں۔ الفاظ کا اتنا بلیغ استعمال غزل اور صرف غزل میں ممکن ہے۔ غزل ایک طرح کی غیبی حکیمانہ شاعری ہے۔ آورش غزل کے اشعار تکمیلوں یا عروجوں کا ایک سلسلہ A series of Climaxes ہے۔ نظم میں لفظ ''کہاں'' کے معنیٰ ہیں کس جگہ اور بس یہی تو وہ معذوریاں ہیں جو ان شاعروں، ادیبوں نقادوں کو چین نہیں لینے دیتیں جن کی فطرت میں خارجیت اور نظمیت غالب عنصر ہے۔

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے　　ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

اور انہیں چٹکیوں کا ردعمل گالیوں کی وہ بھرمار ہے جن کی بوچھار غزل پر کی جاتی ہے یہ حضرات داد تنقید کیا دیں گے؟

جو دعائیں یاد تھیں صرف تغزل ہوگئیں

حضرت نقاد نے غزل کو جی کھول کر گالیاں دی ہیں۔ اس سے تشفی نہ ہوئی تو کہنے لگے کہ رقیب روسیاہ کا ذکر غزل میں کیوں آتا ہے۔ کچھ دن ہوئے حضرت جوش نے اپنے نام سے غزل گوئی کے خلاف ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جو کلیم ہی میں نکلا تھا۔ اس میں اور حضرت نقاد کے مضمون میں غیر معمولی مشابہت ہے۔ دونوں میں زور بیان کا تنہا سہارا گالیاں ہیں۔ اس طرح باتیں علم مجلس ہوں تو ہوں لیکن ایک ادیب کے شایان شان نہیں۔ حضرت جوش مومن کے مشہور شعر:۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

کو بے غیرتی کی مثال بتاتے ہیں۔ اس شعر میں احساس کرب کے مضطرب اور بے اختیارانہ اظہار کے باوجود آہنگ الفاظ میں جو روک تھام ہے اسے معترض کا احساس چھو بھی نہ سکا۔ جو سکوت اس شعر میں سمویا ہوا ہے جو تحت الشعر ارتعاشات اس شعر میں موجود ہیں۔ ان کا پتہ چلانے کے لئے بہت مہذب سماعی تخئیل کی ضرورت ہے۔ عشق میں جذبۂ رشک کی تاب خود معترض کو نہیں اور چونکہ آج دنیا غم روزگار اور سیکڑوں کشاکش پنہاں کی وجہ سے یہ محسوس کر رہی ہے کہ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی اس لئے دور حاضر کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سامعین کی ذاتی اور سماجی مجبوریوں کو اور ان کے ذہنی انتشارات کو ان کا ذوق حیات اور فلسفۂ زندگی بتاتے ہوئے حضرت جوش و نقاد نے پہلے حسن و

www.taemeernews.com

عشق ہی کو برا بھلا کہا۔ پھر نفسیات انسانی سے اپنے بیان کی غیر مطابقت کا احساس کر کے چونکے تو بجائے عشق کے غم عشق کو برا بھلا کہا پھر چونکے اور غم ہجر کو پر ضرر بتایا۔ پھر چونکے اور جذبہ رشک کو بے حمیتی اور بے غیرتی سے تعبیر کیا اور چونکہ رقابت کا جذبہ عالمگیر اور ناگزیر ہوتے ہوئے بھی بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے اور آدمی اس سے بچنا چاہتا ہے۔ اس لئے بے نیازی، زندہ دلی خود فراموشی اور ضعف احساس اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ عشق میں جذبہ رشک اور رقابت کو بے حمیتی اور بے غیرتی بتانا اسی خوف کا کرشمہ ہے ورنہ ذرا نفسیاتی خود غرضی سے بچ کر دیکھا جائے تو یہ رشک و رقابت عین غیرت و حمیت ہے اور اس جذبہ سے بیگانگی انتہائی بے غیرتی ہے۔ ناکامیاب یا بدذوق طریقہ پر رشک و رقیب کے ذکر سے بحث نہیں لیکن جہاں پر خلوص اور مہذب انداز سے رشک و رقابت کے اشعار آ گئے ہیں ان میں کیا نہیں ہے:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

نہیں کہ غیر ستائے تو میرے ہو جاؤ
یہی بہت ہے کہ اس وقت کر لو یاد مجھے

مجھے بھی اس کے سوا کچھ خبر نہیں ان کی
دل آشنا ہوئے، اپنے ہوئے پرائے ہوئے

درد وفراق و رشک عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دل شادماں سے ہم

آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
صاف کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں
کوئی دن بو الہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

www.taemeernews.com

دخل کچھ اپنا نہ تھا یارب مزاج یار میں
غیر سے ناراض وہ کیا جانیں کیونکر ہوگیا

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینا پوچھئے اپنی جبیں سے

حضرت جوش و نقاد کو چاہئے کہ وہ شیکسپیر کے Othello میں اوتھیلو کے اس والہانہ اور بے تابانہ اظہار کرب کو پڑھیں۔ جہاں جذبۂ عشق کی سانس رک جاتی ہے Cymbeline میں یاستھومس کی تڑپ اور مجبوری کے اس بے اختیارانہ بیان کو دیکھیں جہاں احساس رشک کی دکھتی ہوئی رگیں کھل کر پھڑکنے نہیں پاتیں — اور کچھ نہیں تو ٹینی سن کی نظم Enoch Arden کو دیکھ لیں جو شروع سے اخیر تک ایک پاکیزہ ترین رقابت نامہ ہے ٹالسٹائی کے Anna Karenina اور ڈاستاوسکی کے Idiot کا مطالعہ کریں ٹماس ہارڈی کے Tess اور دوسرے ناولوں اور نظموں میں رشک کی چنگاریاں اڑتی ہوئی دیکھیں۔ ہومر کے رزمیات (Epics) کو دیکھیں تو ممکن ہے رشک اور رقیب روسیہ پر اپنی جھنجھلاہٹ کا سبب انہیں معلوم ہو جائے۔ حضرت جوش و نقاد کی غزل سے یہ بیزاری اس انحطاط اور کمتری کے احساس Inferiority complax کا ثبوت ہے جو ایک غلام قوم کی غلامانہ ذہنیت او رغرور معکوس Snobbery کا نتیجۂ لازمی ہے۔ ایسے لوگوں میں وجدانی تلخی اور قبول درد کی جرأت وصلاحیت نہیں ہوتی۔ انہیں فی الاصل چڑ تو ہے جذبات عشق کی لطافتوں اور اس کی آزمائشوں سے اور غصہ اتارتے ہیں رقیب رہ سیاہ کے ذکر پر حالانکہ جیسا میں کہہ چکا ہوں آج کل کی عاشقانہ غزل گوئی بجائے معاملہ بندی کے نفسیات عشق وحسن کی ترجمانی کر رہی ہے اور آج کوئی تک بند غزل گو بھی رقیب، عدو، دشمن اور اغیار کا ذکر نہیں کرتا۔

حضرت نقاد نے غزل پر آخری وار امرد پرستی کے الزام سے خوف دلا کر کیا ہے۔ حضرت آزاد انصاری نے ضرورت سے زیادہ احتیاط برتتے ہوئے لکھا تھا کہ غزل کا معشوق اگر کوئی حسین نوجوان ہے تو عاشقانہ اشعار اس نوجوان کے حسن کی تعریف ہیں اور بس۔ اس پر حضرت نقاد داد تنقید یہ کہہ کر دیتے ہیں اور ''بس نہیں معاملہ چودہ برس کی جیل تک پہنچتا ہے۔'' میں پوچھتا ہوں کہ احتساب Inquisition کے زمانے میں مذہبی اور اخلاقی امور میں آزاد خیالی کے جرم میں معاملہ کہاں تک پہنچتا تھا۔ حضرت 'نقاد' یہ

www.taemeernews.com

بیسویں صدی ہے۔ان دھمکیوں سے کام نہیں چلتا۔اس باب میں غزل گو کو کوئی ضرورت اپنے تئیں بے جرم Not guility کہنے کی نہیں ہے۔غزل گو کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ امرد پرستی Homo-sexuality کو محض شاعری یا رسم شاعری بتائے اگر وہ چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ وہ بعض حالات میں امرد پرستی کو جنسیات، جنسی نفسیات اور وجدانیات سے براہ راست متعلق سمجھتا ہے اور چودہ برس کی جیل والی بات سے اس بحث میں نہیں ڈرتا۔تعزیرات ہند یا کسی ملک کے قانون میں جہالت کے جو آثار اب تک باقی رہے ہیں وہ ان سے مرعوب نہیں۔سنیئے جنسیات پر Havelock Ellis سے لرکر اس وقت تک تمام ملک میں جتنی علمی، سنجیدہ اور محققانہ کتابیں لکھی گئیں ہیں۔سب میں کچھ افراد کے لئے ہم جنسی محبت کے جواز کو تسلیم کیا گیا ہے سائنس دان بازاری الزامات سے نہیں ڈرا کرتا۔جب امرد پرستی کو 'غیر فطری' بتایا جاتا ہے تو وہ مرعوب یا سراسیمہ نہیں ہو جاتا۔شرک، کفر، حرام، غیر شرعی خلاف قانون جرم اور جہل یہ الفاظ اخلاقیات یا جمالیات کی بحث سے خارج اور غیر متعلق ہیں۔حضرت نقاد کیا آپ سقراط کے سوانح حیات اور الکی بائیدس اور سقراط کے تعلقات سے واقف ہیں؟ سیزر کے حالات سے واقف ہیں یونان کے عہد زریں یعنی دور فرقلیز The age of pericless کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ پروفیسر جی لوئی ڈکنسن کی کتاب یونانی اسپرٹ The greek spirit نشاۃ ثانیہ The Renaissanec کے قابل احترام اور برگزیدہ اکابر Master minds اور مائیکل انجیلو کے عشق کے حالات تو درکنار ان کا نام بھی آپ نے سنا ہے یونان کی حیرت انگیز اور معرکۃ الآرا بت تاشی میں کون سے محرکات کارفرما رہے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ Walter pater نے اپنی کتاب The Renaissance میں Winklemann پر کیا لکھا ہے اور Edward Carpenter نے اپنی کتابوں Intermediate Sex, Friendships Garland اور "Civilizatio: Its cause and cure" میں کیا لکھا ہے اور خود اس برگزیدہ ہستی کی زندگی کیا تھی؟ حضرت کیا آپ شیکسپئر کے Sonnets اور ان کے محرکات سے واقف ہیں۔ والٹ وہٹمین Walt whitman کے نام اور اس کی نظم سے جس کا عنوان ہے To a Boy سے آشنا ہیں؟ سیفو کا نام سنا ہے؟ اور لفظ لسبیانیت Lesbianism کے معنیٰ آپ کو معلوم ہیں؟ ''چاہ تنہائی'' The well of Lonliness کس مہذب اور پاکیزہ کتاب کا نام ہے؟ D.H.Lawrence اور اس کی تصانیف اور Middleton Murry کی لکھی ہوئی The son of woman سے واقف ہیں کیا ان سب کو چودہ برس کی جیل کا حکم آپ سناتے ہیں؟ اور Tennyson کے لئے Inmemorium لکھنے پر کیا سزا تجویز فرماتے ہیں کیونکہ اس کے امرد برستانہ جذبات اور بیانات پر حال ہی میں کچھ محققوں نے روشنی ڈالی ہے۔رہیں ایشیا کی برگزیدہ ہستیاں جیسے سعدی جس کا حال شعر العجم میں شاید نظر سے گزرا ہو

www.taemeernews.com

جسے اہل یورپ نے ایشیا کا قابل احترام معلم اخلاق کہا ہے، ابونواس، حافظ ظہوری، عرفی، محمود غزنوی، بابر، سرمد اور اردو کے متعدد شعرا اور غزل گوان کے لئے تو اپنی غلامانہ ذہنیت اور عامیانہ تعصبات کے زیر اثر آپ اپنا حکم صادر کر چکے ہیں۔

مجھ سے یہ نہ کہئے کہ ان مشاہیر اور تہذیب و تاریخ کے ان بانیوں اور پیشواؤں کی زندگی میں امرد پرستی محض ایک اتفاقیہ اور خارجی چیز تھی۔ جس کا ان کی عظمت سے کوئی تعلق نہیں۔ امرد پرستی ان کی زندگی کی حساس ترین رگ تھی۔ اقبال کی غزل کبھی اسے حقیقت منتظر میں جو شعر ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں روح الغزل ہے۔ فنون لطیفہ میں نیک و بد کی بحث کے لئے بازاری ذہنیت کام نہیں دیتی شکسپیر کی نایکاؤں Heroines کے کردار میں وہ چٹیلا پن وہ رنگ و بو وہ شعریت و نشریت پیدا نہ ہو سکتی تھی، روز الینڈ اولیویا، واویلا، اموجن اور پرڈتا کی تخلیق اس با اثر اور پر اسرار انداز سے ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس عہد میں عورتوں کا پارٹ کرنے والے حسین اور جمیل نوجوان لڑکے نہ ہوتے۔

غزلوں کے متعدد عاشقانہ اشعار طرز بیان اور خارجی علامات سے قطع نظر امرد پرستانہ جذبات کی وجہ سے کچھ خاص تاثیرات کے حامل ہیں۔ حضرت نقاد اگر آپ کسی اور کو نہ بتائیں اور اس اطلاع کو اپنے ہی تک محدود رکھیں تو میں آپ کو بتادوں کہ میر سوز سے لے کر آج تک اودھ کا کوئی غزل گو امرد پرستانہ زندگی کی اتنی تیز مصوری نہ کر سکا جتنی جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم ''ناسزا جوانی'' میں کی ہے۔ رہی اردو غزل سو بندہ نوازدہ ایک کہربائی تصور Dynamic conception ہے اور غزل کے حرکات کہربائی نظم سے کہیں زیادہ انقلابی رہے ہیں دو قدیم کی ایسی غزلوں سے جن کے اشعار میں حسین لڑکے کا نام تک آجاتا تھا (جیسے وہ غزل جس کی ردیف ہے امرت لال) بتدریج عاشقانہ جذبات کے اظہار میں خارجی اور جزوی عناصر تک ہوتے گئے اور داخلی عناصر اور نفسیاتی تاثرات تیز ہوتے گئے یہاں تک کہ بیسویں صدی کی غزل میں تو کوئی لفظ حتیٰ کہ فعل تک ایسا نہیں آتا جس پر دور سے بھی امرد پرستی کا وہم و گمان ہو سکے۔ مگر جس طرح رقیب روسیا کا شور بے ہنگام اٹھایا گیا تھا اسی طرح بیسویں صدی کے داخلی تغزل پر نظم کی خارجیت کا نہایت تکلیف دہ احساس کرتے ہوئے رشک اور خارجی تخیل سے مجبور ہو کر خارجی الزامات لگا کر کسی طرح اپنی تسلی کر لی گئی۔ آہ جس کی فطرت میں نظمیت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہ ہو اور جو خارجی محرکات کو شاعری کا سب کچھ سمجھ لے اسے یہ کیونکر بتایا جائے کہ غزل کے اشعار عمال کے نام برٹش گورنمنٹ کے آلہ ہدایت Instrument of Instruction نہیں ہیں۔ وجدانیات فوجی قاعدے Army regulations نہیں ہیں۔ جب غالب نے وہ شعر کہا جس کے آخری الفاظ ہیں۔ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔ اس وقت اگر ان کا معشوق بھی آکر یہ کہتا کہ آیئے خلوت میں تاکہ اس شعر سے درس عمل لیا جائے تو یقین مانئے غالب کی روح کو چوٹ لگتی۔ یا جب حالی نے کہا کہ:

www.taemeernews.com

تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

اس وقت دنیا کے سب سے حسین لڑکے کو بلا کر ان کے سامنے حاضر کر دیا جاتا تو وہ اپنا منھ پیٹ لیتے حضرت نقاد ان شعرا کے ان رجعتوں Reactions کو غیر مخلصانہ Insincere بتائیں گے۔ حالانکہ یہ عین خلوص ہوگا۔ فنون لطفیہ اور جمالیات کے ایک اور نکتہ سے بھی حضرت نقاد کو باخبر کر دوں۔ کسی فن لطیف اور خاص کر ادبیات کے اسلوبی اور معنوی خارجی اور وجدانی پہلوؤں میں تفرقہ پیدا کر کے ربط قائم کیا جاتا ہے عرض اور جوہر کی یہ بے ربطیاں ماورائے منطق ہیں۔ فن کے اسلوبی اور خارجی اجزا پر یونانی اجزا برابر غیر فطری ہوں گے معنوی اور وجدانی جوہر Content فطری ہوگا یونانی ڈراما میں ''سنگیت'' اور شیکسپیر کے یہاں دوسرے خارجی عناصر اس کی مثالیں ہیں۔ اور تو اور اگر ادب کی زبان میں بات چیت کی جائے تو یہ اس قدر غیر فطری چیز ہوگی کہ زندگی عذاب ہو جائے گی مگر جس کامیابی سے فطری جذبات کی ترجمانی غیر فطری یا خلاف معمول زبان میں ایک ادیب کر کے دکھا دیتا ہے وہ ہماری واقعی بول چال میں نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی غزل گو عشق و حسن کی جس معنویت اور جن معرا تاثرات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے مؤنث فعل سم قاتل ہوگا۔ اسی سلسلہ میں ایک سوال حضرت نقاد سے کرنا ہے وہ یہ کہ جن عاشقانہ نظموں جیسے 'جنگل کی شہزادی' یا 'گنگا اشنان' میں معشوق عورت ہے تو کیا وہ عورت یا دوشیزہ شاعر کی منکوحہ ہے یا شاعر سے منسوب ہے۔ کیا حضرت نقاد یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ایسی فطری نظموں میں عورت کو معشوق یا معشوق سے بھی ذلیل اور گرا ہوا رتبہ حسن رہ گذرے کا دیا گیا ہے معشوقہ سے ان کا کوئی نازک رشتہ قائم ہے۔ یہ تو طے ہے کہ کوئی شاعر اپنی منکوحہ یا منسوبہ کے لئے فطری اور غیر امرد پرستانہ نظم نہیں لکھتا۔ پھر ایسا شاعر اپنے تخیل میں دنیا بھر کا بہنوئی یا داماد رقیب روسیہ کیوں بننا چاہتا ہے فطری عشق کا شاعر دنیا بھر کی عورتوں سے کیوں تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے ایسے شاعر کی للچائی ہوئی نظر جامن والیوں، مہترانیوں، ریل میں سفر کرنے والی عورتوں، جنگل کی شہزادیوں، گنگا اشنان کرنے والیوں، حتیٰ کہ بیمار پر کیوں پڑتی ہے۔ وہ اتنا Polygamous کیوں ہوتا ہے؟ مجھے ان نظموں سے کوئی لڑائی نہیں صرف حضرت نقاد کی منطق کی داد دینا چاہتا ہوں ایک آدھ نظم گو عموماً ایک ہی عورت کی محبت کا دم بھی متعدد نظموں میں بھرتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے جگالی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ایک سچے غزل گو کے عشق میں وہ تیز یک رنگی ہوتی ہے کہ گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے محبوب کے سوا کہیں اور بھی حسن پایا جاتا ہے۔

یہ دنیا تنگ ہے اس پر جو اٹھا تیری محفل سے

جس شخص کا جذبہ عشق تیز، مستقل، پر خلوص اور مہذب ہے اسے لطیف اور سنجیدہ تغزل کے سامنے بہت سی عشقیہ نظموں کا ہرجائی پن بہت تکلیف دیتا ہے۔

حضرت نقاد نے جب غزل کو اتنی گالیاں دینے کے بعد بھی غزل کی لطیف اور مہذب شاعری کا

www.taemeernews.com

اہل اپنے آپ کو نہ پایا تو کہہ اٹھے کہ آپ کی غزل کو کوئی نکے سیر نہیں پوچھتا لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ سر محمد اقبال اور جوش اپنی گراں قدر نظموں کی قیمت پر کتنے دن باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کیا حالی پانی پتی بھی نظموں کی بدولت جی سکتے تھے۔ نکے سیر کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کا یہ مصرعہ بھی ذہن نشین کر لیجئے:۔

مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

فردوسی، ہومر اور ملٹن جس کی فردوس گمشدہ پانچ پاؤنڈ پر بکی تھی۔ ڈرائیڈن جس کی لاش کو کہا جاتا ہے کہ فوجیوں نے گھیر لیا تھا اور انگلستان ایسے متمول اور متمدن ملک میں ملک الشعراء نیس فیلڈ جسے گزارہ کے لئے شاعری کے علاوہ ناول لکھنے پڑتے ہیں، سر ولیم وانسن جو کل کی بات ہے فاقہ کرتا ہوا مرا ہے ان کی نظمیں نکے سیر تھیں؟ کسی پر اعتراض کرنے کا یہ نہایت بازاری طریقہ ہے کہ اس کی مالی حیثیت پر اعتراض کر دیا جائے حضرت نقاد یہ نکے سیر والی بات ایسی ہے کہ نظم ہو یا غزل یا نثر دنیا میں ادبی خدمت کرنے والوں کی وہ حالت رہی ہے کہ اگر ہم آپ مل جاتے تو بمصداق تعشق کے اس شعر کے:۔

دل بہل جاتا کہیں اک دم کو مل جاتا جو قیس
دو گھڑی مل بیٹھتے رونے رلانے کے لئے

اور چونکہ رونے اور ہنسنے کے متضاد اور باہم متصادم کیفیات میں حقیقی فرق نہیں تو ہنسنے ہنسانے ہی کے لئے سہی۔

جو کچھ میں نے اب تک لکھا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اردو شاعری میں سوا غزل کے اور کچھ نہ ہو۔ اچھی سے اچھی چیز کا بھی حد سے زیادہ تجربہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ انگریزی زبان کے فقرہ (Too much of a good thing) کے برحق ہونے کو میں تسلیم کرتا ہوں مگر اس غلطی میں پڑنا حماقت ہے کہ اردو میں نظمیں چونکہ نئی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے نظم کی حمایت میں غزل کو نیست و نابود کو دیا جائے۔ میں غزل میں صرف اول درجہ کے اشعار یا جو اشعار اول اور دوئم درجے کے درمیان ہوتے ہیں صرف ان کا قابل و معترف ہوں۔ نظم دویم درجہ کی بھی ہو تو میں لطف اندوز ہو لیتا ہوں کیونکہ خارجی شاعری میں میرے مطالبات اتنے سخت نہیں۔ غزل بہترین صنف ہے لیکن ہر صنف سخن کی خوبیاں اس صنف کے حدود ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ خارجی کائنات دنیائے رنگ و بو کی بوقلمونی، زمان و مکان کی رنگا رنگ بزم آرائیاں، اجتماعی و انفرادی حیات کے عملی پہلو، حرکات و سکنات، ذہنی و جذباتی داخلی و معنوی مفکرانہ تجربات اور ان کی مفصل آئینہ داری، بے شمار نئے انداز بیان جو تغزل سے باہر ہیں مگر جن کی خوبیاں نہایت دلکش، اور بصیرت افروز اور ادبی حیثیت بہت اہم اور بلند ہے، نظم ان سب کی سرمایہ دار ہے۔ نظم بھی حیات نما اور حیات آور ہے۔ یہ تاریخ ادب کی ستم ظریفی ہے کہ کچھ غزل گو محض ناظم ہوتے ہیں اور کچھ نظم کہنے والے (جیسے محمد اقبال) بہترین غزل گو ہوتے ہیں اور کبھی کبھی نظم کو بیک وقت داخلی و خارجی خوبیوں سے

www.taemeernews.com

سنوار دیتے ہیں، 'دریا نہیں کار بند ساقی'۔ الغرض اردو ادب کو غزلوں اور نظموں دونوں کی یکسانیت ضرورت ہے۔ بشرط آنکہ ادبیت دونوں میں جلوہ نما ہو۔ شاعر غزل یا نظم میں کسی ایک کا ہو کر رہ سکتا ہے۔ ناقد و ادب پرست ترجیح کس کو دے مگر وہ کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ لطیف اور اعلیٰ قسم کی غزل گوئی میں لطیف اور اعلیٰ قسم کی نظم نگاری کی بہ نسبت زیادہ خطرات ہیں۔

مجھے جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکا۔ اخیر میں حضرت نقاد سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ اگر غزل اتنی غیر فطری اور غیر شاعرانہ چیز ہے تو نظیر اکبر آبادی، سودا، حالی، آزاد اسماعیل، اکبر آبادی، اقبال، جوش نے نظم گو ہوتے ہوئے غزلیں کیوں کہیں اور باقاعدہ اپنے کلام میں شامل کیوں کیا۔ کلیم کے اسی نمبر میں غالب کی ایک شرح پر ریویو ہے۔ پہلے تو غالب کی لطیف غزل گوئی سے ریویو کرنے والے کو جو تکلیف محسوس ہوئی ہے اس کا غیر ارادی اظہار اس ریویو میں ہو گیا ہے۔ مگر جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے، چند ہی سطور کے بعد اس مرعوب لہجہ میں غالب کا ذکر ہے اور ریویو کرنے والے نے جس اضطراب سے کروٹ بدلی ہے وہ قابل دید ہے۔

اس کے بعد ہی داغ کی تعریف کے پل باندھ دیے گئے ہیں اس کی وہی وجہ ہے کہ داغ کا کلام زندہ دلی اور رنگینی کے باوجود سوز و ساز کا مطالبہ کم کرتا ہے۔ اب ہم کس کی بات صحیح سمجھیں؟ کبیر صاحب کا مصرع یاد آتا ہے:۔

'کیکر مانوں بات کو ٹھریا میں دوئے جنے بولیں'

●●

آزادی کے بعد لکھی گئی نئی نظم کے سلسلے میں

ذبیر رضوی کی مرتبہ نئی کتاب

نئی نظم - تجزیہ و انتخاب

آپ کو بڑی تفصیل کے ساتھ نئی نظم کے تجزیے سے متعارف کرائے گی

ذبیر رضوی کی اس نئی کتاب میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کی

نمائندہ نظموں کا انتخاب بھی شامل ہے صفحات: ۴۳۲، قیمت: ۱۷۰/روپے

مکتبہ ذہنِ جدید، 9789، نئی دلی 110025

ذہن جدید

www.taemeernews.com

اس بار ادب کا نوبل انعام

● کمیونسٹ رومانیہ میں پیدا ہونے والی ۵۶ سالہ جرمن نژاد افسانہ نگار اور شاعرہ Herta Mueller کو ۲۰۰۹ء کا ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے جب یہ غیر معمولی خبر ہرٹا کو برلن می اپنی قیام گاہ پر ملی تو وہ کچھ لمحوں کے لئے سکتے میں آگئی اور اس طرح خاموش ہو کے بیٹھ گئی جیسے اس کے گویا ہوتے لبوں کو اظہار کے لئے لفظ نہ مل رہے ہوں کچھ لمحوں بعد جب اس نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تو وہ خوشی سے یہ کہہ کر اچھل پڑی ''میں بہت بہت خوش ہوں'' ہرٹا مولر کو سویڈش اکادمی کے مستقل سکریٹری نے ہرٹا مولر کے تخلیقی ادب کا احاطہ کرتے ہوئے جو جملہ کہا ہے اسے اخباروں نے شاہ سرخی بنایا ہے "She depicted the Landscape of the Dispossessed" ہرٹا مولر کو یقین ہی نہیں آیا کہ آہنی پردے والے ڈکٹیٹر نکولائی چوسسکو کے رومانیہ میں ایک معتوب ادیب کی زندگی گزارنے والی شاعرہ اور افسانہ نگار کو دنیا کا سب سے بڑا 1.4 ملین ڈالر کا نوبل انعام بھی مل سکتا ہے ہرٹا کو یاد آیا کہ جب ۱۹۸۲ء میں اس کے افسانوں کا مجموعہ Niederungen شائع ہوا تو اسے حکومت کی سخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑا تھا وجہ یہ تھی کہ ہرٹا نے اپنے ان ابتدائی افسانوں میں رومانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آباد جرمن نژاد لسانی اقلیت کی زبوں حالی کو موضوع بنایا تھا اس کے دو سال بعد اس کی دوسری کتاب Drueckender شائع ہوئی، تو اس

www.taemeernews.com

میں چوسسکو کے زمانے میں ناانصافی، کرپشن اور لسانی اقلیتوں کو جبر کا نشانہ بنانے کی تفصیل دیتے ہوئے بہت سے واقعات کی نشان دہی کی گئی تھی ہرٹا کی خوبی یہ تھی کہ اس نے جبر کے خلاف اپنی آواز کو کمزور نہیں ہونے دیا اس نے بطور ایک باضمیر ادیب کے اقتدار والوں کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی اس مزاحمت کی پاداش میں اسے قید و بند بھی ملی۔

ہرٹا مولر نے The land of green plums لکھ کر اسے اپنے ان دوستوں کے نام معنون کیا جنہیں نکولائی چوسسکو کے زمانے میں مار دیا گیا تھا The appointment میں اس نے رومانیہ کی ایک عورت کی تصویر کشی کی ہے جو اپنے زمانے کے جابر معاشرے کے خلاف آواز اٹھاتی ہے یہ بات عموماً کہی جاتی ہے کہ ہرٹا مولر کی تحریروں میں ایک ایسے پیغام کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے جو آزاد اور منصفانہ معاشرے کی تشکیل کا علمبردار ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہرٹا مولر نے وہ اذیت، سزا اور قید و بند خود بھی جھیلے جو نافرمان ادیبوں کا مقدر بنتا رہا ہے ہرٹا کی ماں کو بھی روسی ورک کیمپ میں پانچ سال رکھا گیا تھا رومانیہ کی خفیہ پولیس نے ہرٹا مولر کو اپنا مخبر بنانے کی کوشش کی تھی مگر ہرٹا نے اس کو ٹھکرا دیا تھا ۱۹۸۹ء میں نکولائی چوسسکو کا زوال ہوا وہ معزول ہو کے سزا یافتہ ہوا چوسسکو کی اس معزولی سے دو سال قبل ۱۹۸۷ء میں ہرٹا مولر نے اپنے شوہر رچرڈ واگز کے ساتھ رومانیہ کی سکونت ترک کر دی تھی اور جرمنی آ کر برلن میں رہنے لگی تھی۔ ہرٹا مولر، ادب کا نوبل انعام پانے والی دنیا کی بارہویں خاتون ہے۔ (ذ۔ج)

بہترین ناول کے لئے اکتالیسواں مین بوکر انعام

● اس بار بوکر انعام کی جو آخری لسٹ بنائی گئی اس میں صرف چھ ناول نگاروں کے نام تھے ان امیدواروں مین تین خاتون ناول نگار بھی تھیں۔ A.S.Bayatt (ناول The Childrens) Hilary Mantel (ناول Wolf Hall) Sarah waters (ناول The little Stranger) ان کے ساتھ جو تین مرد ناول نگار تھے وہ تھے J.M.Coetzee (ناول Summer time) Adam Faulds (ناول The Quickening Maze) اور Simon Mawer (ناول The Class Room) اس مختصر فہرست کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی رہا کہ اس بار انعام کے امیدوار سب ہی اپنا ادبی قد و قامت رکھنے والے ناول نگار تھے ان میں ایک بھی تازہ تازہ وارد ادب ناول نگار نہیں تھا دوسرے اس بار کی آخری لسٹ میں کوئی ایشائی ناول نگار بھی نہیں تھا جب کہ پچھلی بار اروند اڈیگا پچاس ہزار پونڈس کا یہ انعام اپنے ناول The white tiger پر جیتنے میں کامیاب رہے تھے اس سے پہلے یعنی 2006 میں ہندستان ہی کی ایک اور ناول نگار کرن ڈیسائی کو ان کے ناول The inheritance of loss پر یہی انعام دیا گیا تھا اس بار قیاس یہی تھا کہ 41 واں انعام تیسری بار امیدوار بننے والے ناول

www.taemeernews.com

نگار J.M.coetzee کو ان کے سوانحی ناول پر ملے گا یا پھر انعام کی سوئی ممتاز خاتون ناول نگار A.S.Bayatt کے ناول ''چھوٹا سا اجنبی'' پر آکر رک جائے گی لیکن چھ ممبران پر مشتمل جیوری کی نگاہ انتخاب ہلاری مینٹل کے تاریخی ناول Wolf hall پر ٹک گئی۔

۵۷ سالہ ہلاری مینٹل کے ناول کا سارا پس منظر تاریخی ہے ناول ہنری ہشتم کے دربار پر مرکوز ہے اور شاہ ہنری کے درباری صلاح کار تھامس کورامویل Thomas cromwell کے کردار کو مرکزی کردار بناتا ہے ہلاری مینٹل کا کہنا ہے کہ میرے ناول کا مقصد تاریخ اور اس کے واقعات میں قاری کی دلچسپی بڑھانا ہے جسز کے انعامی پینل کے ایک ممبر کا کہنا تھا' ہلاری مینٹل کا انعام کا مستحق قرار پانے والا ناول پوری طرح ایک جدید ناول ہے جو سولھویں صدی کے تاریخی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول ہنری ہشتم کے دربار میں اقتدار کی برقراری اور اس کے حصول کے لئے ہونے والی سیاسی ریشہ دوانیوں کو خاصی گہرائی سے بیان کرتا ہے اور یہ انکشاف بھی کرتا ہے۔ تاریخ سازی میں مرد اور عورت اپنا رول کس کس انداز سے ادا کرتے ہیں۔ بوکر انعام کے بعض مبصرین کے خیال میں اس بار چونکہ فہرست میں ایک سے زائد بار بوکر انعام پانے والے ناول نگار امیدوار تھے اس لئے فیصلہ آسان نہ تھا wolf Hall کو انعام ملنے کی ایک وجہ اس کا دلچسپ تاریخی پیرائیہ بیان ہے تو دوسری وجہ ناول نگار کا پرکشش زبان والا بیانیہ اور اس کی ضخامت بھی رہی ہے ناول کی منظر بندیاں اور واقعات کی جزئیات نگاری بھی اس ناول کے مثبت پہلو ہیں ناول پر خلاف توقع نیویارک ٹائمز، سنڈے ٹیلی گراف اور بی بی سی پر جو تبصرے آئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بار ناول اور اسے دیا جانے والا انعام کسی اختلاف یا متنازعہ بحث کا باعث نہیں بنا۔

مینٹل کے اب تک دس ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے ان کا پہلا ناول Every day mother'sday 1985 میں شائع ہوا تھا اس ناول کا sequel ایک سال بعد vacant possession کے نام سے شائع ہوا تھا Travel wrting پر ۱۹۸۷ء میں شیوانا ٹپال میموریل پرائز اور ۱۹۹۵ء میں An experiment in love پر Hawthornden prize ملا تھا ایک اور ناول Beyond Black کو Orange انعام کے لئے شارٹ لسٹ کیا جا چکا ہے وہ ان دنوں دو اور ناول لکھنے کی ابتدا کر چکی ہیں۔ (ذ۔ج)

www.taemeernews.com

تراشے

سنگیت کا عالمی دن

● دلی کی ساوتری وکاس سمیتی جو سنگیت کے ذریعے عالمی اخوت اور امن کے لئے کام کرتی رہتی ہے اس نے پچھلے دنوں عالمی سنگیت کا دن مناتے ہوئے نئی دلی کے سری فورٹ آڈی ٹوریم میں ساز و آواز کے نام سے ایک بے حد پرکشش پروگرام کیا جسے ممتاز گلوکار کے ایل سہگل کے نام منسوب کیا گیا اس موقع پر کے ایل سہگل ایوارڈ کا اعلان بھی کیا گیا اور آغاز ہی میں یہ ایوارڈ مجموعی خدمات کے لئے موسیقار خیام، فلم ساز مرحوم بی آر چوپڑہ اور اداکار دلیپ کمار کو دینے کا اعلان کیا گیا اس کے علاوہ سمیتی نے تین اور ایوارڈس بھی دینے کا اعلان کیا جو رُودرو دینا کے لئے استاد اسد علی اوما واسودیوا کو ان کی صحافیانہ خدمات اور اوما شرما کو ان کے کتھک ناچ کے لئے غیر معمولی فنی مہارت کا مظاہرہ کرنے پر دیئے گئے کتھک رقاصہ اوما شرما نے دلی گھرانے کے نوجوان گلوکار عمران کی غزل سرائی کے پس منظر میں اپنے بہترین کتھک رقص کا مظاہرہ کیا۔

تعلیمی نظام میں آرٹ کو ترجیح

● منی دلی کے وگیان بھون میں ۲۰۰۸ء کے لئے سنگیت ناٹک اکادمی کے ایوارڈس تقسیم کرتے ہوئے صدر جمہوریہ پرتبھا پاٹل نے کہا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں آرٹ اور اس کی پذیرائی کو اور زیادہ ترجیح دینی چاہئے انہوں نے وگیان بھون میں ایوارڈس یافتگان اور فنون سے دلچسپی رکھنے والے سامعین کی ایک بڑی تعداد جو اس موقع پر موجود تھی مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ملک کے تعلیمی نظام میں آرٹس کے بارے میں ایک بدلے ہوئے رویے کی ضرورت ہے انہوں نے کہا کہ آرٹ پر فارمر کے عوامی مقامات پر مظاہروں کو داد ملنی چاہئے ان کا خیال تھا کہ ایک بڑی

www.taemeernews.com

ڈیجیٹل لائبریری کے قیام کی سخت ضرورت ہے تاکہ مطالعے کی فضا بنانے کی کوشش کو مہمیز ملے اس کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری ہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے سارے ملک میں سنگیت ناٹک اکادمی کو یہ بھی کرنا چاہئے کہ وہ ایسے دلچسپ اور ندرت کے حامل پروگرام کرے کہ جو پرفارمنگ آرٹس کے مظاہروں کو ملک گیر مقبول بنا سکے۔ صدر جمہوریہ محترمہ پرتبھا پاٹل نے ممتاز رقاصہ ستارہ دیوی کو خالد چودھری کو تھیٹر اور بھوپندر ہزاریکا کو عوامی سنگیت کے لئے اکادمی کا Citation اور ایک لاکھ روپئے کا کیش ایوارڈ دیا گیا۔

دلی میں کرشن لیلا

● سری رام بھارتیہ کلا کیندر ۱۹۵۲ء سے ہر سال جنم اشٹمی کے موقع پر ہفتے بھر کرشن کی زندگی کو موضوع بنا کر ایک ڈانس ڈرامہ (بیلے) کمانی آڈیٹوریم میں اسٹیج کرتا آرہا ہے اس پیش کش کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کو ہال میں بیٹھ کر دیکھنے والوں کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی یہ ضرور ہے کہ اس ڈانس ڈرامے کے ایکٹر بدلتے رہے ہیں مگر بیلے کی کہانی اور اس کا اسکرپٹ وہی پرانا اساطیری فضا لیئے ہوئے ہے بھگوان کرشن کی زندگی کے دو خاص کردار عموماً ایسی پیش کش میں نمایاں کئے جاتے ہیں ایک ان کا شوخ و شریر بچپن اور دوسرا کوروکھیتر کے یودھ میں جنگ کے بارے میں حکمت عملی اور ان کا وہ بیان جو گیتا کی صورت میں سارے سنسار کے لئے ایک مقدس مذہبی صحیفہ بن گیا اس ڈانس ڈرامے میں سنگیت کافی بھرپور اور پرکشش ہے دھنیں وکشن لیلاؤں کی مانوس انہیں ہیں ان کی گائیکی زمانہ قدیم سے سننے والوں کی سماعتوں میں رچی بسی ہے کیشو کوٹھاری کے بنائے Sets غیر ضروری آرائش اور سجاوٹ کے بغیر اسٹیج پر ہونے والے واقعات کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ کشن لیلا، کی مانوس کہانی کو پرکشش اور عام آدمیوں

www.taemeernews.com

کے لئے دلچسپ بنائے رکھنے کی اس کوشش میں کسی نمایاں کمی یا خامی کا احساس کبھی نہیں ہوا اسی لئے ہر سال جب سری رام کیندر کا یہ ڈانس ڈرامہ اسٹیج ہوتا ہے تو اس کو دیکھنے والے پرانے اور نئے ناظرین کی بھیڑ امڈ پڑتی ہے

مصوری ۔ سنگیت اور صوفی ازم

● یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دلی میں صوفیانہ خیالات اور طرز فکر کو نمایاں کرنے کے ۔لئے کئی طرح کے پروگرام اکثر ہوتے رہتے ہیں ثقافت کو فروغ دینے کے دعوؤں کے ساتھ ہونے والے ان پروگراموں میں موسیقی کے پروگرام زیادہ حاوی رہے ہیں مگر اب دوسرے فنون میں بھی صوفیانہ رجحان اور فلسفے کی گونج بھی سنائی دینے لگی ہے سنگیت، مصوری اور صوفی ازم یہ نیا تکون ان دنوں خاصا فروغ پا رہا ہے چنانچہ دلی کے للت ہوٹل میں ۱۸ مصوری کی بنائی پینٹنگس کی جو دس روز نمائش ہوئی وہ تھیم کے اعتبار سے بڑی منفرد تھی اس کی خوبی یہ بھی تھی کہ ہر مصور نے اپنے اپنے Concept کے ساتھ مصوری کا رشتہ صوفیانہ موسیقی سے جوڑنے کی کوشش کی تھی اس موقع پر گلوکارہ انیتا سنگھ کے البم تجلی کی بھی رونمائی ہوئی انیتا نے تفصیل سے جنت سے پھوٹنے والی روشنی تجلی کو اپنی صوفیانہ گائیکی کا سرچشمہ قرار دیا۔

ہم جنس پرستی

● پچھلے دنوں دلی ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں ہم جنس پرستوں کو یہ کہہ کر سڑکوں پر خوشی سے ناچ اٹھنے کی تحریک دے ڈالی کہ IPC کی دھارا 377 کے تحت ہم جنسی قابل سزا جرم نہیں ہے عدالت نے وضاحت کی کہ ملک کے آئین میں انسانی زندگی کے تعلق سے جو بنیادی حقوق شہریوں کو حاصل ہیں مذکورہ دفعہ 377 ان کی

www.taemeernews.com

خلاف ورزی کرتی ہے عدالت نے ۱۰۵ صفحات پر مبنی اپنے فیصلے میں ہم جنسی، آئین اور بنیادی حقوق پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے IPC کی دفعہ 377 کو رد کئے جانے کے حق میں اپنے دلائل بھی دیئے عدالت کے اس فیصلے سے ان لوگوں کا پر جوش ہونا قابل فہم تھا جو اب سر عام ہم جنسی میں اپنے شوق اور دلچسپی کے اظہار میں کوئی جھجک یا شرم محسوس نہیں کرتے عدالت کے اس فیصلے سے ہم جنسی قابل جرم فعل نہیں رہی لیکن معاشرے میں اسے قانونی تحفظ دینے کے لئے سرکار کو قانون تو بہر حال بنانا ہوگا اس فیصلے کا جشن جس طرح دلی کی سڑکوں اور دوسرے عوامی جگہوں پر عورتوں اور مردوں نے ناچ گا کر منایا اس سے اندازہ ہوا کہ دلی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک قابل ذکر تعداد ہم جنسی والے فصل میں ملوث ہے۔

مرقع چغتائی کی اشاعت

● پچھلے دنوں حیدر آباد میں نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری اور آندھرا پردیش کے گورنر نرائن دت تیواری نے مرقع چغتائی کے اس نئے ایڈیشن کی رسم اجرا انجام دی جسے ۸۰ سال کے وقفے کے بعد پہلی بار ہندستان میں آندھرا پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے مصور عبدالرحمٰن چغتائی پہلے مصور ہیں جنہوں نے دیوان غالب کو اپنی پینٹنگ کا مرکز و محور بناتے ہوئے غالب کے بے شمار اشعار کو پینٹ کیا تھا چغتائی نے بلا شبہہ غالب کے اشعار کے مفاہیم، معنیٰ اور ان کی تاثریت کو پڑھنے والے پر اور زیادہ گہرا اور دیرپا بنانے کے لئے برش اور کینوس کا سہارا لیا تھا جب چغتائی کا یہ مصورانہ عمل نواب بھوپال اور نظام حیدر آباد کے مالی تعاون اور سرپرستی سے لوگوں کے سامنے آیا تو غالب کے شیدائیوں کو یہ مرقع بے حد پسند آیا مرقع چغتائی سے خود عبدالرحمٰن چغتائی کو بطور مصور ایک دیرپا شناخت ملی مرقع چغتائی نے تفہیم غالب کی مصوری کے ذریعے یعنی رنگوں اور کینوس کے حوالے سے شاعری کی داد دینے کی پہلی اینٹ رکھی علامہ اقبال نے مرقع غالب کا دیباچہ لکھتے ہوئے نوجوان چغتائی کے فن کو سراہا، چغتائی نے اس مرقع میں ہندستان کے پہاڑی آرٹ اور ایران کی اشکالی مصوری سے بھرپور استفادہ کیا تھا آپ چغتائی کی غالب کے اشعار پر بنائی تصویریں دیکھیں گے تو آپ کی آنکھ اس کی ضرور گواہی دے گی۔

www.taemeernews.com

امرتا پریتم اور امروز

●پنجابی کی رومان پرور شاعرہ امریتا پریتم نے ہندستانی ادب پر اپنی اَن مٹ چھاپ چھوڑی ہے اردو والوں نے ایک زمانے میں امرتا کی شاعری اور افسانوں کو اس طرح اپنا لیا تھا جیسے وہ اردو ہی کی شاعرہ ادیب ہو فسادات پر امرتا کی طویل آج انکھیاں وارث شاہ نوں، اردو کی بھی ایک مقبول نظم جیسی وہ پنجابی تھی ۲۰۰۵ء میں ہمیشہ کے لئے اپنی سانسوں سے رشتہ توڑ لینے والی امرتا کا ایک امیج وہ بھی تھا جب اسے اپنے ایک شعری مجموعے کے ٹائیٹل بنانے کے لئے ایک اچھے آرٹسٹ کی تلاش تھی اور تب امرتا کی کھوج اسے اندر جیت نامی ایک ایسے آرٹسٹ تک لے گئی جو اردو کے مقبول رسالے شمع کا ٹائیٹل بناتا تھا یہ ملاقات بالآخر رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئی اور دوستی و شب و روز کی رفاقت میں بدل گئی ۱۹۵۷ء میں ہوئی اس ملاقات کے وقت امرتا دس اور گیارہ سال کے دو بچوں کی ماں تھی اور اندر جیت پینٹر سے آٹھ برس بڑی تھی امرتا اپنے شوہر سے علیحدگی کے ابتدائی دن گزار رہی تھی کہ اپنی شاعرانہ عادت اور فطرت کے مطابق اپنے اور پینٹر کے درمیاں پنپنے والے رشتے کو کوئی سماجی نام دیئے بغیر آزادانہ طور پر ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا امرتا نے پینٹر دوست کو امروز نام دے کر اسے ایک نئی پہچان دی نئی دلی کے حوض خاص جیسے پوش علاقے میں امرتا کی یادوں کے سہارے جینے والے امروز اور امرتا اور کس طرح ایک ٹوٹ کر پیار کرتے تھے اس کی رومانٹک فضا میں آپ کچھ وقت گزارنا چاہیں تو ان دونوں کے وہ عشقیہ خطوط پڑھیئے جو ادبی دنیا کی اس سب سے خوبصورت جوڑی نے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران میں لکھے جو دو مختلف شہروں میں رہتے تھے یہ خطوط پنجابی میں ہیں جن کا ترجمہ ہندی میں ہو چکا ہے اور اب ۱۹۲ صفحات پر بکھرے عشقیہ خطوط کا یہ مجموعہ انگریزی میں بھی مارکیٹ میں "Amrita imroze in the times of Love and longing" کے نام سے پبلشر Full

www.taemeernews.com

circle نے شائع کیا ہے یہ بھی بتادیا جائے کہ اپنی بیماری اور موت سے کچھ عرصہ قبل امرتا نے ایک پیاری سی نظم 'میں تمہیں پھر ملوں گی لکھی تھی' امرتا کے انتقال کے بعد امروز کا شاعر پہلی بار مضطرب ہوا تھا اور اس نے ایک ملال بھری نظم لکھی تھی۔

'اس نے جسم چھوڑا ہے ساتھ نہیں'

مغل عہد تہذیبی سنگم

● پچھلے دنوں سنٹرل کاٹیج انڈسٹریز کارپوریشن نے نئی دلی کے نہرو بیوپار بھون میں مغل عہد کے ملبوسات کی ایک دس روزہ نمائش کی اس کا نام تھا "Mughal Art in Indian Crafts" اس نمائش کا افتتاح ٹیکسٹائل وزارت کی سکریٹری ریتا منین نے کیا ریتا منین نے کہا کہ مغل عہد ہندستانی آرٹ اور کلچر کا ایک ایسا سنہری عہد تھا جو ہند۔ عجمی تہذیبوں کا گواہ بنا تہذیبوں کے اس امتزاج اور ملاپ نے سب ہی فنون جیسے فن تعمیر۔ پینٹنگس، موسیقی، ادب شاعری اور ٹیکسٹائل ڈیزائننگ پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے مغل ملبوسات اب پھر ہماری معاشرتی زندگی اپنی نئے حسن اور زیبائش کے ساتھ لوٹ کر آرہے ہیں شاید اس لئے کہ آج کے نوجوانوں کی خاص خاص موقعوں پر پہناوے کی جمالیات مغلوں کی ملبوسات سے متعلق جمالیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے ٹیکسٹائل ڈیزائنرز کو اور فیشن انڈسٹری کا اس کا بھرپور احساس ہے اس کی تصدیق وہ ملبوسات کر رہے تھے جو اس نمائش کے موقع پر ماڈلوں نے زیب تن کئے تھے۔

www.taemeernews.com

ہندستانی میوزیم کی دسویں سالگرہ

● ہندستان کے قومی میوزیم کے قیام کو ۲۰۱۴ء میں دوسو برس ہو جائیں گے اس وقت اس میوزیم کا دنیا کے آٹھ قدیم ترین میوزموں میں ہوتا ہے ہندستان کی حد تک یہ ملک کا سب سے بڑا میوزیم ہے اس کی دوسویں سالگرہ منانے کی تیاریوں کا آغاز ہو چکا ہے اس قومی سطح کی تیاری کے دو پہلو ہیں۔ پہلا میوزیم عمارت کی مرمت اور اسے مزید دیدہ زیب بنانا دوسرا میوزیم کی گیلریوں کو جدید ترین طرز پر آراستہ کرنا قومی میوزیم کی شایان شان سالگرہ منانے کی غرض سے ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی ممتاز مورخ اور مغربی بنگال ہیری ٹیج کمیشن کے سربراہ برن دیو کی نگرانی میں تشکیل پا چکی ہے برن دیو کے علاوہ اس کمیٹی میں آثار قدیم کے ماہر۔ میوزیم کے ماہرین تخمینہ لگایا گیا ہے قومی میوزیم نے بے حد نایاب اور نادر اور قیمتی باقیات رکھی ہوئی ہیں ان میں ایک مصری ممی، مہاتما بدھ کی راکھ، اشکوک ستون، ڈائناسور کے فوسلز اور کھوپڑیاں پرانے سکے اور قدیم دھاتوں کے ٹکڑے بھی کافی ہیں۔

منفرد ڈانس فیسٹول

● ہندستان اپنے کلاسیکل اور لوک ناچوں کی رنگا رنگی بے حد ثروت مند ہے اس کا اندازہ اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب کسی قومی تہوار یا تقریب اور جشن کے موقع پر ہندستانی ناچوں کے بھرپور اور متنوع مظاہرے دیکھنے کو ملتے ہیں پچھلے دنوں جو ملک آزادی کی ۶۲ ویں سالگرہ منا رہا تھا اس موقع پر ایک ڈانس فیسٹول ''سارے جہاں سے اچھا۔۲۰۰۹ء'' نئی دلی میں منایا گیا اس تقریب اور پیش کش کی ہدایت کار اوڑیسہ کے رقص اور ڈیسی کی نرتکی رنجنا گوہر تھیں آئیڈیا یہ تھا کہ اڑیسہ اور چھتیس گڑھ کے تین مقبول عوامی ناچوں اور ڈیسی، گوٹی پوا اور چھاؤ جیسے ایک دوسرے سے مختلف

www.taemeernews.com

ناچوں کو ملا کر ان کے امتزاج کو ایک منفرد دلکشی اور نئے پن کے ساتھ ایک تجرباتی فیوژن کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس امتزاج کے فنکار تھے ونجنا گوہر (اوڈیسی) شبشا دھر آچاریہ (چھاؤم) بیجے کمار سالو (گوتی پور) اسی فیسٹول کا آخری آئیٹم اوڑیسہ کی ایک لوک کہانی ''چندرا بھاگا'' تھی جسے تینوں ناچوں کی شیلی میں باری باری اپنے اپنے انداز سے پیش کیا گیا۔ ناچوں کے اس تجرباتی فیوژن کو دو دن تک دیکھنے اور لطف اٹھانے والوں کی موجودگی کسی بھی وقت کم نہیں ہوئی۔

فارسی ادب کا اہم مرکز ہندستان

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 'بیسویں صدی میں جدید فارسی ادب' کے موضوع پر منی مینار میں ہندستان میں ایران کے سفیر سید بنی زادہ نے حاضرین کو یاد دلایا کہ ہندستان اٹھارویں اور انیسویں صدی میں فارسی شاعری اور ادب کا اہم مرکز رہا ہے اس ملک میں فارسی کے جو دانشور پیدا ہوئے انہیں ایران میں بھی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا گیا اس سلسلے میں ایرانی سفارت کار کلچرل کونسل ڈاکٹر کریم نجفی نے امیر خسرو، غالب اور اقبال کی فارسی شاعری کا حوالہ دیا نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ فارسی شاعری کا معاملہ بھی جدید اردو شاعری جیسا ہی ہے دونوں میں فرق صرف اتنا ہے ہے کہ جدید اردو شاعری نے کلاسیکی اصناف سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا اور ایرانی جدت پسند اپنے کلاسیکی سرمایے اور جدید کامرانیوں کو اپنانے کے لئے آزاد، لچکیلا اور منطقی نظریاتی خاکہ ترتیب دینے میں ناکام رہے اس موقع پر فارسی میں طبع ہونے والی کتابوں کا بھی اجراء کیا گیا۔

گورو۔ شیشو پرمپرا

● ہندستانی فنون لطیفہ خاص طور سے سنگیت اور رقص میں گرو اور شیشے کی روایت خاصی مضبوط رہی ہے استاد اور شاگرد کے درمیان فنون کے حصول کی خاطر ان رشتوں میں ہمیشہ حسن ہی حسن کارفرما رہا ہے لیکن اب گرو اور شیشے کی یہ پرمپرا، روایت اور تہذیب بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں ٹوٹنے اور

www.taemeernews.com

بکھرنے لگی ہے لیکن سماجی اور معاشرتی میں اس رویوں کی پاسداری اور اس کی آبیاری کرتے رہنے کا رجحان اور اضطراب آج بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے پچھلے دنوں نئی دلی کے کمانی آڈیٹوریم میں اسی روایت کو زندہ رکھنے کے مضبوط ارادے سے رقص اور موسیقی کا تین روزہ سی مینار پرمپرا۔۲۰۰۹ء، کے نام سے منعقد ہوا مقصد یہی تھا کہ گورو وار شیشو کے درمیان تعلق خاص کا جو ایک پرانا رشتہ ہے جو ہر طرح کی تعلیم و تربیت میں پرورش پاتا رہا ہے اسے ٹوٹنے یا بکھرنے نہ دیا جائے اس رشتے میں دونوں طرف جو حقیقی اخلاص، وابستگی ذہنی ہم آہنگی، احترام اور برتری کا احساس ملتا ہے وہ اس رشتے اور تعلق کو بے حد اہم بنا دیتا ہے اسی لئے اس بار فیسٹول میں رقص اور موسیقی کی دنیا میں استاد شاگرد کی روایت کے حامل جو رشتے آج مثالی سمجھے جاتے ہیں انہیں مرکز نگاہ بنایا گیا تھا اس بار کچی پڑی رقص کا مظاہرہ گورو راجہ رادھا ریڈی اور شلو جنڈل نے کیا تو ہندستانی بانسری کا مظاہرہ گورو ہری پرشاد چورسیا اور راکیش چورسیا نے کیا موسیقی میں اس روایت کا مظاہرہ گورو ندانوری کرشنا مورتی اور ملاڈی بھائیوں نے کرناٹک گائیکی میں کیا گورو کلامنڈلم سوگھندی نے ڈاکٹر نینا پرشاد نے موہنی آٹم رقص میں کیا۔

دلی کتاب میلہ

● اس بار اگست کے آخری نو دنوں میں پندرہواں دلی کتاب میلہ نئی دلی کے پرگتی میدان میں منعقد ہوا اس میلے میں ملک اور بیرونی ملک کے ۲۳۰ کے قریب ناشروں نے شرکت کی ایک بڑے سے ہال کو محض اسٹیشنری کے ساز و سامان کے لئے مخصوص کیا گیا تھا اس میلے کی سرسری سیر بھی یہ احساس دلاتی رہی ہے کہ دلی والوں کو واقعی کتابیں پڑھنے اپنی ضرورت کے مطابق اسٹیشنری خریدنے کا بڑا شوق ہے والدین ایسے میلوں میں اپنے بچوں کو بھی لاتے ہیں کیونکہ کتاب میلے میں جہاں ناشر بڑوں کے لئے

www.taemeernews.com

شائع کتابیں لاتے ہیں وہیں وہ بچوں کی دلچسپی کی بھی کتابیں DVD، کیسیٹ اور فلمیں بھی لاتے ہیں ایسے میلوں کا بنیادی مقصد تو لوگوں میں کتابیں پڑھنے کی ذوق اور شوق کو بڑھا دینا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایسے میلے کتابوں کی صنعت اور اس کی تجارت کے رشتوں کو بھی مضبوط کرتے ہیں نئے راستے اور راہیں نکلتی ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتاب جسے صدیوں کا حافظ کہا جاتا ہے اس کی اشاعت طباعت اور فروخت میں اب کیا کیا نئے رخ اور پہلو سامنے آرہے ہیں قاری کس طرح کی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے سائنس، ٹیکنالوجی، نئی معلومات اور اطلاعات کی حامل کتابوں کی مارکٹ اور نکاسی کیسی ہے ایسے میلوں میں بڑی اور اپنا مارکٹ رکھنے والی کتابوں کے ناشر ان میلوں کے ذریعے ہی اپنی اشاعتی اور تجارتی پالیساں مرتب کرتے ہیں اس بار دلی کتاب میلے میں "Literatur from the North East" کو موضوع بنایا گیا تھا۔

دلی کے کتابوں سے شوق رکھنے والوں کی خوش بختی ہے کہ یہاں عالمی پیانے کے کتاب میلے بھی ہوتے ہیں اور قومی سطح کے میلے بھی اس کے علاوہ بھی کئی اداروں کے موبائل وین بھی دلی کے مختلف علاقوں میں ڈور ٹو ڈور کتاب پہونچانے کی حکمت عملی پر عمل کرتے رہتے ہیں ان میلوں میں اردو والے بھی حصہ لیتے رہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ایسے میلے اردو کے اشاعتی اور دوسرے اداروں کے سر سے گزر جاتے ہیں اور کوئی ادارہ ایسے میلوں کی تجزیاتی رپورٹ اور اردو زبان کے اشاعتی پہلوں پر حقائق پر مبنی رپورٹ تیار نہیں کرتا اسے بے خبری اور اردو والوں کی بے حسی ہی کہا جائے گا۔

ٹیگور کے نوبیل میڈل کی چوری

● 'گیتانجلی' نظم پر ادب کا جو نوبیل انعام ملا تھا اس کے شانتی نکیتن کے رابندر بھون سے چوری ہو جانے کا معاملہ ۲۵ مارچ ۲۰۰۴ء کو سامنے آیا تھا نوبیل میڈل کی چوری کا پتہ لگانے کے لئے CBI کو تفتیش سونپی گئی تھی اب پانچ سال کی تفتیش کے بعد سی بی آئی نے کوئی خوش کن پیش رفت نہ ہونے

www.taemeernews.com

کے باعث اس کیس کو بند کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ٹیگور کے ایک پرستار نے اس اعلان پر شدید مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کو باعث شرم کہا کہ اب ہمیں ٹیگور کے اصل نوبیل میڈل کے بجائے اس کے Replica پر انحصار کرنا پڑے گا۔

نوملکوں کے امن پسندوں کا مارچ

● ان دنوں دنیا کے نوملکوں کے امن پسند شہری دنیا میں امن کے قیام، ہتھیاروں کی دوڑ کو ختم کرنے اور انسانی زندگی سے دہشت گردی اور تشدد کو ختم کرنے کے مقصد سے کئی ملکوں میں امن مارچ کرتے ہوئے وہ راجدھانی دلی پہونچے دنیا کو امن، عدم تشدد، رواداری اور باہمی یگانگت کا پیغام دینے والے نوملکوں کے ان شہریوں میں ۱۹ مرد اور عورتیں ہیں خیال رہے کہ اقوام متحدہ نے اس سال ۲/اکتوبر کو عدم تشدد کا عالمی دن قرار دیا ہے امن کے ان چارہ جوئیوں نے نیوزی لینڈ سے ۲/اکتوبر کو اپنا مارچ شروع کیا تھا جو ۲/جنوری ۲۰۱۰ میں ارجنٹینا میں میں ختم ہوگا۔

www.taemeernews.com

مصوری

گوشۂ ایم ایف حسین

حسین کی بے وطنی

● پینٹر ایم ایف حسین کا رومن رسم الخط میں لکھا وہ خط جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اپنے نام کی آرٹ گیلری بنائے جانے پر وائس چانسلر کو لکھا تھا وہ ہم یہاں درج کررہے یہ خط ایک بڑے سے فریم میں حسین کے ہاتھ کا لکھا گیلری کی دیوار پر نمایاں طور سے آویزاں ہے ● مرتب

اے ہند جانے والے میرا سلام لے جا

مجھے بہت خوشی ہے کہ میرے شہر دلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میرے نام سے منسوب ایم ایف حسین آرٹ گیلری بنوائی گئی ہے۔ گئے ہفتے جناب مشیر الحسن اور کامنا پرساد نے بتایا کہ اس خوبصورت گیلری کے آرکیٹیکٹ روی کھوسالہ ہیں۔ اس کا افتتاح میرے دوست ستیش گجرال کررہے ہیں۔ یقیناً وہ بھی مناسب انتخاب ہیں۔ جامعہ تعلیم کا وہ مرکز ہے جس کے ساتھ مہاتما گاندھی کا نام جڑا ہے۔ جس کا واسطہ فریڈم اسٹرگل کے دور سے رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ میرے لئے فخر و مسرت کی بات ہے کہ اس ادارے میں میرے نام سے منسوب آرٹ گیلری بنوائی گئی ہے۔ میں اس کے لئے جامعہ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

آج کل پوری دنیا میں ہندستانی آرٹ اور آرٹسٹ اپنی پہچان بنا رہے ہیں اور ملک کے وقار کو اور بلند کررہے ہیں۔ آج ہندستان ہر شعبے میں ساری دنیا کی قیادت کرسکتا ہے۔ آپ تعلیم اور علم حاصل کرنے والوں، وطن کو ملک کو آپ سب سے امیدیں ہیں، آپ سب اپنی پڑھائی میں اپنے کام میں خاص دھیان دیں، محنت کریں اور کامیاب ہوں، کیوں کہ ہیر از نو شارٹ کٹ ٹو سکسیز۔ (Here is no Short cut to sucess)۔ میرا دل آپ سب کے ساتھ ہے، آپ یوں سمجھیں کہ میں آپ سب کے ساتھ ہوں۔ جلد ہی آپ سب سے ملنے کی دعاؤں کے ساتھ کیوں کہ

خاک وطن کا ہر ذرہ میرا آفتاب ہے جے ہند حسین

www.taemeernews.com

● ہندستان کی ثقافتی زندگی اور اس کی چہل پہل اور سرگرمیوں سے خود کو باخبر رکھنے والے لوگ اس بات سے باخبر ہیں کہ ملک ہی کے نہیں دنیا کے صف اول کے ممتاز پینٹر ایم ایف حسین پچھلے سولہ برسوں سے لگاتار اندرون ملک زعفرانی سیاست کی بہتان تراشی اور اس کی شدید مخالفت کا سامنا کر رہے ہیں اور ان دنوں وہ خود اختیار کردہ بے وطنی اور بے گھری کے دکھ جھیل رہے ہیں ملک کی مختلف چھوٹی چھوٹی عدالتوں میں ان پر ۸۰۰ سے زائد مقدمے دائر ہو چکے ہیں مقدمہ کرنے والوں کا ایک ہی الزام ہے کہ حسین نے ہندو دیوی دیوتاؤں کو بے لباس پینٹ کر کے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے ان کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہیں پچھلے چار برسوں سے حسین کی پینٹنگ کی کوئی بھی نمائش اندرونی ملک اس لئے نہیں ہو پائی ہے کہ نہ صرف پینٹر کو بلکہ اس کی تصویروں کو تباہ و برباد کر دینے کی آر ایس ایس کے زیر اثر کام کرنے والی سیناؤں کی دھمکیاں تھمی نہیں ہیں اپنی جان بچانے کی غرض سے ملک سے باہر حسین کبھی لندن تو کبھی دبئی میں وقیام کرنے پر مجبور ہیں دنیا میں اپنے عہد کے اور اپنے ملک کے سب سے بڑے پینٹر کو حسین کی طرح اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے کبھی ایسی بے وطنی کے دن دیکھنے نہیں پڑے حسین کی پینٹنگس پر لگا الزام درست نہیں کہ کسی بھی فن پارے کو فنون کی جمالیات کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے مذہب یا عقیدے کی روشنی میں نہیں عدالت عالیہ کے ستمبر ۲۰۰۸ء میں دیئے گئے اس فیصلے کے باوجود بھی حسین اور ان کی بنائی پینٹنگس کے سلسلے میں آر ایس ایس کی ہدایت پر پینٹر کی قیام گاہ اور اس کی آرٹ گیلریوں کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنانے والی عسکری تنظیموں نے اپنی دشمنی کے تیر کمانوں سے نہیں نکالے حکومت آج بھی سیکورٹی کے نام پر حسین کی پینٹنگس کو تحفظ فراہم کرنے کے وعدے اور یقین دہانی کرانے سے گریز کرتی رہی ہے نئی دہلی کے وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں ہمت نے حسین کی پینٹنگس کے Reprints کی نمائش کی تھی تو وہاں بھی مختلف عناصر نے جم کے توڑ پھوڑ کی تھی۔

ایسا نہیں ہے کہ زعفرانی سیناؤں کی ان من مانیوں کو ہندستانی میڈیا معاشرہ، اور فنون سے وابستہ طبقہ خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا ہے حسین کے معاصر پینٹر کرشن کھنہ، ستیش گجرال اس رویے کی مذمت کر چکے ہیں میڈیا بھی اس پر مذمتی لہجے میں کافی کچھ لکھ چکا ہے اور حسین کی بے گھری کو ایک باضمیر اور باغیرت معاشرے کے لئے باعث شرم قرار دے چکا ہے۔ مگر حکومت اس معاملے میں اس طرح کی تشویش اور فکر مندی اور اس کے اظہار سے عاری نظر آتی ہے جس کی ہر ذی ہوش توقع کرتا ہے صورت حال کا تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ حسین کے ساتھ یہ انتہا پسندانہ اور جارحانہ رویہ اس وقت پوری شدت سے ابھر کے سامنے آیا جب بائیں بازو کی حمایت والی UPA سرکار پاور میں تھی اور اب کانگریس اکثریت کے ساتھ برسر اقتدار ہے جو سیکولر اقدار کے تحفظ کا دعویٰ کرتی ہے حسین کو جان سے مار دینے کی دھمکی ان پر

www.taemeernews.com

ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے کے الزام میں مقدمے ان کے قیام کے ٹھکانوں پر حملے اور گیلریوں کو حسین کے فنی نمونوں کی نمائش نہ کرنے کی دھمکی یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ وزارت داخلہ اس سلسلے میں سیکورٹی کے کڑے اور سخت قدم اٹھانے کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے یہاں تک کہ پارلیمنٹ میں ایک دوبارا اٹھنے والی آوازوں کے بعد اب ہر ایوان نمائندگان میں سناٹا ہے گویا کہ حکومت کے نزدیک اپنے سب سے بڑے پینٹر کی بے وطنی اور اندرون ملک اس کی ایک بھی پینٹنگ کی نمائش نہ ہو سکنے کا المیہ قابل تشویش اور قومی وقار اور حمیت کا حامل معاملہ نہیں ہے اس ساری صورت حال کو نظر میں رکھتے ہوئے حسین اپنے مایوس لہجے میں یہی کہہ سکتے تھے کہ انتہا پسند مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا ان کے سلسلے میں یہ رویہ اور سلوک نیا نہیں ہے صلیب و دار کی آزمائش ہمیشہ ہی آرٹ کا مقدر بنی ہے۔

ایک طرف ہماری حکومت کا شرمناک اور تشویش کی حد تک اپنے سب سے نامور اور سیکولر مزاج رکھنے والے پینٹر کے تئیں بے حسی کا یہ رویہ ہے دوسری طرف حال ہی میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ Hostile Acts کے تحت شمالی کوریا میں بارہ سال کی جیل پانے والی دو امریکی صحافی لڑکیوں کا معاملہ تھا کہ جن کی رہائی اور معافی کی درخواست کے ساتھ سابق امریکی صدر بل کلنٹن شمالی کوریا پہونچے اور اپنی صحافیوں کو باعزت بری کرا کے واپس امریکہ لے آئے لیکن ادھر ساری دنیا حیرانی سے دیکھ رہی ہے کہ ہندستان جیسا سیکولر ملک اپنے سب سے بڑے پینٹر کو وطن لانے میں کتنا بے بس ہو رہا ہے۔

انٹرنیشنل آرٹ سمٹ

● ۱۹/اگست ۲۰۰۹ء سے چار دن کے لئے نئی دلی کے پرگتی میدان میں منعقدہ آرٹ Summit میں دنیا کے گیارہ ملکوں کی 54 آرٹ گلیریز نے حصہ لیا اس عالمی آرٹ سمٹ پر ممتاز پینٹر حسین نے اپنا تاثر دیتے ہوئے ہوئے خبر رساں ایجنسی پی ٹی آئی سے کہا کہ نئی دلی میں منعقد ہونے والے اس دوسرے سال میں بھی آرٹ سمٹ میں اگر میری کوئی پینٹنگ شامل نہیں کی گئی ہے تو مجھے اس کا کوئی ملال نہیں حسین کا یہ کہنا اس لئے اہم ہے کہ وہ آرٹ کے عالمی نیلام گھروں گیلریوں اور آرٹ کے فنی نمونوں کو جمع کرنے والوں کی اولین ضرورت اور پسند بن چکے ہیں حسین نے اپنے اس خصوصی انٹرویو میں اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا کہ آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں ہندستانی مصوروں نے اپنے فنی نمونوں اور تخلیقی ذہانتوں کے بل پر آرٹ کے عالمی منظر نامے اور نیلامی میں اور آرٹ کے شائقین کی نگاہ میں اپنی جو خاص اور منتخب جگہ بنائی ہے اس کا علم ہم وطنوں کو نہیں ہے انہوں نے زور دیا کہ ہندستانی مصوروں نے آرٹ کی عالمی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا ہے اس کی تشہیر کرنے اور اس پر کتاب لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس میدان میں ہندستانی مصوروں کی کامیابی کی ایک روشن تصویر سامنے آسکے حسین

www.taemeernews.com

نے ہندستانی مصوروں کے فنی نمونوں کی عالمی گیلریوں اوران کو جمع کرنے والے شائقین کی نگاہ میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ذکر اس پس منظر کے حوالے سے کیا جو آئے دن یورپ امریکہ میں خاص طور سے آرٹ کے نمونوں کی نیلامی کے مرکزوں میں دیکھنے میں آتا ہے کیونکہ ان نیلامیوں میں اگر ایک طرف امرتا شیرگل کے آرٹ کے نمونے بڑی قیمتوں پر خرید لئے جاتے ہیں تو رضا۔ سوزا، طیب مہتہ، ستیش گجرال، کرشن کھنہ کے فنی نمونوں کی بھی خوب پذیرائی ہوتی ہے حال ہی میں نیویارک میں سوتھ بی Sotheby کے ایک نیلام میں حسین کی ایک پینٹنگ کو 582,500 ڈالرس میں بیچا گیا۔

۱۷ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو اپنی ۹۴ سالگرہ منانے والے حسین آج بھی بے حد سرگرم ہیں اور برابر نئی پینٹنگس بنا رہے ہیں پچھلے سال یعنی ۲۰۰۸ء میں Christie نے جنوبی ایشیا کے ماڈرن اور معاصر آرٹ کے نمونوں کی نیلامی کی تھی اس نیلامی میں Battle of Ganga and Jumna Mahabharata 12 کے عنوان سے بنائی پینٹنگس کو 1.6 ملین ڈالر میں خریدا گیا تھا جو حسین کو اب تک کسی ایک پینٹنگ پر ملنے والی سب سے بڑی قیمت ہے کچھ سال پہلے دلی میں حسین نے ایک آرٹ گیلری کے ساتھ فی تصویر ایک کروڑ روپے لینے کا معاہدہ کر کے ایک ریکارڈ بنایا تھا جو اب کافی پیچھے رہ گیا ہے ان دونوں حسین اپنی ایک نئی پینٹنگ Voyage of Discovery پر کام کر رہے ہیں اپنی اس پینٹنگ کے بارے میں حسین نے وضاحت کی یہ پینٹنگ مصوری کے سلسلے میں ان کے ساٹھ ستر برس کے تجربے کا نچوڑ کہی جا سکے گی حسین نے اپنے لئے Inspiration کی بات کرتے ہوئے وضاحت کی کہ زندگی خود ہی ان کے لئے تحریک کا باعث ہے انسانی زندگی اور اس کا تنوع اس قدر وسیع اور پھیلا ہوا ہے کہ اس کا تمام تر احاطہ کسی بھی پینٹر کے برش کے قیاس وگماں سے باہر ہے ہم تو صرف انسانی زندگی کو اپنے تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے پینٹ کرنے کا ہی حوصلہ کر سکتے ہیں۔

حسین پر فدا

● دوسرے انٹرنیشنل آرٹ Summit میں زعفرانی عسکریت پسندوں کی طرف سے توڑ پھوڑ کے خطرے کے پیش نظر ملک کے مایہ ناز پینٹر ایم ایف حسین کی کوئی پینٹنگ بھلے ہی آویزاں نہ کی گئی ہو لیکن آرٹ اور حسین کے شیدائیوں نے اس کمی کو محسوس نہیں ہونے دیا انہیں تاریخوں میں جب نئی دلی کے پرگتی میدان میں دوسری انٹرنیشنل سمٹ ہو رہی تھی تب ہی نئی دلی کی اراگنی نامی گیلری میں روی گوسین 'حسین پر فدا' کے عنوان سے اپنی ان پینٹنگس کی نمائش کر رہے تھے جو انہوں نے حسین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بنائی تھیں راگنی گیلری میں روی گوسین کی گیارہ تصویروں میں سے چھ پینٹنگس کے ۱۶ فٹ لمبے پینل تھے پینٹنگس کے عنوان بھی دلچسپ تھے جیسے حسین ICU میں، حسین اور ہینری مورے،

www.taemeernews.com

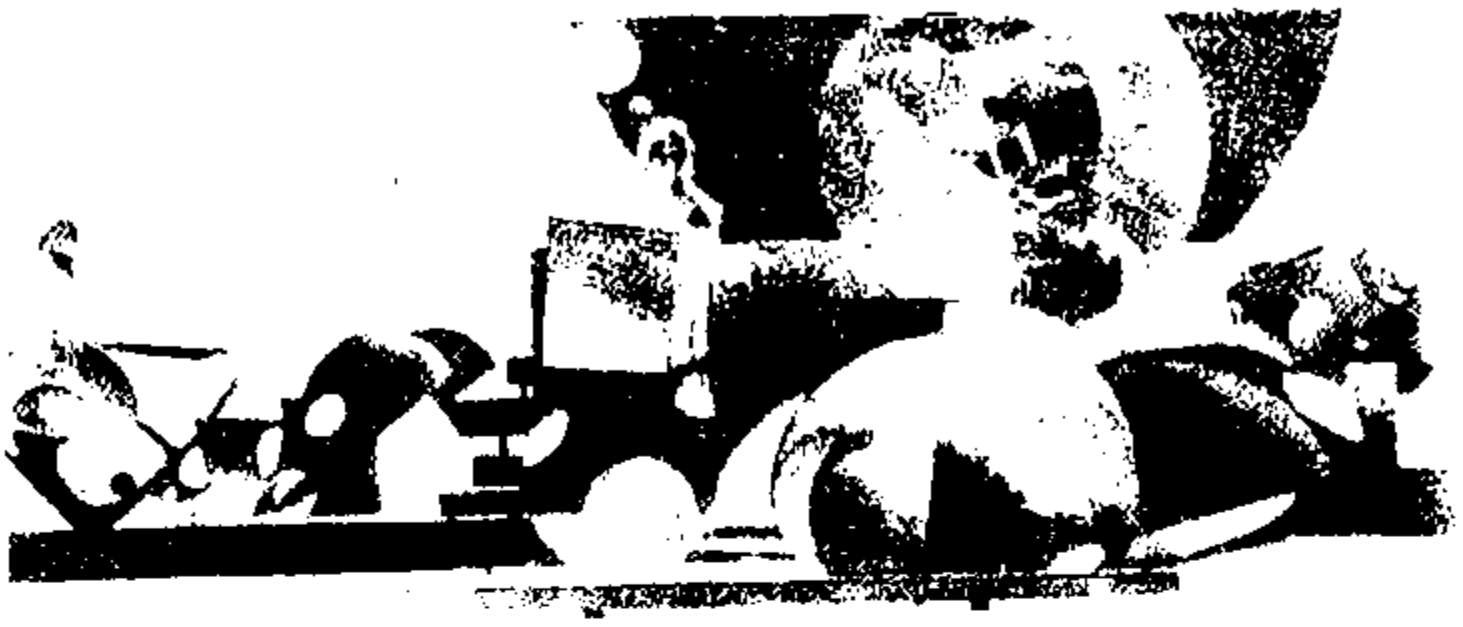

حسین اور تنہائی، حسین Ferrari میں۔ گوسین نے جس محبت بھرے لہجے میں حسین کے آرٹ کو سراہا اس سے ظاہر تھا کہ گوسین، حسین کے بے پناہ شیدائی ہیں گوسین کے لئے یہ غیر معمولی واقعہ ہے کہ ۹۴ عمر پانے والے حسین اب بھی ایک متحرک پینٹر ہیں اور ایک دن میں ایک ملین ڈالر کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں گوسین کی بنائی کسی تصویر میں حسین نہ تو ننگے پاؤں ہیں اور نہ ہی وہ کرتے پاجامے میں ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے گوسین نے کہا کہ ان کی نگاہ میں حسین کی شخصیت ایک Flamboyant کی رہی ہے وہ حسین کے بارے میں اپنی اس شبہ کو کوئی دوسری شکل دینا پسند نہیں کرتے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے دیا سالگرہ تحفہ

● ۱۷ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو حسین ۹۴ر برس کے ہوئے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ملک کے سب سے بڑے پینٹر ایم ایف حسین کو ان کی سالگرہ پر ایک بے حد انوکھا اور قیمتی تحفہ دیا اور یہ تحفہ تھا جامعہ کے انصاری آڈی ٹوریم کے نزدیک بنی ایک بے حد خوبصورت عمارت ایم ایف حسین آرٹ گیلری کی صورت میں، اس تحفے کو نذر کرتے ہوئے بائیں بازو کی ثقافتی تنظیم Sahmat کا سرگرم اشتراک بھی جامعہ کو حاصل تھا گیلری کے باہر لان میں کاسٹر دکیفے بھی بنایا گیا تھا تاکہ گیلری اور اس کی تقریبات میں شرکت کرنے والے جامعہ کے طلبا کھلے میں بیٹھ کر کافی اور چائے کا لطف اٹھا سکیں دلی کی کسی بھی یونیورسٹی کے Campus میں یہ پہلی آرٹ گیلری ہے حسین کے نام پر بنی اس گیلری کا بنیادی مقصد یہ قرار دیا گیا کہ اسے کم کرائے پر ان ذہین نوجوان پینٹروں کو دیا جائے جنہیں اپنے فن پاروں کی نمائش کے لئے سستی اور موزوں جگہ یا گیلری نہیں ملتی اس گیلری کے جامعہ کے احاطے میں تعمیر کا دوسرا جوز ایہ بھی ہے کہ جامعہ ملیہ کا اپنا Arts کالج بھی ہے جہاں کمرشیل اور موڈرن آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کافی طلبا داخلہ لیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

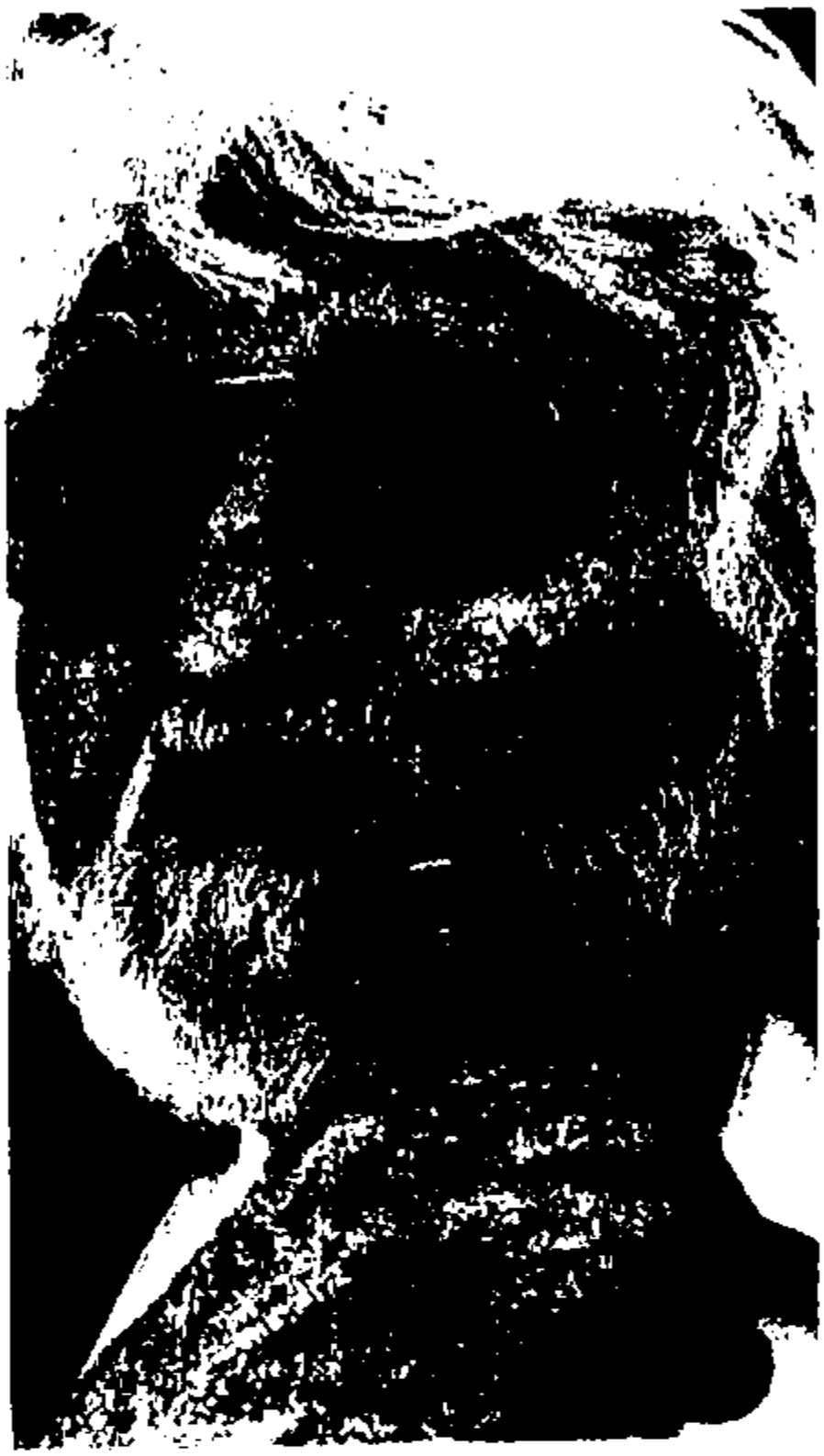

جامعہ کے نئے وائس چانسلر نجیب جنگ نے گیلری کا افتتاح کرتے ہوئے حسین کے اس خط کا بھی حوالہ دیا ہے جو حسین نے اس آرٹ گیلری کو ان کے نام سے منسوب کرنے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جامعہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کو لکھا تھا حسین کا رومن رسم الخط میں اردو میں لکھا یہ خط گیلری کے اولین دروازے کے سامنے والی دیوار پر ایک بڑے فریم میں آویزاں ہے اسی کے برابر حسین کی پہلی فلم Through the eyes of a painter کے پوسٹر کا حصہ بنی وہ تصویر بھی لگائی گئی ہے جس میں حسین ایک ہاتھ میں اپنا جوتا اور لالٹین لئے ننگے پیر کھڑے ہیں گیلری میں دلی آرٹس کالج اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آرٹس کالج کے کئی طالب علموں نے اپنے انداز سے اپنی ڈرائنگس کے ذریعے حسین کو سالگرہ کی مبارک دی تھی کئی طالب علموں نے حسین کے نام مبارک باد کے خط لکھتے ہوئے ان کی فنی بلندیوں کو اپنے لئے فیضان کا سرچشمہ کہا تھا اس موقع پر سہمت کی طرف سے شائع کردہ ایک کتاب Hussain at 94 بھی حسین کو خراج عقیدت کے طور پر جاری کی گئی اسی تقریب میں حسین کی بنائی فلمیں گج گامنی، میناکشی، تھرودی آسیز آف اے پینٹر اور Atale of three cities بھی دکھائی گئی گیلری میں افتتاح کے روز اور بعد کے دنوں میں طالب علموں، آرٹ کے شوقینوں اور حسین کے مداحوں کا آنا جانا لگا رہا جامعہ میں اس آرٹ گیلری کی تعمیر سے جنوبی دلی میں ایک بے حد خوبصورت آرٹ گیلری کا اضافہ ہو گیا ہے اہل جامعہ نے گیلری کو حسین کے نام سے منسوب کر کے مصوری کی پوری دنیا کو اپنی ایک خوبی کا احساس دلایا ہے کہ جامعہ ہندستانی فنون کے قومی دھارے میں اس گیلری کے ذریعے اپنے ہونے کا احساس دلانے میں یقیناً کامیاب ہے۔ (ذ۔ج)

www.taemeernews.com

طیب مہتہ نے ہندستانی آرٹ کو عالمی توقیر دلائی

● گجرات کے ایک گاؤں میں پیدا ہونے والے ممتاز پینٹر طیب مہتہ (1925-2009) نے اپنے کیریر کا آغاز فلم ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا تھا فلم 'Koodal' کے حوالے سے انہیں فلم فیئر ایوراڈ بھی ملا تھا لیکن دراصل طیب مہتہ فطرتاً اور مزاجاً پینٹر تھے انہوں نے اسی شوق کی خاطر جے جے اسکول آف آرٹس میں داخلہ لے لیا طیب مہتہ نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے یا اپنے خاندان کیلئے اپنی زندگی میں کوئی تاریخ ساز کام انجام دیں گے لیکن ہوا یہ کہ تاریخ نے خود انہیں یہ لمحے عطا کئے کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ انہوں نے اپنے معاصر ہندستانی آرٹ کو اپنی پینٹنگس کے ذریعے بین الاقوامی توقیر دلائی اور انہوں نے دنیا کو اپنے اس تاثر کو بھی رد کرنے پر مجبور کر دیا کہ ہندستانی محض اشکال سازی اور روایتی طرز کی مصوری کے سوا اور کچھ نہیں کرتے ان کی بنائی مشہور پینٹنگ کالی کی ایک کروڑ قیمت لگی اور ان کی دوسری پینٹنگ 'Celebration' کو جب christie's کے نیلام میں ایک کروڑ ۵۰ لاکھ کی بولی پر بیچا گیا تو یہ پہلا نیلام تھا کہ کسی ہندستانی پینٹر کی کسی تصویر کو اتنی بڑی رقم میں خریدا گیا ہو اس کے علاوہ ان کی دوسری پینٹنگس "falling fingure with bird" "Mahishastura" اور "Gesture" کے عنوان سے نئی پینٹنگ بھی کافی مہنگے داموں فروخت ہوئیں اس طرح طیب مہتہ سب کے لئے ایک سنگ میل بن گئے اور یہ اعتراف کھلے عام ہونے لگا کہ عالمی سطح پر ماڈرن انڈین آرٹ کے شہ پاروں کی قدر و قیمت اور برتری کا احساس دلانے میں طیب مہتہ کی پینٹنگس نے بے حد اہم رول ادا کیا ہے آج ہندستانی آرٹ حق میں جو موافق اور سازگار فضا عالمی سطح پر میسر یہ طیب مہتہ یہ کی دین ہے۔ لیکن ادھر طیب مہتہ کو معاملہ یہ ہے وہ اپنی اس کامیابی سے خاصے بے نیاز اور لاپرواہ ہیں۔

www.taemeernews.com

طیب مہتہ کی پینٹنگس اپنی صاف اور شفاف بلیک لائن اور رنگوں کے امتزاج اور پس منظر میں انسان ، جانور اور چڑیوں کے امیج کی بنا پر اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتی ہیں طیب مہتہ سماجی تبصرے یا حقیقت نگاری میں یقین نہیں رکھتے وہ آرٹسٹ کی فنی آزادی اور خودمختاری کے حق میں ہیں نظریات میں الجھنا انہیں نہیں آتا ان کی پینٹنگس میں خون، تشدد اور جارحیت جیسے موضوع بڑے حاوی ہیں یہ موضوعات طیب مہتہ کو بطور پینٹر مضطرب بھی رکھتے ہیں اور فکر مند بھی ان کی فنکارانہ حسیت تشدد کے کسی بھی عمل پر پریشان ہو اٹھتی ہے تقسیم ملک کے فسادات سے لے کر آج تک ہونے والے فسادات طیب مہتہ کی پینٹنگس میں کہیں نہ کہیں ضرور در آئے ہیں بلکہ یہ ان کی پینٹنگس کا ایک حاوی عنصر بھی بن گئے ہیں طیب مہتہ کی پینٹنگس کو پسند کرنے والوں میں مختلف زبانوں کے شاعر اور ادیب بھی ہیں جو طیب کی پینٹنگس سے خود کو بلا کسی تامل اور پس و پیش کے ہم آہنگ کر لیتے ہیں طیب مہتہ کا یہ مشہور جملہ ایک آرٹسٹ اور اسکے فن کے ساتھ رشتے پر بہت صادق آتا ہے۔

"I paint of my times but i am not of this time"

۸۴ سالہ طیب مہتہ اپنے معاصرین سے خوشگوار اور دوستانہ مراسم رکھتے تھے وہ حسین کی خود اختیار کردہ بے گھری پر خاصے افسردہ تھے اور حسین کے حق میں آواز بلند کرتے رہے تھے طیب مہتہ کے بارے مین انجلی ایلا مینن نے ایک بار کہا تھا "A painter's painter" آرٹسٹ راما چندرن کے خیال میں طیب مہتہ کا لائن اور distortion میں جواب نہیں تھا ان کے نزدیک descriptive والے عنصر کے مقابلے میں image زیادہ اہم تھا وہ آسکر وائلڈ کے اس قول میں یقین رکھتے تھے "A artist should be: he revealed his art concealed the artist" پینٹر ستیش گجرال نے طیب مہتہ کے ساتھ اپنی دیرینہ تعلق اور دوستی کو یاد کرتے ہوئے جو مضمون لکھا ہے اس میں انہوں ں ے لکھا ہے کہ 'طیب کے ساتھ میری طویل دوستی کے ایک لمبے عرصے میں ایک پل بھی ایسا نہیں آیا جب مجھے طیب مہتہ کے حرکات وسکنات میں رتی برابر بھی فرق کا احساس ہوا ہو۔ اسی طرح ان کی پینٹنگ کا بھی معاملہ ہے مجھے وہ ہمیشہ ہی ایک خلاء کے پس منظر میں ایک ہی انداز سے آویزاں نظر آئی ہیں۔ ان کے یہاں بدلتے ہوئے حالات کے باوجود ان کے بلا جھجک اور برجستہ اظہار اور ردعمل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا'۔

جب طیب مہتہ کو کالی پینٹنگ پر ایک کروڑ روپیہ ملا تو کسی نے ان کا ردعمل پوچھا تو طیب مہتہ ایک لفظ fame بول کر چپ ہو گئے طیب کہنا چاہتے تھے کہ ایک کروڑ ملا تو میری پینٹنگس کی قیمت بڑھ گئی جو میں برسوں بنا رہا ہوں۔ (ذ۔ج)

www.taemeernews.com

موسیقی

استاد علی اکبر سرتا پا سنگیت

● دنیا کے ممتاز وائلن نواز لارڈ بہودی مین ہن نے سرود نواز استاد علی اکبر کو دنیا کے عظیم سنگیت کاروں میں شمار کیا تھا اسی سال ۱۸ر جون کو سان فرانسسکو میں زندگی کی آخری سانس لینے والے علی اکبر ۱۴ر اپریل ۱۹۲۲ء کو اپنے آبائی گھر مشرقی بنگال کے برہمن باریہ گاؤں میں پیدا ہوئے وہ دنیائے سنگیت کے جگت بابا استاد علاء الدین خاں کی سب سے بڑی اولاد تھے ان کی والدہ کا نام مدینہ بیگم تھا علی اکبر گردے کی بیماری میں مبتلا تھے اور کچھ برسوں سے مسلسل Dialysis پر تھے وہ آخری بار سانس فرانسسکو سے ہندستان ۲۰۰۶ء میں آئے تھے جب انہیں کلکتے مین ڈاورلین میوزک فیسٹول میں شریک ہونا جس میں وہ پچھلی چار دہائیوں سے شریک ہوتے رہے تھے اس بار کی کلکتہ آمد پر انہوں نے سرود پر راگ جے جے ونتی اور درگیشوری بجایا تھا سرود بجاتے بجاتے استاد نے اپنی محویت اور سکوت کو زبان دیتے ہوئے سننے والوں سے کہا تھا ''میرا دیش میرے ساتھ ہے میں سروں میں جیتا مرتا ہوں خدا کا شکر ہے علی اکبر کو سروں کا جہاں مل گیا سر میرے اندر رچے بسے ہیں اور وہ میری آخری سانس تک مجھ میں رہیں گے۔''

استاد نے سرود پر آخری نوٹ بجایا تو ان کے سنگیت کے پجاریوں نے ان سے ان کے تخلیق کردہ پسندیدہ راگ میدھومی اور چندرانندن بجانے کی فرمائش کی تھی لیکن استاد کو بیماری نے مضمحل کر دیا تھا انہوں نے اپنے پرستاروں سے پھر کبھی کا وعدہ کر کے معذرت کر لی تھی کلکتے کے اس فیسٹول کے موقع پر انہیں بنارس کا میوزک کنسرٹ خاص طور سے یاد آیا جو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں وہاں کے سنگیت پریشد کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتا تھا انہوں نے بنارس کی ان سنگیت سبھاؤں میں اپنی اور روی شنکر کی جگل بندی کا خاص طور سے ذکر کیا ان کی روی شنکر کے ساتھ جگل بندی بے حد مشہور تھی اس کے

www.taemeernews.com

انعقاد کا جب بھی کوئی موقعہ ہوتا تو سننے والوں کا ہجوم امڈ پڑتا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں وہ آخری بار وارانسی اس وقت آئے تھے جب ان کے بے حد عزیز پنڈت کشن مہاراج نے انہیں Solo پرفارمینس کے لئے مدعو کیا تھا یہ سنگیت سبھا بنارس کے استاد طبلہ نواز پنڈت کانٹھے مہاراج کی یاد میں ہوئی تھی اس سبھا میں علی اکبر نے اپنا ایجاد کردہ راگ چندرانندن بجایا تھا اور طبلہ پر ان کی سنگت پنڈت کشن مہاراج نے کی تھی وارانسی کے سنگیت پریمی آج تک اس جادو بھری رات کو نہیں بھولے جب علی اکبر کے سرود اور کشن مہاراج کے طبلے کی گمک نے فضا کو اور محفل کو پوری طرح سنگیت میں ڈوبو دیا تھا یہی وہ محفل بھی تھی جب علی اکبر نے جوڑ کے سر بھی لگائے تھے انہوں نے ان دونوں Mysticism Notes کی بڑی دلپذیر وضاحت کی تھی انہوں نے کہا تھا کہ سنگیت میں چھپے ماورائی طلسم اور شکتی کا عرفان انہیں اپنے والد استاد علاء الدین خاں سے حاصل ہوا تھا وہ کہا کرتے تھے ''میرے والد سیدھے سادھے تھے مگر وہ غیر معمولی سنگیت کار تھے ایسے سنگیت کار تھے جو صرف نوٹ کی مدد سے ایک راگ کو مجسم کر دیا کرتے تھے اور اس ایک نوت کی مدد سے مطلوبہ راگ کے تمام تر امکانات کو سننے والوں تک منتقل کر دیا کرتے تھے اس معاملہ میں وہ اپنا جواب آپ تھے۔''

استاد علی اکبر نے تین شادیاں کی تھیں ان بیویوں سے ان کی گیارہ اولاد ہیں امریکی بیوی میری ان کی تیسری بیوی ہے جو ان کے ساتھ سانس فرانسسکو میں تھیں ان کی پہلی بیوی زبیدہ بیگم اور ایک اور ہندستانی بیوی رائے دلاری دیوی تھیں علی اکبر سے چھوٹی تین بہنیں تھیں ان کی ایک بہن جو سُر بہار کی ممتاز Exponent تھیں ان کا نام انا پورنا تھا جن کی شادی استاد علاء الدین کے شاگرد ستار نواز روی شنکر سے ہوئی تھی علی اکبر کی سنگیت کی تربیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے والد کو انہیں مار پیٹ کے سنگیت کی طرف لانا پڑا تھا لیکن یہ افواہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ بات طے ہے کہ علی اکبر نے ساز اور سر اور راگوں کی تربیت مرحلے وار کلاسیکی سنگیت کی روایتوں کے عین مطابق حاصل کی تھی اسی لئے ان کے سنگیت میں کلاسیکی سنگیت کی دائمی قدروں کے بھرپور عرفان کی روشنی ملتی تھی اگر علی اکبر کی سنگیت کی گہرائیوں میں اتری ہوئی تعلیم نہ ہوتی تو وہ گوری منجری، پالس کافی، چندرانندان، مدھومالتی اور جوگیا کالگدا جیسے راگوں کی ایجاد نہ کر پاتے استاد خود بتاتے تھے کہ سروں اور راگوں کی پہچان اور رموز کے بعد کسی شاگرد کی تعلیم کی تکمیل کا وہ مرحلہ آتا ہے جب اسے الاپ، جوڑ۔ جھالا کا دشوار مرحلہ طے کرنا ہوتا ہے اس فنکارانہ پختگی کے بعد اسے لکھاوج اور قبلہ کے صوتی آہنگ کو Rhythnic patern سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے نشاطیہ سازوں رباب، سرود، سُر بہار اور ستار کے صوتی اسرار بھی دریافت کرنے ہوتے ہیں۔

www.taemeernews.com

جودھ پور دربار

● استاد علاء الدین چاہتے تھے کہ ان کا بڑا بیٹا ان کے ساتھ رہے مگر علی اکبر باپ کی قدر آور پرچھائیں سے دور اپنی پہچان کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے تھے وہ جاڑے کی سردار تھی جب علی اکبر اپنی بیوی کو شریک راز کرتے ہوئے سرود، ہاتھوں میں تھامے ریلوے اسٹیشن آئے اور کلکتہ جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئے کلکتے میں سنگیت سبھائیں بہار پر تھیں علی اکبر کی اس دنیا میں غیر معمولی پذیرائی ہوئی کچھ سالوں بعد وہ لکھنو آکر آل انڈیا ریڈیو میں اسٹاف ، آرٹسٹ بن گئے ایک بار جودھ پور جا کر راج گھرانے کے افراد کے روبرو سرود بجانے کا موقعہ ملا راج گھرانہ بے حد متاثر ہوا، مہاراجہ ہندنت سنگھ کے اصرار پر علی اکبر

دربار کے ارباب نشاب میں شامل ہونے پر رضا مند ہو گئے راج دربار اور خاندان نے ان کی ایسی پذیرائی کی کہ امید بھون پیلس کے ایک ہال کا نام ان کے نام پر رکھ دیا کچھ سالوں جودھ پور دربار سے وابستہ رہنے کے بعد استاد علی اکبر کلکتے چلے آئے اور یہاں انہوں نے اپنی بہن انا پورنا کی مدد سے علی اکبر کالج آف میوزک قائم کیا وائلن نواز یہودی مین ہن سے اتفاقی ملاقات کے نتیجے میں نیویارک میوزیم آف آرٹ میں بطور مہمان فنکار مدعو کئے گئے یہاں سنگیت کی ایک سجی ہوئی محفل میں علی اکبر نے راگ بھیرویں اور پیلو چھیڑا، طبلے پر پنڈت چترلال نے سنگت کی اور پھر ایسا سماں بندھا کہ یہ یاد بھی نہ رہا کب سرود اور طبلہ بجتے بجتے خاموش ہوئے تھے امریکہ کے اس پہلے دورے کے بعد استاد علی اکبر کے لئے امریکہ جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ایک معمول بن گیا تھا بالآخر استاد نے سانس فرانسسکو میں آباد ہو جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے وہاں علی اکبر کالج آف میوزک بھی قائم کر دیا تھا۔

استاد علی اکبر کو جن شہروں کی یاد آخر دم تک ستاتی رہی ان میں ان کا مشرقی بنگال والا آبائی گاؤں، جودھپور اور کلکتہ تھا سان فرانسسکو میں انہیں وطن کی یاد زیادہ ستانے لگی تھی جذباتی ہو کر وہ کہہ اٹھتے

www.taemeernews.com

تھے میرا وطن میرے اندر تک پھیلا ہوا ہے۔ آخری دنوں میں انہیں یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ زندگی اپنی اذیتوں اور ناقابل برداشت سلوک کے باوجود خوبصورت ہے۔ سنگت کے لئے۔ ویسا ہی دماغ بھی چاہئے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ سنگت کی ابدیت میں۔

علی اکبر کی نازک مزاجی

● علی اکبر اپنے سنگیت اور سرود کے بارے میں غیر معمولی حساس تھے یہ دونوں ہی ان کی زندگی میں خون کی طرح رچ بس گئے تھے علی اکبر کی شیدائی ہرجی ملک نے استاد کی کئی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں علی اکبر کو Unesco نے پیرس میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اس پرگروام کو منتخب محفل کے روپ میں ہونا تھا اس زمانے میں پیرس میں یونیسکو کا آفس مچنگ ہوٹل میں تھا ہوٹل میں کوئی آدی ٹوریم نہیں تھا پروگرام ایک بڑے کمرے میں رکھا گیا تھا اور سننے والوں کے سامنے کسی قدر اونچا ایک اسٹیج مدعو فنکار کے لئے آراستہ کیا گیا اس محفل میں ہندستانی بہت کم تھے یہ دفتر کے ختم ہونے کے بعد رکھی گئی محفل تھی اس لئے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یونیسکو کے آفس میں کام کرتے تھے علی اکبر تو ایک گھنٹے سرود بجانا تھا ابھی انہیں پندرہ بیس منٹ ہی سرود چھیڑے ہوئے تھے کہ علی اکبر نے سرود بجانا بند کر دیا ساز ڈانس پر چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور پل بھر میں روم سے باہر نکل گئے لوگ ان کے اس رویے اور طرز عمل سے حیران رہ گئے علی اکبر کا تاثر یہ تھا کہ جو تھوڑے بہت لوگ وہاں تھے وہ ہندستانی ساز سرود سے ناواقف اور ہندستانی سنگیت سے بے بہرہ تھے انہیں لگا کہ ان کا سننے والوں سے کوئی ربط نہیں بن پا رہا ہے تو وہ اٹھ گئے اور محفل سے چلے آئے۔

دوسرے دن وہ ہندستانی سفیر کی خصوصی درخواست پر ہندستانی سفارت خانے چلے آئے ایک چھوٹے سے روم میں ان کے پرستاروں کا جمگھٹا لگا تھا وہ آئے تو لوگ تالیاں بجاتے ہوئے کھڑے ہو گئے استاد فرش پر بیٹھ گئے سامعین پر بھرپور نظر ڈالی سب کے چہرے استاد کی آمد سے خوش تھے اور ان کی آنکھوں سے ہندستانی سنگیت اور سرود کا ذوق وشوق چھلکا پڑ رہا تھا استاد علی اکبر نے سرود کو سروں میں ڈھالا اور بے خود ہو کر مقررہ وقت سے کہیں زیادہ سننے والوں کو سرود اور سنگیت کے حصار کشش سے باہر نکلنے نہیں دیا۔ (ذ۔ج۔)

www.taemeernews.com

گنگو بائی ہنگل

● گنگو بائی ہنگل کو بجا طور پر لجنڈ Legend کہا جاتا ہے گنگو بائی نام تھا سنگیت کی بہت سی گھسی پٹی روایتوں کو بے معنی بنانے اور بہت سی روایتوں کی پاسداری اور تحفظ کرنے والی گائیکہ کا وہ کرناٹک اور ہندستانی کلاسیکل موسیقی کا ایک خوبصورت امتزاج اور سنگم تھیں یہ ایک عام تاثر ہے کہ کرناٹک سنگیت والوں کو ہندستانی کلاسیکی سنگیت والوں کے مقابلے میں معاوضہ کم ملتا ہے اور یہ کہ کرناٹک سنگیت کے مقابلے میں کلاسیکی سنگیت والوں کی شخصیت میں ملک گیر پیمانے پر خاصی کشش اور گلیمر ہوتا ہے مگر گنگو بائی نے اپنی ذات سے یہ مفروضہ بھی جھٹلا دیا ان کی ماں امبھا بائی اپنے زمانے کی مشہور کرناٹکی گلوکارہ تھیں انہیں امید تھی کہ بیٹی گنگو انہیں کرناٹک سنگیت کی شیلی میں رات دن گاتا دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ کرناٹکی گائیکی اس کا خاندانی ورثہ ہے تو وہ ضرور کرناٹکی گائیکی کو اپنا لے گی امبا بائی نے بیٹی کو کرناٹک سنگیت سکھایا بھی اور اس کا شوق بھی دلایا لیکن گنگو بائی ہندستانی کلاسیکی سنگیت کے شوق کو ترک کرنے پر راضی نہ ہوئی ماں نے یہ کہہ کر مزاحمت چھوڑ دی کہ کرناٹکی گائیکی تو ہر وقت گھر میں موجود ہے اس لئے اسے کسی بھی وقت سیکھا جا سکتا ہے گنگو بائی کی آواز میں بڑا رس تھا کامیابی ان کے قدم چومتی رہی استاد عبدالکریم خاں نے خود بھی گنگو بائی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔ خوب کھاؤ اور خوب گاؤ، ایک بار بروڈہ میں بھیم سین جوشی کے ساتھ گاتے ہوئے جوشی نے جو گنگو کے استاد بھائی تھے یہ کہہ کر

www.taemeernews.com

گنگو بائی کی خداداد گائیکی کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا یہ جو گنگو، ڈھائی وت، کا استعمال کرتی ہین یہ کسی Scale کا حصہ نہیں یہ گنگو کو خدا کا عطیہ ہے۔

گنگو بائی میں ایک فنکار کی معصومیت تھی ایک بار انہیں جب بڑا اعزاز دیا جانے والا تھا تو citation پڑھا جانے لگا تو گنگو بائی بچے کی طرح ہاتھ باندھ کے خاموش کھڑی ہوگئین اور اعزاز لینے کے بعد کہا کہ انہیں یہ انعام لیتے ہوئے ایسے لگا جیسے وہ اسکول کی بچی ہوں جو اپنا انعام لینے کے لئے چپ چاپ کھڑی ہو یہ ان کے کردار کی خوبی تھی وہ کبھی غرور اور تمکنت سے کسی سے نہں ملتی تھیں ان میں بے حد خاکساری تھی وہ سادہ سے اسٹیج پر کسی ظاہری طمطراق کے بغیر گھنٹوں گاتی تھیں کیرانہ گھرانے کی صف اول کی گائیکہ گنگو بائی کو پچاس سے زائد ایوارڈس دیئے گئے تھے وہ پدم بھوشن اور پدم وبھوشن کے اعزاز سے بھی نوازی گئیں تھیں انہیں چار بار اعزازی ڈاکٹریٹ ڈگریاں دی گئیں۔ اور ۴ بار خطابات بھی دیئے گئے گنگو بائی کو یہ بھی اعزاز ملا کہ انہیں ملک کے نو وزیر اعظموں اور چار صدر جمہوریہ کے ہاتھوں مختلف موقعوں پر اعزاز وانعام دیئے گئے دلچسپ بات یہ ہے کہ گنگو بائی کی تعلیم پانچویں جماعت تک آکر رک گئی تھی لیکن انہیں اعزازی پروفیسر اور یونیورسٹیوں نے اپنے سینٹ کا ممبر بنایا تھا وہ ہندستانی کلاسیکل میوزک کو فروغ دینے کے لئے ان گنت بار بیرونی ملکوں میں گئین اور قومی سطح پر اسکولوں کے بچوں میں ہندستانی کلاسیکی سنگیت کے سیکھنے کی ترغیب دینے کے لئے انہوں نے کوئی ۲۰۰ اسکولوں میں جا کر بچوں کو اپنا گانا سنایا۔ وہ ۹۷ برس کی ہو رہی تھیں اور سو برس تک جینا چاہتی تھیں اس خواہش کا اظہار انہوں نے ہبلی کے ایک ہسپتال میں بستر پر لیٹے لیٹے کیا تھا جہاں وہ زیر علاج تھیں ۵ر مارچ ۱۹۱۳ء کو دھارواڑ میں پیدا ہونے والی گنگو بائی سہنگل نے سنگیت کی پہچان رکھنے والے گھرانے میں جنم لیا تھا انہوں نے کیرانہ گھرانے کے استاد عبد الکریم خاں کو اپنے گھر بجنے والی سنگیت کی محفلوں میں سنگیت کے رموز سکھاتے دیکھا تھا۔

گنگو بائی کی زندگی کا تمام تر انحصار مراٹھی فلموں کے گانے گانا، ریڈیو پر اپنا گائن سنانا اور مختلف کنسرٹ میں شرکت کرنا رہا ان کی شادی ایک برہمن وکیل گوروراج سے ہوئی تھی مگر 20 افراد پر مشتمل خاندان کو گنگو بائی کو اپنے سنگیت سے پالنا پڑتا تھا گنگو بائی اپنے گورو سوائے گندھرو کی بڑی عزت کرتی تھیں کہ انہوں نے پر اعتماد انداز میں سنگیت کا گیان دیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ سنگیت کی محفلوں میں اپنی مستقل جگہ بنا سکیں سنگیت کے گیانیوں کا خیال تھا کہ گنگو بائی کی گائیکی میں گنگا جیسی طاقت والی روانی تھی جو ہر کنارے اور گھاٹ کو پاک کرتی ہوئی گزر جاتی ہے سنگیت کو عبادت سمجھنے والی گنگو بائی ملک کی ان گنی چنی منتخب خواتین کی صف اول سے تعلق رکھتی تھیں جن میں ہیرا بائی باڈونکر، کیسر بائی کیر کر، رسولن بائی، جدن بائی، بیگم اختر، سبا لکشمی، اور وینا دھنم جیسی خواتین شامل ہیں جو اپنی محنت اور فنی ریاضت سے صف اول میں اپنی ممتاز جگہ بنانے میں کامیاب رہیں۔ (ذ۔ج)

www.taemeernews.com

فلم

لتا جی کی ۸۰ ویں سالگرہ پر

● کوئی ۳۶ برس پہلے جون ۱۹۷۳ء کو گلوکارہ لتا منگیشکر نے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سننے والے ہندستانی اور پاکستانی سامعین کی باربار کی فرمائش پر 'روبرو' پروگرام کے لئے اپنا انٹر ویو ریکارڈ کرنے کی آمادگی ظاہر کی تھی مسلسل پانچ سال کے تعاقب کے بعد دلی کے اشوک ہوٹل میں اپنے پہلے عوامی پروگرام کے موقع پر لتا جی نے ایک دوپہر میرے فون کرنے پر کہا "آپ آجائیے آپ کئی بار ممبئی آئے لیکن آج میں ریڈیو سے کیا اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتی ہوں" میں اس Scoopپر جذبات اور تھرل سے لبریز اشوک ہوٹل پہنچ گیا لتاجی نے اپنے طویل انٹر ویو میں پہلی بار پوچھے جانے والے سوالوں کے جو جواب دیئے تھے وہ اتنے برسوں بعد بھی سننے والوں کے حافظے میں محفوظ ہیں یہ لتا جی کا پہلا اور آخری طویل انٹر ویو تھا۔جسے آکاش وانی نے اپنے آرکائیوز میں محفوظ کیا اور بار بار کئی دن تک کی جانے والی نشہیر کے بعد جب یہ انٹر ویو اردو سروس سے نشر ہوا تو لاہور کراچی کے علاقوں میں کوئی ریڈیو اور ٹرانسٹرایسا نہ تھا جس پر لتا کی آواز نہ سنائی دے رہی ہو۔ لتا جی کا یہ انٹر ویو 'ذہن جدید' کے پہلے شمارے میں ستمبر تا نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا ہم لتا منگیشکر کی ۸۰ویں سالگرہ کے موقع پر ان کا یہ یادگار اور تاریخی انٹر ویو اس عظیم گلوکارہ کوخراج محبت پیش کرنے کی غرض سے اپنے ہی ایک شعر کے ساتھ نذر کررہے ہیں۔

بول گیتوں کے دھنیں ساز کی آواز کا لوچ
گانے والے ذرا دل والوں کا انجام بھی سوچ

● زبیر رضوی

www.taemeernews.com

● لتاجی اگر میں یوں کہوں کہ آپ کی آواز اور اس کی نغمگی کا حسن ہم ہندستانی عوام کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن کر رہ گیا ہے تو غلط نہ ہوگا آپ ہماری نہیں ان سب کی محبوب اور واحد پسندیدہ گلوکارہ ہیں جنہیں بھارت کی فلمی موسیقی سے لگاؤ اور پیار ہے۔ یقین کیجئے لتا جی اگر اس وقت ہمارے سننے والے یہاں موجود ہوتے تو وہ بھی اس آواز کو مالائیں پہناتے جو چوتھائی صدی سے ان کی زندگی میں قوس و قزح کے رنگ بکھیر رہی ہے۔ میں جاننا چاہوں گا کہ چاروں طرف اپنی ہی آواز کا حسن بکھرا ہوا دیکھ کر آپ کو کیسا لگتا ہے؟

میں نے جب پہلے پہلے ریکارڈنگ کی تھی اور میرا پہلا ریکارڈ آیا تھا تو میں ریڈیو کے پاس بیٹھی رہتی تھی کہ کہیں فرمائش میں وہ بجے اور میں اپنی آواز سنوں لیکن اب اتنے میرے گانے بجتے ہیں کہ میرے اوپر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

● آپ کو یاد ہے کہ آپ کا پہلا گانا کون سا تھا؟

جی ہاں وہ ایک مراٹھی گانا تھا جو میں نے کسی فلم کے لئے گایا تھا ویسے میں نے اس فلم میں ایکٹنگ بھی کی تھی۔

● فلم کون سی تھی ؟

وہ فلم مسز ابیر مراٹھی فلم تھی پتا جی کے انتقال کے بعد وہ پہلی پکچر تھی جو میں نے سائن کی تھی اور جس میں چھوٹا سا رول بھی کیا تھا۔

● اس کے بعد آپ نے ایکٹنگ کو جاری نہیں رکھا اور موسیقی کے دنیا مں چلی آئیں ایسا کسی خاص وجہ سے ہوا ؟

مجھے ایکٹنگ کرنا پسند نہیں تھا۔ پتا جی کے انتقال کے بعد کچھ حالات ایسے تھے کہ مجھے فلم انڈسٹری میں آنا پڑا اور کیوں کہ میں بہت چھوٹی تھی اس لئے مجھے ایکٹنگ ہی کرنی پڑی میری آواز بہت پتلی تھی اس لئے میں پلے بیک نہیں گا سکتی تھی میں نے جب ایکٹنگ شروع کی تھی تو مجھے کسی دن بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ یہ اچھا کام ہے مجھے ہمیشہ میک اپ کرنا اور لائٹ کے سامنے کھڑا ہونا اچھا نہیں لگتا تھا اور جب مجھے موقع ملا تو میں نے ایکٹنگ چھوڑ کے پلے بیک گانا شروع کر دیا۔

● آپ نے ہزاروں نغمے گائے ہیں کوئی فلم ایسی نہیں ہوتی جس میں

www.taemeernews.com

آپ کے نغمے شامل نہ ہو عام تاثر یہ ہے کہ آپ کے پاس آئینہ دیکھنے کے لئے بھی وقت نہیں ہوتا (ہنسی)

نہیں ایسا تو نہیں ہے لیکن جب میں ریکارڈنگ کرتی ہوں تو ہم لوگوں کو کافی دیر لگتی ہے اس میں میں تھک جاتی ہوں اور پھر کوئی کام کرنے کو من نہیں کرتا۔

● آپ نے اپنے والد کا ذکر کیا۔ آپ کے والد تو مہاراشٹر کے بہت بڑے سنگیت کار تھے ظاہر ہے کہ آپ کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ رہاہوگا ان کے بارے میں کچھ بتائیے ؟

ہم لوگوں کی ڈرامہ کمپنی تھی اور میرے پتاجی اس میں کام کرتے تھے۔ وہ ویسے کلاسیکل بھی گاتے تھے۔ انہوں نے مجھے پہلے کلاسیکل میوزک ہی سکھانا شروع کیا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ان کے کوئی چیلے تھے جو ریاض کر رہے تھے تو میرے پتاجی نے ان سے کہا تھا کہ تم تھوڑی دیر اس راگ کا ریاض کرو میں جاکے آتا ہوں میں باہر گیلری میں کھیل رہی تھی میرے پتاجی کے شاگرد تھوڑا غلط گا رہے تھے تو میں نے جاکر ان کو ٹھیک کیا اور کہا کہ ایسے نہیں ایسے گایئے تو میرے پتاجی نے باہر سے سنا وہ تبھی آئے تھے اس وقت تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ رات کو میری ماں سے بلا کر ان سے کہا کہ بھئی اتنا اچھا سنگر گھر میں ہے اور میں باہر لوگوں کو سکھا رہا ہوں۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ تو دوسرے دن صبح کو میرے پتاجی نے بٹھا کر کہا کہ اب میں تمہیں سنگیت سکھایا کروں گا۔

● تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ اب جو کچھ بھی آپ کی آواز اور نغمگی۔ آپ کی موسیقی ہم تک پہنچی ہے یا سننے والوں تک پہونچ رہی ہے تو اس سب کے لئے آپ اپنے والد ہی کا نام لیں گی۔

جی ہاں یہ بات سچ ہے پتاجی کے انتقال کے بعد میں نے امان علی خاں صاحب اور امانت صاحب سے بھی گانا سیکھا ہے تھوڑا، لیکن اپنے پتاجی ہی کی تعلیم کا ذکر کروں گی آج جو میرا نام ہوا ہے اس کے پیچھے ان ہی کا آشیرواد ہے اور انہوں نے جو سکھایا ہے اسی کو میں زیادہ مانتی ہوں۔

● آپ کی بہنیں بھی گاتی ہیں۔ ہمارے سننے والوں کو یہ دلچسپی ہوگی کہ آپ اپنے خاندان اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ہم چار بہنیں ہیں اور ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہردے ناتھ ہے، مینا ہم لوگ جب چھوٹے تھے تو پتاجی سے ہم نے تھوڑا سنگیت سیکھا تھا۔ آشا، اوشا ہردے ناتھ ان تینوں کو پتاجی سے کچھ نہیں ملا اور

www.taemeernews.com

نہ ہی ہردے ناتھ کو یہ یاد ہے کہ میرے پتا جی کیسے تھے اور کس ڈھنگ اور انداز سے گاتے تھے۔ جب میں چھوٹی سی تھی اور فلم انڈسٹری میں آئی تب میں چاہتی تھی کہ میرے بھائی بہن گانا نہیں گائیں بلکہ پڑھ لکھ کر کوئی ڈاکٹر کوئی وکیل کوئی کچھ بن جائے آشا نے میرا خیال ہے پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں گانا شروع کیا اور بہت محنت کر کے آج وہ بہت بڑی پلے بیک سنگر بن چکی ہیں، اور جس طرح کے وہ گانے گاتی ہیں اس میں شاید وہ اپنی مثال آپ ہیں وہ ان کا جو سنگیت ہے پریم ہے وہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس لئے کبھی کبھی وہ میوزک ڈائرکشن کرتی ہیں اور آج کل بچوں کے گانے کر کے انہیں ریکارڈ کرتی ہیں۔ اوشا جی پلے بیک گاتی ہیں — پر اس سے بھی زیادہ اچھا وہ پینٹنگ کرتی ہیں رہی بات ہردے ناتھ کی۔ ہردے ناتھ ہم سب سے چھوٹا ہے پر سنگیت کے گیان میں وہ ہم سب سے بڑا ہے خان صاحب امین خاں صاحب سے اس نے سنگیت کی تعلیم پائی ہے اور بہت محنت کرتا ہے اس کے پاس بہت سی کلاسیکل چیزیں ہیں اور وہ سیکھتا ہی رہتا ہے۔ کوئی بھی اگر اچھا گانے والا آجائے تو وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر انہیں سنتا ہے اور سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مراٹھی میں آج تک اس نے جتنے گانے بنائے ہیں۔ میں نے اور آشا نے گائے ہیں۔ مراٹھی میں جو ہمارا پرانا ڈھنگ تھا گانے کا اسے پورا بدل دیا ہے۔ اسی طرح اس نے میرا بائی اور غالب کی غزلوں کی دھنیں بھی بنائی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح جیسے غزل گائی جاتی ہے اسے اس نے چھوڑ کر تھوڑا سا الگ راستہ اختیار لیا ہے اس کے کمپوز کئے ہوئے گانے گاتے ہوئے مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔

● ہندستانی فلموں میں آپ نے میوزک کیوں نہیں دیا؟

دو چار پکچروں میں، میں نے بھی میوزک دیا ہے پر نام لتا منگیشکر نہیں دیا کسی اور نام سے۔ مراٹھی فلموں میں بھی میوزک دیا تھا۔ میں میوزک دینا تو چاہتی ہوں پر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب میں میوزک دونگی تو پھر پلے بیک گانے کو میں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گی اسی لئے میں ابھی فی الحال میوزک دینا نہیں چاہتی۔

● میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ کی طرح سفید ساری پہنے ہوئے ہیں حالانکہ بارڈر اس کا سرخ ہے پھول بھی بنے ہوئے ہیں آپ سفید ساڑی ہی کیوں پسند کرتی ہیں؟

مجھے سفید رنگ بچپن ہی سے پسند ہے۔ میں جب چھوٹی تھی تب میں گھاگھرہ چولی پہنتی تھی وہ بھی سفید ہی پہنا کرتی تھی بیچ میں ایک ایسا سمے آیا تھا کہ رنگین ساڑیاں پہننا شروع کی تھیں میں نے اور ہر رنگ کی ساڑی پہنتی تھی پر ایک دو سال کے بعد ایک دن ایسے ہی بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ اس بات کا تو کوئی انت ہی نہیں ہے۔ آج مجھے گلابی پسند آئی تو کل پیلی تو پرسوں نیلی اور اس کی کوئی سیما ہی نہیں ہے اسی لئے میں نے ایک ہی دن میں یہ فیصلہ کر لیا کہ آج سے میں سفید رنگ کے

www.taemeernews.com

علاوہ کوئی اور رنگ نہیں پہنونگی۔(دونوں کی ہنسی)

● لتا جی آپ نے غزل ، گیت اور بھجن ، ہر طرح کے گانے گائے ہیں۔ کیا آپ یہ کہہ سکیں گے آپ کو ان میں سے کون سا اسٹائل زیادہ عزیز ہے غزل ، بھجن ، یا گیت؟

مجھے بھجن گانا زیادہ اچھا لگتا ہے اور غزل بھی کلاسیکل ٹائپ، پر اگر کوئی بھی گیت ہو تو مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔

● آپ کے ان گنت ریکارڈ ہیں میرے خیال سے آپ کو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ کتنے ریکارڈ آپ کے اب تک ہوچکے ہیں اور ان میں مختلف طرح کے گانے آپ نے گائے ہیں۔ ان کو گاتے ہوئے ایک آرٹسٹ کے لئے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

آرٹسٹ کے لئے سب سے ضروری چیز ہے کہ وہ یہ سیکھے کہ گانے کا موڈ کیا ہے اس کو سمجھنا اور کوتیا جو ہوتی ہے اس کو سمجھ کے گانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ شروع شروع میں مجھے ماسٹر غلام علی نے کہا تھا کہ میم صاحب پہلے گانے کا جو مطلب ہے اس کو سمجھ لیا کرو پھر گاؤ مجھے یاد ہے اسی وقت سے میں نے اپنا یہ رویہ بنالیا کہ پہلے جو گانے کا مطلب ہے اس کو سمجھ لیتی ہوں اور پھر میں جو گاتی ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ اگر میں وہ کیریکٹر ہوتی اور یہ سچویشن میرے ساتھ پیش آتی تو میں کیا کرتی ۔اس تصور کے ساتھ میں گاتی ہوں۔

● آپ نے ہندستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں بھی گیت گائے ہیں، کس زبان میں گاتے ہوئے آپ کو زیادہ راحت محسوس ہوتی ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ انصاف کررہی ہیں، حالانکہ آپ تو ہر نغمے کے ساتھ انصاف کرتی ہیں اس لئے ہر نغمہ مشہور ہوجاتا ہے ۔ آپ کے تو زیادہ تر نغمے مقبول ہیں۔

مجھے ہندی گانے زیادہ آسان لگتے ہیں اور مجھے وہ گاتے ہوئے زیادہ اچھا لگتا ہے حالانکہ مراٹھی میری مادری زبان ہے۔ لیکن میں اس میں بہت کم گاتی ہوں۔ ہندی کے بعد مجھے بنگالی گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس زبان میں جب بھی میں گاتی ہوں میرے گانے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مجھے پسند بھی آتے ہیں۔

● لتا جی آپ کبھی کبھی تو اپنی پسند کے کچھ نغمے گنگناتی ہوں گی۔

میرے کچھ مراٹھی بھجن ایسے ہیں۔ وہ میں کبھی کبھی گنگناتی ہوں۔ پرانے کلاسیکل طرز کے

www.taemeernews.com

میرے کچھ ایسے گانے ہیں فلم کے۔ وہ بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور وہ بھی میں کبھی کبھی گاتی ہوں۔

● لتا جی اگر اپنی پسند کا ایک بھجن بھی ہمارے سامعین کو سنادیں تو بہتر ہوگا۔

ہاں میرے بھائی ہردے ناتھ کی طرز ہے بھجنوں کی اس میں سے ایک سنا دیتی ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے پتا جی کا نام بھی اس میں بار بار آتا ہے۔ ان کے نام کے ذکر کی وجہ سے یہ بھجن ہم لوگوں کو بہت پسند ہے۔ جیسے مائی مانو پیرا مالہائے اے دینا ناتھ۔

● آپ کی آواز اور اس آواز کا تمام تر جادو اور حسن سبھی گلوکاروں کے ساتھ ہمارے سننے والوں تک پہونچ رہا ہے۔ آپ نے سبھی میوزک ڈائریکٹروں کے ساتھ کام کیا ہے اور اس عرصہ میں بہت سے نئے گلوکار ہمارے یہاں ابھرے ہیں۔ ایک بات تو یہ بتائیے کہ فلم انڈسٹری میں ہر میدان میں ہر جگہ تبدیلی ہورہی ہے ہیرو بدل رہے ہیں۔ ہیروئن بدل رہی ہیں۔ ڈائریکٹر پروڈیوسر سب بدل رہے ہیں۔ لیکن آواز کی دنیا میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں کیوں نہیں ہوپارہی ہیں۔؟

بڑا مشکل سوال ہے۔ یہ تو کہنا مشکل ہے ویسے دیکھا جائے تو بہت سارے نئے نئے سنگرس آئے ہیں اور ان کا نام کیوں نہیں ہورہا ہے۔ یہ میرے لئے بھی ایک پہیلی سی ہے۔ نئے کلاکار جتنے آئے ہیں وہ اور آگے بڑھیں یہ ہم سب پلے بیک سنگرس چاہتے ہیں۔ اور اس طرح سے ہم لوگوں نے کئی میوزک ڈائریکٹر سے درخواست بھی کی ہے کہ بھئی نئے کلاکاروں کو آپ لیجئے۔ اور ان سے گانے لیجئے اب ہمیں مت بلائیے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ہمارے جو نئے نئے کلاکار آرہے ہیں وہ لوگ اتنی محنت نہیں کرتے اور زیادہ تر نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کامیاب نہیں ہوسکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ جو بھی نئے کلاکار آتے ہیں وہ اگر محنت کریں اور صرف یہ نہیں کہ ایک سنگر ہی بننا ہے ان کو تھوڑا سا کلاسیکل میوزک بھی سیکھنا چاہئے اور تھوڑا سا بھاشا پر بھی زور دینا چاہئے اور مجھے امید ہے کہ جو نئے کلاکار آئے ہیں یہ اپنے مستقبل کے لئے کچھ سوچیں گے اور محنت کر کے آگے آئیں گے۔

● سنا یہ ہے کہ آپ فلمی دنیا کے لوگوں سے بہت کم ملتی ہیں کیا یہ بات کسی دشمن نے تو نہیں اڑائی۔ (ہنسی)

ہاں میں بہت کم لوگوں سے ملتی ہوں اس لئے کہ میرا کام ہی ایسا ہے میں صبح جاتی ہوں اور ریکارڈنگ کر کے گھر آجاتی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے پارٹیوں میں جانا یا پریمئر میں شرکت کرنا پسند نہیں۔

www.taemeernews.com

میں فلمی پروگرام میں بہت کم جاتی ہوں اور مجھے اپنے گھر میں رہنا اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

● لتا جی آپ کے جو ریکارڈ دھیں انکی ایک لائبریری تو آپ نے بنائی ہوگی اگر بمبئی آپ سے انٹر ویو کرنے کا موقع ملتا تو ظاہر ہے آپ کا گھر دیکھنے کا بھی موقع ملتا تو وہ ریکارد آپ تنہائی میں سنتی ہوں جو آپ کی اپنی پُسند بھی ہوگی۔ یا ریڈیو پر آپ کا گانا آرہا ہو تو آپ کو سننے کا موقع مل جاتا ہوگا۔

میں اپنے ریکارڈس تو بہت کم سنتی ہوں۔ ہاں مجھے ریڈیو سننے کا شوق ہے۔ میرے پاس ریکارڈس کا کلیکشن تو ہے پر میرا کم ہے اور دوسرے آرٹسٹوں کا زیادہ ہے۔

● وہ کون کون سے آرٹسٹ ہیں جن کے ریکارڈ س آپ کی لائبریری میں ہیں۔

روی شنکر جی ہیں۔ بھیم سین جوشی ہیں۔ غلام علی خاں صاحب ہیں۔ اور سلامت نزاکت ہیں اور کچھ آرٹسٹ ہیں جو لائٹ میوزک گاتے ہیں۔ ان کے بھی میرے پاس سارے ریکارڈس ہیں۔

● لتا جی آپ نے ان گنت نغمے گائے ہیں یہ تو ظاہر ہے آپ کے لئے بڑا مشکل ہوگا کہ آپ ہر نغمہ ہمیں سنائیں یا میں آپ سے یہ کہوں کہ فلاں گیت گنگنا دیجئے۔ میں یہ چاہوں گا کہ آپ اپنی پسند کے اگر چن لیں اور تھوڑے تعارف کے ساتھ کچھ ایسے نغمے جو آپ کو زیادہ پسند ہوں وہ اس وقت گائیں!

مجھے جو میری فلموں کے گیت پسند ہیں اس میں بیتے نہ بتایئے رینا۔ آر ڈی برمن کا گانا ہے وہ مجھے بہت پسند ہے اس کی ایک دو لائن میں آپ کو سنا دیتی ہوں۔

بیتے نا بتائے رینا　　برہا کی جائی رینا

اور ایک گانا ہے میرا مجھے ایک دو ہی اس کی لائن یاد ہے مجھے بہت پسند ہے جو میں آپ کو سناتی ہوں۔

پیا بنا پیا بنا.....

میں ابھی آپ کو ایک بہت ہی مقبول گانا سناتی ہوں۔ اس کے جو سنگیت کار تھے انہوں نے کہا تھا کہ لتا بیٹا یہ میرا گانا بہت چلے گا۔ پر مجھے بہت دکھ ہے کہ وہ میوزک جو بہت مقبول ہوا افسوس غلام حیدر صاحب اپنے گانے کی مقبولیت دیکھنے کے لئے موجود نہیں رہے تو میں آپ کو سناتی ہوں۔

www.taemeernews.com

انہیں لوگوں نے انہی لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا۔

● اب اگر کچھ پرانے نغمے آپ کو یاد آرہے ہوں ورنہ سننے والے کہیں گے کہ لتا جی نے ہمیں اپنے پرانے نغمے نہیں سنائے اپنی پسند کے کچھ پرانے گیت اگر آپ کو یاد آرہے ہوں۔

اب میں آپ کو بہت ہی مشہور گانا سناتی ہوں اس کے پیچھے بھی ایک بہت بڑی کہانی ہے یہ گانا جب کھیم چند پرکاش جی نے بنایا تھا تو سب لوگ اس گانے کے خلاف ہو گئے تھے۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی کہنے لگے کہ لمبا گانا بنایا ہے گانے کی وجہ سے ہماری پکچر فلاپ ہوگئی۔ اور وہ اتنے پریشان ہو گئے اس وقت وہ بہت بیمار بھی تھے اور جب یہ گانا آہستہ آہستہ مقبول ہونے لگا تو ان کی موت ہوگئی تو سنیے۔

آئے گا آئے گا آئے گا آنے والا آئے گا

● میں یہ چاہوں گا کہ کچھ شعر بھی سنا دیجئے کیونکہ آپ نے تو غزلیں بھی بہت خوبصورت گائی ہیں۔ غالب کی غزلوں کا ایک ایل۔ پی جو آپ کے بھائی نے تیار کیا اس کو بھی ہمارے سننے والوں نے کافی پسند کیا ہے۔ بہر حال یہ تو آپ پر ہے کہ آپ کیا سنانا چاہیں گی۔

یہ مجھے بہت پسند ہے اور ہردے ناتھ کو بھی یہ راگ ہی مجھے بہت پسند ہے۔ یہ غزل میں سب سے زیادہ پسند کرتی ہوں۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا

● لتا جی اقبال کی بڑی مشہور غزل ہے وہ آپ نے گائی ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں اسے سننے والوں نے بے حد پسند کیا ہے یہ ہندستانی اور پاکستانی سننے والے تو یوں کہئے کہ بس فدا ہیں اس پر!

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

● آپ کی آواز کا تمام تر جادو اور اس کا حسن ہمارے سننے والوں تک پہونچ رہا ہے اب میں چاہوں گا کہ آپ کی اجازت کے ساتھ آپ سے کچھ سوالات اور کروں۔ کبھی کبھی آپ فلم دیکھتی ہوں یا ریڈیو سنتی ہوں کیا ان دونوں کے لئے آپ کے پاس وقت نکل آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمارے فلمی اداکاروں کے بارے میں کچھ کہیے۔

میں فلم بہت کم دیکھتی ہوں پر جیسے ہمارے دلیپ کمار جی ہیں وہ میرے پسندیدہ کلاکار ہیں۔

www.taemeernews.com

اشوک کمار اور موتی لال جی کا کام مجھ بہت زیادہ پسند تھا مینا کماری جی میری بہت ہی پسندیدہ کلاکار تھیں اور آج کل مجھے جیہ بھادری بہت پسند ہیں۔

● نیا ہیرو کون سا پسند ہے آپ کو۔

مجھے دھرمیندر کا کام اچھا لگتا ہے وہ آج کے ہیرو ہیں۔

● لتا جی نورجہاں جو پاکستان کی مشہور مغنیہ ہیں ان کے ساتھ آپ کے تعلقات آپ کی دوستی بہت مشہور رہی ہے ان کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

● جی نور جہاں جی مجھے پہلی مرتبہ کولہاپور میں ملی تھیں جب میں پندرہ سال کی تھی۔ میں جس کمپنی میں کام کرتی تھی وہاں ایک ہندی پکچر ایک پروڈیوسر بنا رہے تھے جس میں نور جہاں جی ہیروئن تھیں اور میں ایک چھوٹی سی لڑکی کا رول کر رہی تھی۔ جب میں پہلی بار ان سے اسٹوڈیو میں ملنے گئی تو ان کے گانے کو بے حد پسند کرنے کی بنا پر میں ایکدم چپ ہو کے وہاں بیٹھی رہی جو ہمارے پروڈیوسر تھے انہوں نے آ کے کہا کہ نور جہاں جی یہ لتا ہے۔ اور بہت اچھا گاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بھئی سنیں گے تو میں نے ان کا ایک کلاسیکی گیت جے جے ونتی راگ میں سنایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ محنت کرو اور محنت کرو گی تو تم بھی میری طرح سنگر بن جاؤ گی۔ میں نے ان کی یہی بات یاد رکھی۔ میں اس کے بعد تو ان سے مل نہیں سکی۔ ایک مرتبہ میرے خیال سے ۱۹۵۲ء میں ان کو ملنے کے لئے واگھا باڈر گئی تھی اور وہاں ہم لوگ شاید ایک گھنٹہ مل سکے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کی ملاقات نہیں ہوئی پھر ہم ٹیلیفون وغیرہ پر باتیں کرتے تھے۔ وہ مجھے خط بھی لکھتی تھیں اور ہمیشہ ہی بہت پیار کرتی رہی ہیں ان کے گانے سن سن کے یعنی گانے کے بول گا گا کر یہ سب میں نے سیکھا ہے اور میں ان کا گانا بہت پسند کرتی ہوں۔ ان کے پاکستان جانے کے بعد تو میں نے ان کے زیادہ گانے نہیں سنے۔ دوپٹہ اور انتظار پکچر میں ان کے گانے بہت اچھے لگے۔ جب وہ ہندستان میں تھیں تو نہ معلوم کون سی وہ پکچر تھی۔ مجھے یاد ہے نہیں 'گاؤں کی گوری' شاید اس میں ان کے دو چار گانے تھے جو مجھے پسند تھے۔

● لتا جی پاکستان کے ایک اور گلوکار ہیں مہدی حسن ان کے بارے میں یہ جملہ آپ سے منسوب کیا جاتا ہے کہ آپ ان کو بہت پسند کرتی ہیں۔ اور آپ نے کہا کہ ان کے گلے میں بھگوان بولتے ہیں ان کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔

ان کی تعریف کے لئے تو میرے پاس شبد نہیں ہیں وہ بہت بڑے کلاکار ہیں۔ میری صبح

www.taemeernews.com

ان کی آواز سے ہوتی ہے اور رات بھی۔ میں صبح اٹھ کر ان کا گانا سنتی ہوں۔ مجھے ان کا گانا بے حد پسند ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ غزلوں میں اتنی بڑی کرانتی اور کسی نے نہیں کی ہے۔ غزل میں انہوں نے اپنا ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے اور وہ جس انداز سے غزل گاتے ہیں۔ میرا خیال ہے اور کوئی نہیں گا سکتا۔ یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ میرے گانے کی تعریف کرتے ہیں میں تو اپنے آپ کو سنگر سمجھتی ہی نہیں ہوں کیونکہ ہم تو فلموں میں گاتے ہیں۔ اور فلمی گانے وہی ہوتے ہیں جو میوزک ڈائریکٹر بناتے ہیں وہ بنا دیتے ہیں اور ہم گا دیتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی یوگ دان نہیں ہوتا۔ مہدی حسن میرے حساب سے بہت ہی اونچے کلاکار ہیں۔

● آپ نے مہدی حسن کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تو اس کو دیکھتے ہوئے میں یہ چاہوں گا کہ آپ کو ان کی گائی کوئی ایک غزل جو آپ کو بہت پسند ہے وہ گنگنا دیجئے۔

میں اس طرح تو نہیں گا سکتی کوشش کرتی ہوں

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

● اخیر میں میں بہت ہی ذاتی سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں لتا جی اگر آپ ناراض نہ ہوں تو وہ یہ ہے کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ ابھی تک (ہنسی)

شادی تو میں سمجھتی ہوں کہ جنم، شادی اور موت یہ تین چیزیں جو ہیں یہ سنجوگ سے ہوتی ہیں۔ اس کو آدمی سوچ کر نہیں کر سکتا۔

● آخر میں آپ کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے میرا خیال ہے کہ ہمارے سامعین اس بات کے انتظار میں ہوں گے کہ آپ اس انٹرویو کو اپنی مترنم آواز میں ختم کریں۔

آپ دو سال پہلے بمبئی آئے تھے یہ انٹرویو چاہا تھا اس وقت میں بہت مصروف تھی اور آپ کو میں ٹائم نہیں دے سکی تھی۔ پر آج آپ کے ساتھ بیٹھ کر جو آپ نے میرا انٹرویو لیا ہے اس میں مجھے بہت ہی مزہ آیا اور مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ میں آپ کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور ہمارے سب سننے والوں کو بھی اور اب وداع ہونے سے پہلے میں ایک چھوٹا سا گیت سناتی ہوں۔

ایک پیار کا نغمہ ہے موجوں کی روانی ہے

●●

www.taemeernews.com

۹۰ ویں سالگرہ پر مناڈے کو پھالکے ایوارڈ

● ہندستانی فلمی سنگیت کے سنہری دور کی یادگار گلوکار مناڈے نوے برس کے ہو گئے انہیں ۲۰۰۷ء کا ہندستانی سنیما کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا مناڈے ۳۵۰۰ سے زائد گانے مختلف فلموں کے مرد کرداروں کے لئے پس پردہ گا چکے ہیں کہا جاتا ہے کہ سب سے مشکل گانے اگر کسی گلوکار نے گائے ہیں تو وہ مناڈے ہیں مناڈے کے گائے سدا بہار گانوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو آج بھی فلم سنگیت کے شیدائیوں کے حافظے میں محفوظ ہیں تو پیار کا ساگر ہے، آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم، کون آیا۔ مرے من کے دوارے یا پھر ہر طرف اب یہی افسانے ہیں اس نسل کے ہونٹوں پر بھی مچلتے ہیں جوان گیتوں کے گائے جانے کے بعد اس دنیا میں آئی ہے یکم مئی ۱۹۱۹ء کو پیدا ہونے والے مناڈے کی پس پردہ گلوکاری کا عروج کا زمانہ چار دہائیوں تک پھیلا ہوا ہے انہوں نے اپنے ایک عزیز کرشن چندڑے کی گائیکی سے فیضان پایا اور پھر استاد دبیر خاں، استاد امان علی خاں اور استاد عبدالرحمٰن خاں سے کلاسیکی سنگیت کی تعلیم حاصل کی ان کے فلمی کیریر کا آغاز ۱۹۴۳ میں بننے والی فلم تمنا، سے ہوا جس کا گانا جاگو آئی اوشا، پنچھی بولے جاگو خاصا مقبول ہوا تھا ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ایس ڈی برمن کا لکھا اور کمپوز کیا ہوا ایک گانا اوپر گگن وشال فلم مشعل کے لئے گایا تو ان کا نام سنگیت کے ہدایت کاروں کی زبانوں پر آنے لگا ۱۹۵۲ء میں مناڈے نے بنگالی اور مراٹھی فلموں کے لئے بھی گانا گائے ۱۹۵۰ء سے مناڈے اس دہائی کے اہم فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے تھے راج کپور نے اپنی فلموں آوارہ، شری چار سو بیس اور چوری چوری میں کچھ خاص گانے مناڈے کی آواز میں ریکارڈ کئے تھے مناڈے کی آواز اپنی ایک الگ پہچان والی ایس آواز ہے جو ہر طرح کے سروں کو پر تاثیر انداز میں گانے میں مہارت رکھتی ہے دوسری خوبی یہ تھی کہ ان کی آواز کلاسیکل گائیکی کے سروں کو پر تاثیر انداز میں گانے

www.taemeernews.com

میں مہارت رکھتی ہے نیز ان کی آواز کلاسیکل گائکی اور فلم گائیکی دونوں سے اچھی طرح واقف تھی وہ اپنی آواز میں سنگیت کے اس امتزاج کو بڑی خوبی سے نباہتے تھے کشور کمار کے ساتھ شعلے فلم میں گایا دوگانا یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گ اور فلم پڑوسن میں ایک چتر نار آج بھی سنگیت پریمیوں کے دلوں پر نقش ہیں ۱۹۶۷ء میں اپکار میں پران کے لئے ان گایا گانا یاری ہے ایمان میرا اور ۱۹۷۳ء میں زنجیر کے لئے ان کی گلوکاری کو لوگ بھولے نہیں۔

پدم شری، پدم بھوشن جیسے اعزاز اور دس لاکھ روپے کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ پانے والے مناڈے کو پسند کرنے والوں میں ہر طرح کے سنگیت پریمی شامل ہین ان کی آواز کا رسیلا پن اور اس کا پچ ہمیشہ برقرار رہا ہے ان کی گائی قوالی نہ تو کارواں کی تلاش ہے بڑے سے بڑے قوال سے داد لیے بغیر نہ رہ سکی فلم بسنت بہار میں انہوں نے سنگیت ہدایت کار شنکر جے کشن کے بے حد اصرار پر بلکہ خود بھیم سین جوشی کے کہنے پر بھیم سین جوشی کے ساتھ گائیکی کے ایک فلمی مقابلہ کے لئے رضامندی دی تھی اس فلمی مقابلے میں بھارت بھوشن کی جیت ہوئی تھی جس کے لئے پس منظر میں کلاسیکی طرز کا گانا مناڈے نے گایا تھا مگر یہ صرف فلم کی کہانی کا تقاضا تھا مناڈے نے صاف کہا تھا کہ وہ بھیم سین جوشی جیسا گانے کی کلپنا بھی نہیں کر سکتے وہ شنکر جے کشن کے ممنون تھے کہ انہوں نے ان کی آواز کے مختلف شیڈ کو استعمال کیا مناڈے کے گائے مقبول فلمی گانوں کے علاوہ ان کے بے شمار غیر فلمی گانے بھی ہیں جو کافی پسند کئے جاتے ہین ان گانوں میں ساون کی رم جھم میں، یہ آوارہ باتیں یہ کھوئی کھوئی سی باتیں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مناڈے نوے برس کی عمر میں بھی اپنے سارے کام خود کرتے ہین اور جب جی چاہتا ہے وہ سنٹرل کلکتے میں واقع آنند ریسٹورنٹ میں اڈلی ڈوشا کھانے آجاتے ہیں مناڈے نے غزل نہ گانے کا جواز دیتے ہوئے کہا کہ وہ غزل اس لئے نہیں گاتے کیوں کہ ان سے بہتر غزل گانے والے موجود ہیں مناڈے ہر بنگالی کی طرح فٹ بال میچ دیکھنے کے دیوانے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کرکٹ کھیل میں بھی ان کی خاصی دلچسپی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اگر آپ کے پاس مناڈے کے گائے گانوں کے ریکارڈ ہیں تو یقین کیجئے مناڈے کی آواز آپ کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دے گی۔ (ذ۔ج)

www.taemeernews.com

دیوداس (1955)ء

● دلیپ کمار ● سچترا سین ● وجینتی مالا اور موتی لال

www.taemeernews.com

● گلوکار اور ایکٹر سہگل کی یادگار فلم دیوداس خاصی کامیاب فلم تھی لیکن بنگالی ناول نگار سرت چندر چٹر جی کا یہ ناول کچھ اس قدر دلوں کو چھو لینے والا تھا کہ ہر فلم ساز اور ہدایت کار کی یہ خواہش رہی کہ وہ بھی دیوداس، ناول کو اپنے ڈھنگ سے بنائے چنانچہ ناول دیوداس پر بالی وڈ ٹ کے اسٹوڈیو میں تین بار ہندی میں فلم بنائی گئی فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لئے ادبی شہ پارے بجا طور پر فلم کے میڈیم کے لئے پائپ لائن کا کام کرتے رہے ہیں ہندستانی سنیما میں اس کے آغاز سے اب تک کتنے ہی ادبی شہ پاروں کو فلمایا گیا ہے اور وہ ناول یا کہانیاں فلم کے میڈیم میں اتنی ہی مقبولیت سمیٹنے میں کامیاب بھی رہیں جو انہیں پرنٹ میڈیم میں اپنی پہلی اشاعت میں ملی تھی سرت چندر کا ناول دیوداس اگر ایک Craze کی صورت اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی فلم سازوں کو فلم بنانے پر لچاتا رہا تو اسی انداز میں اردو کا ناول امراؤ جان بھی ہر بدلتے زمانے میں فلم کے ساتھ ساتھ تھیٹر کرنے والوں کے لئے پر کشش بنا رہا سو برس پہلے لکھا مرزا رسوا کا یہ ناول تین سے زائد بار مختلف زاویوں اور ایکٹروں کی مدد سے فلم کا روپ دھارتا رہا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ خواہ فلم دیو داس، ہو یا امراؤ جان، ان کے اب تک جتنے بھی ورژن بڑے پردے پر دیکھنے کو ملے ہیں انہیں اداکاروں کے ناموں سے جیسے سہگل کی فلم دیوداس، دلیپ والی دیوداس، اور شارہ رخ والی دیوداس یا پھر راکھی والی امراؤ جان، ایشوریا والی امراؤ جان کی پہچان سے ہی جانا جاتا رہا ہے دیوداس کی کہانی لڑکی اور لڑکے کے بچپن کے میل جول سے شروع ہوتی ہے، ہنستی، بولتی کھلکھلاتی کہانی اپنے آغاز میں بڑی شوخ اور شریر ہے جب یہ دونوں کردار لڑکپن سے جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھتے ہیں تو بچپن کا کچا کچا تعلق محبت کے مضبوط رشتے کی طرح دلوں میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ دیوداس اور پارو ایک دوسرے پر مرنے اور مٹنے لگتے ہیں مگر دیوداس کی پارو کے ساتھ شادی کی تجویز کو ٹھکرا دیا جاتا ہے پارو اپنے سے دگنی عمر کے ایک صاحب اولاد سے بیاہ دی جاتی ہے دیوداس کے لئے پارو کی جدائی ناقابل برداشت بن جاتی ہے وہ شراب پی کر پارو کی جدائی کو برداشت کرنے کی راہ اختیار کرتا ہے شراب بالآخر اس کی عادت بن جاتی ہے۔ دیوداس اپنی ذات کا سارا حسن شراب میں گھول دیتا ہے کلکتے میں جنی بابو اس کی ملاقات ایک نرتکی چندر مکھی سے کراتا ہے مگر دیوداس کا دل چندر مکھی کی محبت اور ناز برداریوں سے بھی ملتفت نہیں ہوتا کہانی اپنے المیے اور ملال کی انتہا کی طرف بڑھتی ہے دیوداس کو پارو بے تحاشہ یاد آتی ہے اس سے ملنے گاؤں کی طرف سفر کرتا ہے مگر مل نہیں پاتا دیوداس اپنی کہانی میں ایک نامردار عاشق کے طور پر بھی ابھرتا ہے اور ایک ایسے کردار کے روپ میں بھی جو اپنی جوانی، خوبصورتی اور شادابی کو شراب پی پی کر ایک ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

فلم کے مرکزی کردار تین ہی ہیں دیوداس (دلیپ کمار) پارو (سچراسین) چندر مکھی (وجینتی مالا) یہ تینوں اداکارائیں اپنے زمانے کے مقبول ترین ہیرو اداکار کے ساتھ جوڑی کے طور پر اداکاری کرنے

www.taemeernews.com

کے مرحلے طے کر رہی تھیں ۱۹۳۵ء میں بنی سہگل والی فلم دیوداس میں بمل رائے نے کیمرہ مین کے طور پر کام کیا تھا مگر فلم دیوداس اور اس کی کہانی بمل رائے کے حافظے سے محو نہ ہو سکی کہیں نہ کہیں بمل رائے کے دماغ میں یہ بات جم کے بیٹھ گئی تھی کہ انہیں ایک روز سرت چندر کے ناول کو اپنے انداز سے فلمانا ہے چنانچہ بیس سال بعد ۱۹۵۵ء میں انہیں اپنے خواب کو سچ کرنے کا موقع ملا بالی وڈ میں کافی کچھ تبدیلیاں تب تک ہو چکی تھیں بمل رائے کی نگاہ دلیپ کمار پر پڑی اس سے بہتر دیوداس کا المیہ کردار کون کر سکتا تھا فلم جب ریلیز ہوئی تو فلم بینوں نے بمسل رائے کی ہدایت کاری، دلیپ کی بے مثال اداکاری سچترا سین اور وجینتی مالا کے اپنے اپنے کرداروں کو بے حد ڈوب کر نبھانے کی پہچان ملی اور بطور رقاصہ ان کی پہچان میں ایک اور سنہری پر لگ گیا بمل رائے اور دلیپ کمار کو بہترین ہدایت کار اور اداکار کا فلم فیر ایوارڈ ملا۔

دیوداس کے مکالمے، گانے، سنگیت، سب ہی ہٹ ہوئے نوجوان بڑے شوق سے دلیپ کمار کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے صبح و شام یہ مکالمہ بولتے رہتے تھے۔ ''کون کم بخت ہے جو برداشت کرنے کے لئے پیتا ہے میں تو پیتا ہوں کہ بس سانس لے سکوں'' بیل گاڑی میں مانک پور جاتے ہوئے بے چین دیوداس کا وہ ڈائیلاگ بھی دلوں کو اداس کر گیا جب دیوداس گاڑی بان سے پوچھتا ہے ''ارے بھائی یہ راستہ کیا کبھی ختم نہیں ہوگا۔'' اس ڈائیلاگ میں دلیپ کمار نے پارو سے ملنے اور اس تک جلد سے جلد پہونچنے کی بے چینی کچھ ایسی اثر آفرینی کے ساتھ سمیٹ دی تھی کہ دیکھنے والے اس پر تڑپ اٹھے۔ ایس ڈی برمن نے ساحر لدھیانوی کے لکھے گیتوں کو لاجواب دھنیں دی تھیں مناڈے اور گیتا دت کا بھجن 'آن ملو آن ملو شام سانورے' طلعت محمود کا متر الاگی رے یہ کیسی ان بجھ آگ ہے، لتا منگیشکر کا جیسے تو قبول کرلے وہ صدا کہاں سے لاؤں، مبارک بیگم کا گایا، وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ ہم بلائیں بے حد مقبول گانے تھے۔

بمل رائے نے دیوداس کے کئی منظروں میں اپنی ہدایت کی گہری چھاپ چھوڑی تھی ایک وہ منظر یاد کیجئے جب پارو اور چندر مکھی ایک ہی راستے پر آتے جاتے ہوئے گزر رہی ہیں وہ ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں مگر ایک دوسرے سے ایک لفظ نہیں بولتیں صرف پس منظر میں موسیقی اس پورے منظر کو معنیٰ پہناتی ہے خاص طور سے اس لئے بھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے رقیب کردار فلم کے صرف اسی سین میں ایک دوسرے کو کراس کرتے ہوئے نظر آتے ہیں حالانکہ اصل کہانی میں ان کا ایک دوسرے سے کبھی سامنا ہوتا ہی نہیں اس طرح کی آرٹسٹک آزادی بمل رائے جیسے بڑے ہدایت کار کو ہی زیب دے سکتی تھی جس نے دیوداس کے علاوہ پرنیتا اور بیراج بہو جیسی فلمیں بھی بنائی تھی جو مقبول بنگالی ادب پارے تھے بمل رائے کے بیٹے جوائے بمل رائے کا تاثر ہے کہ دیوداس کی کامیابی یہ تاثر کرتی ہے کہ ہدایت کار اور اداکار اگر پر خلوص ہو کر اور تن من لگا کر اپنی فنکارانہ خوبیوں اور صلاحیتوں کا استعمال کریں تو دیوداس جیسی فلم وجود میں آتی ہے۔ (ذ۔ج۔)

www.taemeernews.com

رفتگاں

● اس سہ ماہی میں اردو دنیا نقاد محمود ہاشمی طنز و مزاح والے یوسف ناظم، صحافی اور ناول نگار جمنا داس اختر، شیمہ رضوی منوہر راج سکینہ، گنیش بہاری طرز، شاعر خالد یوسف (آکسفورڈ) حفیظ جوہر اور صابر آروی ہندی شاعرہ اندوجین اور اداکارہ لیلا نائیڈو ہم سے محروم ہوگئی ان کے علاوہ گنگو بائی ہنگل اور پینٹر طیب مہتہ بھی ہمارے درمیاں نہیں رہے محمود ہاشمی نے کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ ان کے نام کو حافظوں میں محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے ان کی تنقیدی مضامین کی کتاب 'انبوہ زواں پرستاں' کا تعارف کراتے ہوئے ان کا غالب پر لکھا مضمون بازخوانی کے خیال سے ذہن جدید کے ایک حالیہ شمارے میں نقل کیا جاچکا ہے محمود ہاشمی بے حد ذہین اور وسیع مطالعہ ادیب تھے ہمارا ان کا پچاس برسوں کا ساتھ تھا ہم پیالہ اور ہم نوالہ محمود ہاشمی یاروں کے یار تھے اپنے احباب کے دکھ درد کے بارے میں خود کو باخبر رکھنے والے محمود ہاشمی نے کیسی کیسی دستگیری کی یہ بتانے اور اس کے پرخلوص سلوک کا بھری محفل میں اعتراف کرنے والے دوست یہ دنیا چھوڑ گئے جو دس پانچ ابھی زندہ ہیں وہ لب بستگی کے اسیر ہیں ان کے ادبی قد بھی بڑے ہیں اور سائے بھی یوسف ناظم نے بڑا بھرپور طنز و مزاح لکھا ان کی تحریریں دو درجن سے زائد کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں بے شمار اخباروں میں طنزیہ کالم لکھنے والے یوسف ناظم ہنسنے ہنسانے والے شوخ اور چلبلے ظریف تھے جو اپنی موجودگی سے ہر محفل کو زندہ دل بنا دیتے تھے ان کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ آخر دم تک قلم تھامے رہے جمنا داس اختر کی صحافتی زندگی لاہور کے اخبار بندے ماترم سے ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی وہ ان گنت اردو اخباروں سے وابستہ رہے اپنا اخبار سویرا نکالا اور آخر دم تک صحافتی سرگرمیوں میں خود کو مصروف رکھتے رہے انہوں نے کئی ناول بھی لکھے اور شاعری بھی کی تقسیم وطن کے بعد دلی کے حصے میں آنے والے ممتاز اردو صحافیوں میں جمنا داس اختر ایک مکمل صحافی تھے ان کے انتقال سے دلی اپنا وہ آخری تابناک ہیرا بھی کھو چکی جو تقسیم کے نتیجے میں اس کی صحافتی پیشانی کو جگمگا رہا تھا اندوجین ہندی کی ایک اہم شاعرہ تھیں ان کی شاعری ہمیشہ زندگی کو دربغل لے کر چلنے میں سرخوشی محسوس کرتی تھی کبھی زندگی کے ساتھ ان کی یہ گھنی اور سایہ دار رفاقت اکیلے پن کو اپنا لیتی اور خلاء اور سکوت کے درمیان اپنے لئے اسپیس بنانے کی کوشش میں لگ جاتی ان کا آخری شعری مجموعہ ہوا کی محتاج کیوں رہوں، تھا اداکارہ لیلا نائیڈو نے ہیری کیش مکرجی کی فلم نورادھا میں کام کرتے ہوئے اپنے فلمی کیریر کا آغاز کیا تھا شہرت انہیں فلم یہ راستے ہی پیار کے، سے ملی جس میں ان کے ہیرو سنیل دت تھے اگلے شمارے میں محمود ہاشمی پر ہم گوشتہ ترتیب دیں گے ہمیں مذکورہ ادیبوں اور فنکاروں کے بچھڑنے کا ملال ہے اسی شمارے میں گائیکہ گنگو بائی ہنگل اور پینٹر طیب مہتہ پر الگ الگ تحریریں شامل ہیں۔

● مرتب

www.taemeernews.com

اس سہ ماہی کی منتخب نئی کتابیں

● شام تنہائی	(شاعری)	زاہدہ زیدی	200روپے
● اگنی پریکشا	(افسانے)	نعیم کوثر	150روپے
● کوئی کہانی سناؤ متاشا	(ناول)	صادقہ نواب سحر	175روپے
● ہلکی، ٹھنڈی تازہ ہوا	(شاعری)	ظفر گورکھپوری	150روپے
● قسم ہے کفارے کی	(شاعری)	سلیم شہزاد (پاکستان)	200روپے
● فراق کی جمالیات	(تنقید)	شکیل الرحمٰن	200روپے
● اختر الایمان	(تنقید)	شکیل الرحمٰن	300روپے
● گنجفہ	(افسانے)	نیر مسعود	120روپے
● خواب ہوا اور خوشبو	(شاعری)	جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)	300روپے
● آشیاں گم کردہ	(شاعری)	اشفاق حسین (کناڈا)	100روپے
● جہاد	(ناول)	یعقوب یاور	250روپے
● موج صد رنگ	(شاعری)	علی ظہیر	150روپے
● بابر کی اولاد	(ڈرامہ)	سلمان خورشید	
● کلیات عوض سعید	(افسانے ڈرامے)	اوصاف سعید	500روپے
● کلیات عوض سعید	(مضامین اور خاکے)	اوصاف سعید	200روپے
● سعادت حسن منٹو	(لکچر)	شکیل الرحمٰن	100روپے
● قلم فردوس	(نظم)	خاور نقیب	150روپے
● نغمہ	(شاعری)	نثار جے راج پوری	120روپے
● خیال موسم	(شاعری)	جاوید ندیم	150روپے
● دنوں کے پھیر	(افسانے)	وسیم احمد صدیقی	175روپے
● فکر شب کی ضیا	(شاعری)	ضیا کرناٹکی	250روپے
● میرے ڈرامے لندن میں		شمس الدین آغا	400روپے
● یادوں کے دریچے	(سفرنامہ)	ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش	350روپے

● ان کتابوں کے لئے اپنے شہر کے کتب فروش سے رابطہ قائم کریں

www.taemeernews.com

رد عمل

● ہم نے سوچا ہے کہ ذہن جدید کے اگلے شماروں پر ذہن جدید کے قارئین کے رد عمل مذاکرے کی صورت میں شائع کریں اس مقصد کے لئے ہم ہر بار کسی ایسے ادبی مرکز کا انتخاب کریں گے جہاں ذہن جدید کے قارئین کی قابل ذکر تعداد موجود ہو اس شمارے سے اس خیال کو عملی شکل دیتے ہوئے ہم مونگیر میں شمارہ ۵۳ پر منعقدہ مذاکرہ شریک اشاعت کررہے ہیں۔ اس کی رپورٹ ہماری درخواست پر ممتاز افسانہ نگار اقبال حسین آزاد نے ترتیب دی ہے۔ ●مرتب

● ذہن جدید فورم (مونگیر شاخ) کی ایک اہم نشست مورخہ ۱۹/اگست ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر اقبال حسن آزاد کی میزبانی میں منعقد ہوئی جس میں ذہن جدید ۵۳ پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس نشست میں ذہن جدید کے جن قارئین نے شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

☆ ڈاکٹر اقبال حسن آزاد (ریڈر وصدر شعبۂ اردو، جے، آر ایس کالج، جمالپور) ☆ ڈاکٹر آفتاب احمد (ریڈر شعبۂ اردو، بی، آر مہیلا کالج، مونگیر) ☆ جناب راشد طراز (ریڈر وصدر شعبۂ اردو، آر اینڈ ڈی، جے، کالج مونگیر) ☆ ڈاکٹر شبیر حسن (ریڈر شعبۂ نباتات، آر، ڈی اینڈ ڈی جے کالج، مونگیر) ☆ ڈاکٹر اے ایم او، ہوجر (ریڈر شعبۂ حیوانات، آر ڈی، اینڈ ڈی جے کالج، مونگیر) ☆ جناب طارق متین ☆ ماسٹر ابو محمد ☆ جناب پرویز اقبال اور ☆ ڈاکٹر محمد حسین۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اقبال حسن آزاد نے کہا کہ ذہن جدید کا شمار آج اردو کے اہم ترین رسالوں میں ہوتا ہے جو گذشتہ کئی برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہوتا آرہا ہے۔ اس نے ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ یہ صرف ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ایک ادبی دستاویز ہے جسے محفوظ رکھا جانا چاہئے۔ اب تک اس کے ۵۳ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ آج ہم لوگ یہاں اس کے تازہ شمارے پر اپنے خیالات کے اظہار کے لئے یکجا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے سب سے پہلے آفتاب احمد سے گذارش کی کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ آفتاب احمد نے کہا کہ وفاتیہ کا تصور اس سے پہلے اردو میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اپنے وفاتیہ میں جناب زبیر رضوی نے ادبی پینترے بازی کو بڑی خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے

www.taemeernews.com

انہوں نے آگے کہا کہ اقبال مجید بے شک ایک بڑے فنکار ہیں۔ ان کا افسانہ 'دیوار پر جڑی تختیاں' اور ان کا وفاتیہ دونوں موضوع کے اعتبار سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کا افسانہ آج کے ناکارہ سسٹم پر ہے۔ آج کل شاعر اور ادیب سستی شہرت کے پیچھے زیادہ بھاگتے ہیں اور اپنے فن پر کم دھیان دیتے ہیں۔ سکندر احمد نے اپنے مضمون میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں اختلافات کی راہیں کھلی ہوئی ہیں جب کہ صدیق عالم کے فسانوی مجموعے پر ظہیر انور کا مضمون بہت کامیاب ہے۔ رتن سنگھ کا افسانہ مایوس کن ہے۔ شوکت حیات کا افسانہ بہت معیاری نہیں۔ حبیب تنویر پر گوشہ خوب ہے۔ شعری حصے میں شہپر رسول اور راشد طراز کی غزلیں پسند آئیں۔ بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے نئی نسل کے اہم ترین شاعر جناب طارق متین نے کہا زبیر رضوی ہمیشہ ایک نئی جستجو، ایک نئی تلاش میں رہتے ہیں۔ تخلیقات کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا جواب فوراً دیتے ہیں۔ اپنے وفاتیہ میں جناب زبیر رضوی نے ادبی مافیا کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذہن جدید میں غزل کو ہمیشہ سکنڈری حیثیت دی جاتی ہے جب کہ غزل اس سے بہتر سلوک کی مستحق ہے۔ تازہ شمارے میں ابراہیم اشک اور راشد طراز کی غزلیں پسند آئیں۔ زبیر رضوی نظموں پر خاص توجہ دیتے ہیں او رہمیشہ عمدہ اور کامیاب نظمیں شائع کرتے ہیں۔ حبیب تنویر پر گوشہ دے کر انہوں نے ایک بڑے ڈراما نگار کا حق ادا کر دیا۔

اس کے بعد اقبال حسن آزاد نے تازہ شمارے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس میں کل ملا کر سات افسانے شائع ہوئے ہیں جن میں دو پرانے اور پانچ نئے افسانے شامل ہیں۔ اقبال مجید کا افسانہ 'دیوار پر جڑی تختیاں' اپنے موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے بہت خوب ہے مگر کہیں کہیں پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مقصد فن پر حاوی ہو گیا ہے۔ پھر بھی یہ شمارے کا سب سے عمدہ افسانہ ہے اور بجا طور پر پہلے نمبر پر شائع ہونے کا حقدار ہے۔ شوکت حیات ہمارے اہم ترین لکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے افسانے ایک خاص ذائقہ کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر ان کے تازہ افسانے کا ذائقہ کچھ اچھا نہیں۔ افسانہ مبہم ہے اور ماں بیٹے کے ناجائز رشتے پر مبنی ہے۔ شوکت حیات اس قسم کے موضوعات نہ ہی اٹھائیں تو اچھا ہے۔ فیاض احمد وجیہہ نئے لکھنے والوں میں تیزی سے اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔ ان کا افسانہ ''بھوت'' ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے تو اچھا ہے مگر موضوع بہت پرانا بلکہ فرسودہ ہے۔ امید کہ آئندہ وہ تازہ اور اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھائیں گے۔ انیس النبی کا افسانہ اس لائق نہیں کہ ذہن جدید جیسے اعلیٰ معیار کے رسالے میں شائع ہو۔ علامتی افسانوں کے دل لد چکے ہیں۔ مدن مراری لال کا افسانہ 'کبوتر بازی' پڑھ کر بے ساختہ پریم چند کی یاد آجاتی ہے۔ وہی سادگی وہی روانی اور ویسا ہی دردمندانہ اظہار۔ یہ افسانہ بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے۔ مدیر محترم نے اس افسانے کے ساتھ رضوان الحق کا افسانہ اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے کہ دونوں افسانے اپنی اپنی جگہ پر مکمل

www.taemeernews.com

ہیں۔ انہیں الگ الگ بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ایک ساتھ بھی کہ دونوں میں بے زبان جانوروں کے ساتھ انسانوں کے ذریعہ غیر انسانی سلوک کی تصویر پیش کی گئی ہے مگر مدن مراری لال کے افسانے کے ساتھ رضوان الحق کا افسانہ ایسا لگتا ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ مدن مراری لال کے افسانے میں کبوتروں کے پر کترے جاتے ہیں۔ انہیں باندھ کر رکھا جاتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ان سے بے پناہ محبت بھی کی جاتی ہے اور ان کے گم ہو جانے پر پورا گھر سوگوار ہو جاتا ہے جب کہ رضوان الحق کے فسانے میں کتوں پر یکطرفہ ظلم ہوتے دکھایا جاتا ہے۔ مدن مراری لال کا فسانہ اپنی شگفتہ بیانی کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ میں ایک سرور کی کیفیت پیدا کرتا ہے جب رضوان الحق کا افسانہ گھناؤنا اور فحش ہونے کی وجہ سے طبیعت میں تکدر پیدا کرتا ہے۔ اور پھر صحافتی انداز میں لکھے جانے کی وجہ سے یہ صنف افسانہ سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ عنوانات قائم کر کے صحافیانہ انداز میں لکھے گئے افسانے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ رتن سنگھ کا افسانہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ آج سے پچاس سال قبل انہوں نے جس روشن خیالی کا ثبوت دیا تھا وہ قابل قدر ہے۔

اقبال حسن آزاد نے آگے کہا کہ اقبال مجید، رتن سنگھ اور زبیر رضوی کے وفاتیے، اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تینوں وفاتیے اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ ایک قدر مشترک جو ان وفاتیوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سبھوں میں احساس محرومی اپنی پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ بہت کچھ کھونے کا غم اور بہت کچھ نہ پانے کا افسوس۔ بہر کیف! یہ ایک اچھی ابتدا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ جلد ہی یہ صنف اردو ادب میں فروغ پا جائے گی۔ صدیق عالم کے افسانوی مجموعے 'لیمپ جلانے والے' پر جناب ظہیر انور کا مضمون عمدہ ہے اور اس سے صدیق عالم کے افسانوں کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ جو ہم سفر تھے کبھی۔ کے تحت جناب جاوید صدیقی نے اپنی یادوں کے نگار خانے سے ایک دلچسپ تحریر پیش کی ہے۔ یہ عنوان بھی ذہن جدید کے اہم عنوانات میں سے ایک ہے جس کے ذریعہ اکثر و بیشتر ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ حبیب تنویر پر گوشہ اچھا ہے مگر تشنہ ہے۔ محبوب خاں کی یادگار فلم انداز کا مختصر جائزہ لطف دے گیا۔

اقبال حسن آزاد کے بعد جناب راشد طراز نے کہا کہ جناب زبیر رضوی کا ذہن اختراعی ہے۔ شب خون کے بند ہو جانے کے بعد اب ذہن جدید ہی اردو کا سب سے عمدہ رسالہ رہ گیا ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے بعد جناب زبیر رضوی اردو دنیا کے سب سے اہم مدیر ہیں۔ ذہن جدید کے تازہ شمارے پر اپنی رائے دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حسب معمول اداریہ بہت خوب ہے۔ اس میں مدیر نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ غیر اہم شاعروں اور ادیبوں کو انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے جبکہ جینیون فنکاروں کی ناقدری کی جاتی ہے۔ اقبال مجید کا افسانہ اپنے کرافٹ کے اعتبار سے بے حد شاندار

www.taemeernews.com

CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE

LIST OF PUBLICATION

S.No.	Name of Publication	Price (Rs)	S. No.	Name of Publication	Price (Rs)
1.	C/R English	30/-	44	K. Al-Hawi – XIII	165/-
2.	C/R Urdu	30/-	45.	K. Al-Hawi – XIV	160/-
3.	C/R Hindi	36/-	46.	K. Al-Hawi – XV	-
4.	C/R Telugu	23/-	47	K. Al-Hawi XVI	-
5.	C/R Tamil	55/-	48	Risala-e-Judia	109/-
6.	C/R Arabic	44/-	49.	Uyoon-al-Anba I	131/-
7.	C/R Gujrati	44/-	50.	Uyoon-al-Anba II	143/-
8.	C/R Kannada	34/-	51.	K. Mukhtarat -I (Urdu)	275/-
9.	C/R Oriya	34/-	52.	K. Mukhtarat -II (Urdu)	385/-
10.	C/R Bengali	19/-	53	K. Mukhtarat III (Urdu)	320/-
11.	C/R Punjabi	16/-	54	K. Mukhtarat -IV (Urdu)	385/-
12.	C/R Persian	125/-	55.	K. Taklees (Urdu)	142/-
13.	Aljamili Maf. Vol – I	71/-	56	Sanat-al-Taklees (pb)	198/-
14.	Aljamili Maf. Vol – II	208/-	57	Sanat-al-Taklees (hb)	228/-
15.	Aljamili Maf. Vol – III	275/-	58	NFUM-I Urdu	175/-
16.	Aljamili Maf. Vol – IV	350/-	59	K. Al-Fakhir (Arabic) I/1	272/-
17.	Amraz-e-Qalb	205/-	60.	K. Al-Fakhir (Arabic) I/2	500/-
18.	Amraz-e-Ria	150/-	61	Physico chemical - I	43/-
19.	A. Sarguzisht (Urdu)	7/-	62.	Physico chemical II	50/-
20.	A. Sarguzisht (Hindi)	40/-	63.	Physico chemical III	107/-
21.	M. Bugratia – I	360/-	64.	Physico chemical - IV	225/-
22.	M. Bugratia - II	270/-	65	Stds. Of Single Drgs – I	86/-
23.	M. Bugratia – III	240/-	66	Stds. Of Single Drgs - II	129/-
24.	K. Umda – I	57/-	67	Stds. Of Single Drgs – III	188/-
25.	K. Umda – II	93/-	68	Stds. Of Single Drgs – IV	255/-
26.	K. Kulyat (Urdu)	71/-	69	Stds. Of Single Drgs – V	280/-
27.	K. Kulyat (Arabic)	107/-	70.	Chemistry of Medical Pts	340/-
28.	K. Mansoori	169/-	71	Birth Control	131/-
29.	K. Abdal (Urdu)	109/-	72.	Med Pts of Tamil Nadu	143/-
30.	K. Abdal (English)	100/-	73.	Med Pts of A.P	164/-
31.	K. Taiseer	50/-	74	Med Pts of Gwalior	195/-
32.	K. Al-Hawi – I	195/-	75	Med Pts of Aligarh	90/-
33.	K. Al-Hawi – II	190/-	76.	Anti Malarial Hrb Drgs	90/-
34.	K. Al-Hawi – III	180/-	77	Hkm. Ajmal Khan	185/-
35.	K. Al-Hawi – IV	143/-	78.	Unani Pharmacopoeia I/I	230/-
36.	K. Al-Hawi – V	151/-	79	Unani Pharmacopoeia I/II	230/-
37.	K. Al-Hawi – VI	182/-	80.	Unani Pharmacopoeia I/III	288/-
38.	K. Al-Hawi – VII	197/-	81.	Unani Pharmacopoeia I/IV	230/-
39.	K. Al-Hawi – VIII	151/-	82	Unani Pharmacopoeia I/V	230/-
40.	K. Al-Hawi – IX	153/-	83.	NFUM (ENGLISH) - I	237/-
41.	K. Al-Hawi – X	230/-	84.	NFUM (ENGLISH) - II	230/-
42.	K. Al-Hawi – XI	195/-	85	NFUM (ENGLISH) - III	200/-
43.	K. Al-Hawi – XII	138/-	86	NFUM (ENGLISH) - IV	200/-

To have the books by post, Bank Draft covering the cost of the books ordered issued in the name of Director, CCRUM, New Delhi and payable at New Delhi, be sent in advance. If the order is less than Rs. 100/- postal charges will be borne by the buyer. The books can be had from: *Central Council for Research in Unani Medicine, 61-65, Institutional Area, Opp. D-Block, Janakpuri, New Delhi - 110058*
Tel : 285258-31, 52, 62, 83,97, 28525982 Fax 28522965

www.taemeernews.com

ہے۔اس میں جمالیاتی حسن بھی ہے کہ افسانے کا آغاز ہی مقصدیت سے ہوتا ہے کیونکہ اقبال مجید اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مقصد کو اولیت حاصل تھی۔شوکت حیات کا افسانہ 'ذائقہ' ماں بیٹے کے مقدس رشتے پر ضرب لگاتا ہے۔رضوان الحق کا افسانہ 'زوال جسم سے پہلے' پسند آیا لیکن کہیں کہیں پر غیر ضروری طوالت کھلتی ہے۔زبیر رضوی کا وفاتیہ خاص طور پر پسند آیا جس میں ادبی سیاست پر کھل کر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس کے لئے جناب زبیر رضوی خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔حبیب تنویر پر گوشہ بہت خوب ہے۔ذہن جدید کے شعری حصے میں نظموں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔زیر نظر شمارے میں علی ظہیر،فوزیہ فاروقی اور نجمہ رحمانی کی نظمیں اور شہپر رسول اور خورشید طلب کی غزلیں پسند آئیں۔

ڈاکٹر جوہر صاحب کا خیال ہے کہ ایک طویل عرصہ تک 'ذہن جدید' جیسے معیاری رسالے کا شائع ہوتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نہ صرف زندہ ہے بلکہ اعلیٰ ذوق کے قاری بھی موجود ہیں۔ ان کی نظر میں شوکت حیات کا افسانہ قابل مذمت ہے۔

نوجوان افسانہ نگار پرویز اقبال بھی ذہن جدید کے مستقل قاری ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ذہن جدید کا افسانی حصہ ہمیشہ شاندار رہتا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔تازہ شمارے میں اقبال مجید،مدن مراری لال اور رتن سنگھ کے افسانوں نے انہیں خاص طور پر متاثر کیا۔

ذہن جدید کے ایک قدیم قاری ماسٹر ابو محمد کو زبیر رضوی کا وفاتیہ خاص طور پر پسند آیا ہے۔اس میں ادبی عصبیت کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔شوکت حیات کا افسانہ علامتی بن کر رہ گیا ہے جو کسی طور پر متاثر نہ کر سکا۔راشد طراز کی غزل پسند آئی جب کہ سکندر احمد کا مضمون پسند نہیں آیا۔

نوجوان ریسرچ اسکالر ڈاکٹر محمد حسین نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ جس طرح نیاز فتحپوری کا ''نگار''،محمود ایاز کا 'سوغات' اور شمس الرحمان فاروقی کا 'شب خون' اپنے اپنے وقت کے نمائندہ رسالے رہے ہیں ٹھیک اسی طرح جناب زبیر رضوی کا رسالہ 'ذہن جدید' اردو دنیا کا نمائندہ رسالہ ہے۔ جس میں مختلف ذائقے کی تحریریں ایک ساتھ پڑھنے کو ملتی ہیں۔تازہ شمارے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بے شک اقبال مجید کا افسانہ نہایت عمدہ ہے مگر انہوں نے اقبال حسن آزاد کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ اس میں مقصد فن پر حاوی ہو گیا ہے۔البتہ انہوں نے دیگر تمام شرکاء سے اختلاف کرتے ہوئے شوکت حیات کے افسانے کو حاصل شمارہ قرار دیا ہے۔ان کے خیال میں شوکت حیات نے ایک نازک موضوع کو نہایت فنکاری اور حسن وخوبی کے ساتھ افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے جو ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔جب کہ رضوان الحق نے صرف Thought Provoking جملے تراشے ہیں اور افسانے کو بے جا طور پر طویل کر دیا ہے جو اس افسانے کا خاص عیب ہے۔وفاتیہ پڑھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا لیکن یہ غیر متاثر کن رہا۔سکندر احمد نے ذہن جدید کے کئی قیمتی صفحات برباد کر دئے۔ان کا ہر مضمون

www.taemeernews.com

قواعدی ہوتا ہے جس میں وہ علم کا بے جا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مدیر محترم اس قسم کی تحریروں کو شائع کرنے سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔ ظہیر انور کا مضمون تنقیدی کم اور تجزیاتی زیادہ ہے۔ شعری حصے میں خورشید طلب اور راشد طراز کی غزلیں خاص طور پر پسند آئیں۔ موجودہ عہد کے اہم ترین ڈراما نگار حبیب تنویر مرحوم پر گوشہ بہت مختصر ہے جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ذہن جدید کا ایک پورا شمارہ ان پر وقف ہوتا۔ انہوں نے مدیر سے یہ گزارش کی ہے کہ اگر وہ گاہے گاہے بازخواں کے عنوان کے تحت کرشن چندر کا افسانہ ان داتا، احمد علی کا 'ہماری گلی' حسن عسکری کا 'چائے کی پیالی' بیدی کا 'گرم کوٹ' اور غلام عباس کا 'آنندی' شائع فرمائیں تو ہم جیسے قارئین پر احسان ہوگا۔ اس پر جناب اقبال حسن آزاد نے انہیں یاد دلایا کہ آنندی ذہن جدید میں شائع ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

آخری میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھنے والے شاعر، افسانہ نگار اور ناقد جناب شبیر حسن نے فرمایا کہ وہ ذہن جدید کے پرانے قاری رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ذہن جدید ان کا محبوب ادبی رسالہ ہے جسے وہ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس رسالے کی چاہت کا ایک سبب تو یہ ہے یہ مشہور شاعر اور تجربہ کار مدیر جناب زبیر رضوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ یہ ان کے پسندیدہ شاعر مخدوم محی الدین کے نام معنون ہے۔ اس رسالے کے بھرپور اور معیاری مشمولات انہیں ہمیشہ اپنی جانب راغب کرتے رہے ہیں۔ اس میں اکثر 'یاد رفتگاں' کے تحت بڑے ادیبوں کی حیات وخدمات کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے ہیں جس سے اس رسالے کی عظمت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ذہن جدید کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں روایتی پیش کش کے علاوہ دیگر موضوعات جیسے فلم، تھیٹر، رقص اور پینٹنگ وغیرہ پر بھی بے حد اچھے اور مطلوبی مضامین شائع ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عالمی ادب کے منظرنامے پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے یہ امتیازات صرف ذہن جدید ہی کے ساتھ مخصوص ہیں اور یہ کسی دوسرے رسالے میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ یہ گوشہ اردو قاری کے ذہنی افق کو وسعت بخشنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پورا رسالہ ہی ادب کے ساتھ ثقافت اور فنون کو بھی موضوع بناتا ہے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے موصوف نے کہا کہ اس رسالے کی فکری نہج میں روشن خیالی، ترقی پسندی اور سیکولرازم شامل ہیں۔ یہ رسالہ جمہوری قدروں کا علم بردار ہے۔ اس طرح یہ محض ایک رسالہ نہیں ہے بلکہ ایک مشن اور تحریک ہے۔ ذہن جدید اس ملک کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ الفاظ کی آبرو ہے اور فرقہ واریت اور آمریت کی تاریکی میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے غالباً یہی خوبیاں ہیں کہ ذہن جدید کو وزارت خارجہ غیر ملکوں میں اردو کے شائقین کو بطور تحفہ پیش کرتی ہے۔

تازہ شمارے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب شبیر حسن نے کہا کہ رتن سنگھ کا افسانہ اچھا ہے

www.taemeernews.com

جب کہ اقبال مجید کا افسانہ بہت اچھا ہے۔ شوکت حیات کا ذائقہ بھی پسند آیا۔ گرچہ اس میں جنسی تلذذ پایا جاتا ہے۔ اس افسانے کے سلسلے میں دیگر شرکا کے اعتراضات کی روشنی میں وہ اسے دوبارہ پڑھنا پسند کریں گے۔ سکندر احمد کے مضمون کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ اپنی تحریر میں میتھ کو شامل کردیتے ہیں۔ شاید ایسا اس لئے ہے کہ وہ بینک میں ملازم ہیں۔ ظہیر انور کے مضمون کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ صدیق عالم کے افسانوی مجموعے کو بغور پڑھ لینے کے بعد اس پر کسی مضمون کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ شبیر حسن نظموں کے شیدائی ہیں اور ذہن جدید کی نظمیں انہیں خاص طور پر پسند آتی ہیں۔ فراق کی رباعیوں کو وہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ دوبارہ پڑھ کر مزید لطف اندوز ہوئے۔ غزلوں کا حصہ کمزور ہے۔ حبیب تنویر ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان پر گوشہ اچھا مگر تشنہ ہے۔ محبوب خاں کی فلم 'انداز' کا مختصر تعارف اچھا لگا مگر اس میں ایک جگہ راج کپور کی فلم سنگم کا تذکرہ کرتے ہوئے غلطی سے راجندر کمار کی جگہ راجیش کھنہ کا نام درج ہوگیا ہے۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے پر محیط اس کامیاب اور کارآمد مذاکرے کا اختتام میزبان کے شکریے کا ساتھ رات کے دس بجے ہوا۔

ترتیب: ●اقبال حسن آزاد، مونگیر

مونگیر کے معروف افسانہ نگار، قیصر اقبال کلکتے میں ہونے کی بناء پر اس مذاکرے میں شریک نہ ہوسکے تھے ان کا خط الگ سے ملاحظہ لکھتے ہیں:

● ذہن جدید ۱۵۳ اپنے سابقہ شماروں سے جدا اور منفرد انداز میں سامنے آیا ہے۔ اس کے ہمہ جہت پہلوؤں پر بیک قلم اظہار خیال ممکن نہیں ہے آپنے شمارہ اول سے نقشہائے رنگ رنگ کے طور ادب اور فن (دیگر فنون) کے بدلتے تیور کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی تا حال ادب کا پورا تناظر آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ آپ ترقی پسندی کے عروج سے لے کر جدیدیت کے تمام ادوار ادب نام ونہاد مابعد جدیدیت کی پیش رفت کے درمیان کبھی Out Dated نہیں ہوتے۔ حیرت ہے آپ کی ہمہ گیر باخبری اور ادب کی رفتار شناسی پر یہ مبالغہ نہیں ہے کہ ریڈیو کی دنیا نے آپ کو ہر میدان میں ایسا چست درست رکھا کہ پچھلے دروازے سے آنے والا ہر قلم کار یا ادب مافیا کا سرغنہ آپ کو گالیاں دینے پر مجبور ہوا۔ بہر حال یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اسے آپ جیسا چوکس اور سخت گیر مشاہد حاصل ہے اللہ آپ کی عمر دراز کرے تا کہ زوال کے دور میں اردو کی کچھ لاج بچی رہے۔

'الف' کے تحت آپ نے جس صورت حال کو شرمناک اور Intellectueal Conruption سے تعبیر کیا ہے اس سے مفر کی اب کوئی راہ نہیں ہے کیونکہ ایوان اقتدار مین بیٹھے مقتدر حضرات آدمی دیکھ کر باتیں کرتے ہیں اور بقول جسونت سنگھ نہرو اور پٹیل کے قائم کردہ ہندستان میں رسائی ایسے ہی لوگوں کی ہے سیکولرازم محض رسمی باتیں ہیں۔

www.taemeernews.com

اقبال مجید کا افسانہ 'دیوار پر جڑی تختیاں' عالمی مرکزی اور صوبائی سیاست اور اقتدار کی صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ مریم زمانی کی خود کلامی ''میں جانتی ہوں کہ Opinion Mafia کیسے بنتی ہے اور کس طرح کام کرتی ہے''۔ افسانے کے مرکزی خیال تک پہونچا دیتی ہے۔ اقبال مجید کا یہ نیا انداز تحریر قابل ستائش ہے۔ شوکت حیات نے اصل بات کہہ کر رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے یہ انکا فنکارانہ حسن ہے۔ اگر یہ کہوں کہ شعری حدود کی بے اعتدالی اور بیجا چاہت اس مقام پر پہونچاتی ہے تو شاید ہی دقیانوس قرار پاؤں مگر افسانے کی حقیقت یہی ہے۔ مراری لال کی کبوتر بازی کو افسانہ نہ کہہ کر اردو کی عمدہ انشاء پردازی کا وہ نمونہ کہا جائے جس میں رتن ناتھ سرشار، مرزا فرحت اللہ بیگ، اور شوکت تھانوی کی خامہ فرسائیوں کی جھلک نظر آتی ہے 'زوال جسم سے پہلے' ایک ڈرامہ کا مواد ہے جسے زبردستی افسانے کے فریم میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۸۰ کے بعد والوں نے یہ شور مچایا تھا کہ کہانی کی واپسی ہوگی ہے اور قاری سے اس کا رشتہ استوار ہوگیا ہے لیکن فیاض احمد وجیہہ کی بھوت مذموم جدیدیت کی بازفت کی ایک کوشش ہے اور شاعری کے اسلوب میں ایک فرسودہ مسئلے کا بیان آج کا افسانہ نہیں ہوسکتا۔ انیس النبی نے 'آشیانہ' میں گوری چمڑی کی فرعونیت کے نتیجے مین بڑھی ہوئی گھٹن اور فضائی آلودگی کو ایک دلچسپ انداز میں کہانی کی شکل دی ہے۔ اسلوب بھی عمدہ ہے۔

وفا تیے کو شامل اشاعت کر کے ذہن جدید نے اپنا نیا پن برقرار رکھا ہے یہ دلچسپ اور بامعنیٰ ہے۔ واقعات ذہن و دل کے دروازے وا کرتے ہیں سکندر احمد نے قرۃ العینیت بڑی محبت اور تلاش کے بعد لکھا ہے اسے ٹھہر ٹھہر کر سنجیدگی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ صدیق عالم کے افسانوی مجموعہ 'لیمپ جلانے والے'' پر ظہیر انور نے تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'افسانہ نگار نے یہ افسانے کم فہم قارئین کے لئے تحریر نہیں کئے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر ترسیل کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے اور افسانہ نگار کی کاوش ایک دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

بہر حال ظہیر انور نے بڑی محنت سے تجزیہ لکھ کر حق دوستی ادا کیا ہے۔ زبان کی صحت کی جانب کچھ توجہ کی ضرورت ہے۔

نظمیں وہ بھی زبیر رضوی کا انتخاب۔ سب ہی خوب اور فکر انگیز ہیں فوزیہ فاروقی کی نظم کا خصوصی طور پر نوٹس لیا جانا چاہئے غزلوں میں کرشن کمار طور، راشد طراز، اور شان الرحمٰن، بطور خاص متاثر کرتے ہیں۔ جاوید صدیقی کی تحریر 'بڑے پاپا' پڑھ کر آبدیدہ ہوگیا۔ واقعی خلوص اور محبت کسی مذہبی دیوار کو نہیں دیکھتی زعفرانی رنگ والوں نے کچھ ایسا زہر گھولا ہے کہ ساری محبتیں اور رفاقتیں اب یقین سے بالاتر ہونے لگتی ہیں۔ تراشے کے ذریعہ ڈھیر ساری خبروں کا علم ہوا یہ آپ کی ذاتی جستجو اور تلاش کا نتیجہ ہے جو

www.taemeernews.com

اردو والوں کے لئے باعث نعمت ہے۔ محبوب خاں کی فلم انداز پر شامل تحریر پڑھ کر دلکش ماضی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور غور کرنے پر مجھے یہ پتہ چلا کہ اس کو دیکھے ہوئے ۴۵ سال بیت گئے ہیں۔ اس کی تازگی اب بھی باقی ہے۔ اس مشترکہ لطف اندوزی کے لئے شکریہ۔ ● قیصر اقبال، کلکتہ

● ذہن جدید ملا۔ اس بار اس کا غیر ادبی حصہ زیادہ ہے یہی بہتر ہے۔ خالص ادب تو بہت سے رسالے چھاپ رہے ہیں۔ آپ کے رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف فنون کے میدان میں دنیا کہاں جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے ذہن جدید کی منفرد حیثیت ہے۔

سکندر احمد کا مضمون بہت شوق سے پڑھا۔ کاش قرۃ العین بھی اس کو پڑھ سکتیں۔ انہیں اردو والوں سے کچھ شکایتیں تھیں۔ آخر میں انہوں نے آگ کا دریا کو اپنی چڑ بنا لیا تھا۔ کہتی تھیں کہ سب لوگ اسی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں نے اور بھی ناول لکھے ہیں۔ لیکن ان کی اصل شکایت یہ تھی کہ آگ کا دریا کسی نے بہ غور پڑھا ہی نہیں۔ سکندر احمد کے مضمون سے ان کی یہ شکایت ختم یا بہت کم ہو جاتی ہے۔ سکندر احمد خود بھی بہت وسیع المطالعہ ہیں انہوں نے ہند قدیم کی روایتوں کا عالمانہ مطالعہ کیا ہے قرۃ العین نے اس ناول کے لئے کتنا پڑھا ہے اس کا اندازہ سکندر احمد کے مضمون سے ہوتا ہے۔ دوسری شکایت قرۃ العین کو یہ تھی کہ لوگ آگ کا دریا کو شعور کی رو کا ناول کہتے ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ شعور کی رو کے بارے میں کم جانتی ہوں۔ لیکن اردو کے نقاد اتنا بھی نہیں جانتے۔ سکندر احمد نے ناول کے موضوعات کی فہرست بہت محنت سے تیار کر دی ہے۔ امید ہے کہ اس مضمون کی روشنی میں آگ کا دریا مطالعہ کا زیادہ معنی خیز ہو جائے گا۔ ● نیر مسعود۔ لکھنؤ

● ذہن ۵۳ نظر نواز ہوا، اور اس کے مطالعے نے کئی دن تک لطف و سرور کا سامان مہیا کیا۔

اقبال مجید کی جو بات ان کے خود پر لکھے وفاتیئے میں متاثر نہ کر سکی، وہی بات ان کے افسانے 'دیوار پر جڑی تختیاں' میں ایک اچھے فن پارے میں ڈھل گئی تو دل پر نقش ہو گئی۔ کبوتر بازی، اور زوال جسم سے پہلے، آپ کی ندرت انتخاب کے مظہر ہیں اور دل چسپ ہیں، البتہ شوکت حیات کا ذائقہ بدمزہ تھا۔ جاوید صدیقی کا بڑے پاپا، ہندستان کے مشترکہ کلچر اور گنگا جمنی تہذیب کا دل کش مرقع ہے۔

سکندر احمد کا قرۃ العینیت، عینی آپا کے اسلوب و فن پر یکسانیت کے شکار تنقیدی مضامین سے ہٹ کر لکھا گیا ایک عمدہ مضمون ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں جب یہ ناول پڑھا تھا تو چند فقروں میں صدیوں کی جست زمانہ اور کرداروں کے پتر جنم کے سلسلے کو ذہن میں رکھنا میرے لئے دشوار تھا۔ اس لئے میں نے اسے کبھی گوتم نیلمبر / چمپک، ہری شنکر / نرملا، ابوالمنصور / کمال الدین / چمپاوتی، چمپا احمد / سرل ڈیرک ایشلے، جیسے قصوں میں بانٹ کر کے پڑھا، کبھی اس کے ادوار کی تقسیم۔ ۱۔ گپت عہد، ۲۔ جونپور کے حسین شرقی کے عہد سے لے کر بھگتی تحریک، کبیر کے دور سے گزرتے ہوئے دہلی میں مغلیہ حکومت کے قیام تک کا

www.taemeernews.com

عہد۔۳۔ اٹھارہویں صدی کے آخر ۱۷۹۸ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کا عہد۔۴۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء کا عہد۔۵۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۶ء کا عہد۔ یہ ایک دل خوش کن اتفاق ہے کہ میں نے بھی اس کے مضامین و مندرجات کا اپنی ترجیحات کے اعتبار سے اشاریہ بنایا تھا۔ سکندر صاحب کی ۹۸ پر درج کرداروں کی خود کلامی (ان کے الفاظ میں کرداروں کی تکثیریت) کی فہرست میں ہری شنکر کے (آگ کا دریا ۳۰۰) ڈھائی صفحے اور جوڑے جاسکتے ہیں۔ سکندر صاحب کے مقالے میں ۹۹ پر Maturity, Vulnerable, Bizarre جیسے انگریزی الفاظ بلاضرورت ہیں۔ اس لئے کہ ان کے اردو مترادفات بھی درج ہیں۔ اس کے علاوہ ٹریٹ ۹۹، چولیشن ۱۰۷، اور لاؤڈ صفحہ ۱۱۱، وغیرہ جیسے انگریزی الفاظ کے استعمال سے بچا جاسکتا تھا کہ انکے متبادل اردو میں موجود ہیں۔ سکندر صاحب نے ۱۰۱ پر وقت پر عینی آپا کے تصورات رمقولوں کا اچھا انتخاب دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت کی بے زمانیت اور لامکانیت کو ایک جگہ عینی صاحبہ نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

'وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی، وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی، اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا۔ اور اس فاصلے پر انسان صرف آگے کی سمت چل سکتا تھا۔ آگے اور آگے، پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر، ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے ٹوٹے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس نظر آتے ہیں۔ (آگ کا دریا ۳۱۶) مجموعی طور پر ان کے مقالے کا سلجھا ہوا انداز بیان پسند آیا۔ ● اسیم کاویانی، ممبئی

● ذہن جدید میرے ذہن و ذوق کی آبیاری ہمیشہ سے ہی کرتا آیا ہے۔ اس بار صرف ذی علم قارئین کے لئے لکھے گئے مضمون قرۃ العینیت، کو اپنی کم علمی کے باوجود غائر دلچسپی سے پڑھا میں جناب سکندر احمد سے پوری طرح متفق ہوں کہ ابن صفی کے کردار تھیریسا بمبل بی، کی طرح آگ کا دریا، کے خدو خال دیکھ لینے والی نگاہ ابھی تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے کہ اس ناول کی مبہوت کر دینے والی گہرائی اور گیرائی اپنی مثال آپ ہے — 'بڑے پاپا' کی مقدس یادوں سے بھرا مضمون دل کو اندر تک چھو گیا۔ بے ساختہ اپنا ہی کہا ہوا مصرعہ زبان پر آ گیا۔ ہائے اگلے وہ وفا کیش و جنوں پیشہ لوگ! — کبوتر بازی گا ہے گا ہے باز خواں..... کے سلسلے کی ایک بہت اچھی کڑی ہے۔

حبیب تنویر صاحب والا گوشہ ذرا چھوٹا لگا۔ یقینی طور پر وہ اس سے زیادہ جگہ پانے کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ اردو تھیٹر کا ایک دور ختم ہو گیا! — نجمہ رحمانی کی اداس کر دینے والی نظمیں اچھی لگیں۔ ساجدہ زیدی صاحبہ تو خیر ساجدہ زیدی ہی ہیں! شاہد میر خورشید طلب اور سردار آصف صاحبان کے کئی شعر اچھے لگے۔ اور ہاں! — وفا یئے آپ چھوڑ یئے بھی۔ جناب رتن سنگھ جی اقبال مجید، اور آپ زبیر رضوی!۔ مرنے والے لوگ کوئی اور ہوتے ہیں آپ لوگ بالکل نہیں! میں تو اپنا وفاتیہ ہرگز نہیں لکھوں گی۔ جو جیئے

www.taemeernews.com

ہی نہیں وہ کیا خاک مریں گے!۔ ● بلقیس ظفیر الحسن، روہنی دہلی،

● تازہ ذہن جدید کے آخری حصہ یعنی فراق کی رباعیاں پڑھتے پڑھتے لال قلعہ کے ایک مشاعرے کی یاد آ گئی، لوگ ہنگامہ کر رہے تھے جب کافی دیر تک شور ہوتا رہا تو سردار جعفری نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ یہ نہ بھولیں کہ میں آپ کے ذوق کی تربیت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تو پیارے بزرگ بھائی آپ یہ کہتے نہیں بلکہ مسلسل ذوق کی تربیت کئے جا رہے ہیں۔ ایک تو رباعی کو بھلا سا دیا گیا، دوسرے ان حضرات کو اب بہت کم لوگ پڑھتے ہیں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ایسی تحریریں آپ پہلے بھی دیتے رہے ہیں جن سے نئے لکھنے والے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں پھر اچھا ادب دستیاب نہ ہو تو پرانی تحریروں سے رجوع کرنا ہی سب سے مقدم لگتا ہے جاوید صدیقی کی تحریر پر مبارک بار خود وفاتیہ بھی کچھ ایسی قسم کی تحریریں ہیں مجھے آپ کی تحریر شاید اسلئے زیادہ اچھی لگی کہ اس میں کچھ باتیں ایسی آ گئی ہیں جو سوال کی صورت کافی عرصے سے جواب کی منتظر تھیں۔ اور وہ وہی باتیں تھیں جن کا تعلق ادب سے اتر کر ذاتیات تک آ گیا تھا۔ اس شمارے میں ساری ہی چیزیں اتنی معیاری اور عمدہ آ گئی ہیں کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس کے سلوگن ذہن جدید آپ کے عہد کی اہم دستاویز ہے۔ اسے سنبھال کر رکھئے، پر خاص کر اس بار ایمان لانے کو جی چاہتا ہے کہانیاں، نظمیں، غزلیں، فنون لطیفہ کا حصہ تو خیر اس کا ہمیشہ ہی مثالی ہوتا ہے۔ سرورق پر ہمیشہ ہی ایسی تصویر رہے تو اچھا اس بار چھپائی (سرورق کی) بہت عمدہ اور رنگوں کا انتخاب بہت خوبصورت ہے۔ ہاں اندرونی صفحات کی چھپائی اس بار خاصی ناقص ہے ابھی تو ٹھیک سے برسات بھی نہیں ہے اور لفظ جگہ جگہ سے ادھڑ گئے ہیں ایک برسات گزرنے کے بعد ان صفحوں پر کچھ لکھا رہ جائے گا یا نہیں۔ معلوم نہیں۔ ● مرغوب علی، نجیب آباد

● مہدی جعفر نے آپ کے نظمیہ کردار 'علی بن متقی' کو آپ کے حوالے سے اپنی غزل کا مصرعہ بنایا ہے۔ جس کا اعلان ان کی صاف گوئی پر دلالت کرتا ہے۔ مگر ان کو راجندر منچندہ کا خیال بھی آنا چاہئے ۔ اس نے کہا تھا۔

علی بن متقی رویا / وہی چپ تھا وہی رویا / سحر دم کون روتا ہے / علی بن متقی رویا

مسعود اشعر کا افسانہ چھتری متاثر نہ کر سکا۔ افسانہ بلی کی اٹھان اچھی ہے۔ باقی حصہ زندگی کی صداقت سے زیادہ قریب نہیں۔ سماج کو جس اعلیٰ قدر اور نفیس جذبے کی ترجمانی ہے وہ صرف ایک خیال بھر ہے۔ البتہ ایسے قصے بزرگوں سے وابستہ ملتے ہیں۔ افسانہ 'پژمردہ پودے' مجیر احمد، سچائی سے بہت قریب ہے مگر بھرپور تاثر نہیں دے سکا۔ زور قلم نے تو اس کو تین صفحے تک پھیلایا۔ ایم مبین کا افسانہ 'چارہ گری' افسانہ کم سیرت نگاری زیادہ ہے۔ آخری سطر میں افسانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ کامیابی بھی ملی لیکن ایسے افسانوں سے قاری کا دامن بھرتا نہیں۔ افسانوں کے مقابلے میں افسانوں کے تجزیے (تجزیاتی

www.taemeernews.com

مطالعے) عمدہ تنقید کے نمونے ہیں جو سیر حاصل ہیں۔ اک ذرا عسکری کے ضمن میں اظہار خضر کے مکالمے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

● قنبر علی، بھاگل پور، بہار

● ذہن جدید کا شمارہ ۵۲ کافی دن پہلے ملا بہت خوب صورت ہے۔ اس میں شامل منتخب تخلیقات متاثر کرتی ہیں۔ مجھے لطف الرحمٰن صاحب کا مضمون 'مابعد نو آبادیاتی جارحیت' بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ تجزیاتی مطالعے بھی خوب ہیں۔ آپ کا میگزین بھرپور اور بسیط ہے کیونکہ یہ ادب کے علاوہ باقی فنون لطیفہ پر بھی محیط ہے۔ یہی اس رسالے کی امتیازی خصوصیت اور شان ہے۔

● رفیق راز، سری نگر

● ذہن جدید دن بدن اپنے کو بہتر بناتا جا رہا ہے۔ جلد سازی اور اس پر حبیب تنویر کی تصویر بہت اچھی لگی۔ ابھی حال کا ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں۔ ایک صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔ نام ہے مسٹر عالم انہیں میں نے ذہن جدید کا شمارہ پڑھنے کو دیا تو کہنے لگے کہ مجھے اردو بہت کم آتی ہے میں تو ایک صفحہ ۵ منٹ میں پڑھ پاؤں گا۔ بہت تعجب ہوا کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ بھی اردو سے اتنے بے گانہ ہیں۔ تو میرا یہ کہنا ہے کہ سرکار تو اپنی سیاسی مجبوریوں کے زیر اثر اردو زبان کے فروغ کے لئے ادارے بنا رہی ہے مگر اس کا کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لئے آپ جیسے Intellectvals لوگوں کو کچھ سوچنا پڑے گا اور سرکار کو بھی اس سلسلہ میں بجھاؤ بھیجنے ہوں گے۔ تبھی شائد کئی بات بن پائے۔

● پن چندر۔ دہلی

● اس بار شعری حصہ بہت مختصر ہے مگر جوش کی رباعیوں نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ مضامین اور افسانوں کا معیار بہت بلند ہے۔ مجھے مسعود اشعر کا افسانہ چھتری، بہت پسند آیا مختصر چھوٹے چھوٹے معنیٰ خیز جملے قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے میں کامیاب رہے۔ شناخت کا مسئلہ اپنے آپ میں ایک بڑا مسئلہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ شناخت ذات کی نہیں اپنے آپ (یعنی اپنے ہونے کی) کی ضروری ہے۔

● شاہد عزیز، اودے پور

● ذہن جدید کا تازہ شمارہ ۵۲ دیکھا سرورق بہت خوبصورت اور معنیٰ خیز ہے۔ ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والی چند لائق مطالعہ کتابیں، کے تحت آپ نے جن کتابوں کا عکس پیش کیا ہے، اس میں زبردست جدت ہے۔ آپ نے اس کمترین کی کتاب 'لاوا' کو بھی اس میں رکھا ہے۔ یہ آپ کی بے پناہ محبت اور یکساں سلوک روا رکھنے کی مثال ہے نئی کتابوں کو سرورق پر نمایاں کرنے کا بے لوث کام ذہن جدید ہی کر سکتا تھا۔ ذہن جدید ایک مکمل رسالہ ہے۔ فنون لطیفہ کی تمام چیزوں کا خیال رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس میں آپ کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہوگی، یہ آپ ہی کا کمال ہے۔ مسعود اشعر اور نعیم کوثر کی کہانیاں خوب ہیں۔ افسانوں کے تجزیاتی مطالعے بھی اچھے ہیں۔ مضامین

www.taemeernews.com

میں لطف الرحمٰن اور سید بشارت علی کے مضامین پڑھ پایا ہوں۔ لطف الرحمٰن بھائی کی غزل بھی خوب ہے۔ اتنے جینوین آدمی کی چیزیں مزہ دے گئیں بعض مشمولات تو اتنی قیمتی اور معلوماتی ہیں کہ میں سخت حیرت زدہ ہوں۔

● رحمان شاہی، پٹنہ

● یوں تو آپ ہمیشہ ہی ذہن جدید کے اوراق پر کچھ نہ کچھ جدید مواد پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ تو چونکا ہی دیا۔ وفاتیے اردو والوں کے لئے نہ صرف نیا عنوان ہے بلکہ اس عنوان کے تحت لکھی گئی تحریریں بھی کافی دلچسپ ہیں کہ اس کے حوالے سے ہم فرضی متوفی کی ذات کے نہاں خانوں کی سیر بھی کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی آج ہم جس ماحول میں سانسیں لے رہے ہیں وہاں رونے کے لئے بھی پی آر کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ دیکھا جائے تو کسی قلمکار کی موت پر واقعی غم منانے والا اس کے تعلقات عامہ کے طبقہ کا ہی کوئی فرد ہوتا ہے۔ رہ گیا اس کا لکھا پڑھا تو وہ پہلے ہی کاغذ کی مار جھیل چکا ہوتا ہے۔ اس موقع پر میرا اپنا ہی ایک شعر بار بار نوک قلم پکڑ رہا ہے آپ بھی سن لیجئے۔

ہماری موت پہ روئے گا کون کون ضیا ذرا بتایئے کس کس سے بات ہوگئی ہے

● ضیا فاروقی، بھوپال

● سکندر احمد صاحب کا مضمون قرۃ العینیت، معرکے کا ہے اس میں قرۃ العین اور ان کے فن کو نئے انداز سے دیکھا گیا ہے۔ لب فکشن کے مسند ناقدوں کو اپنے اوزار ممکن ہے نئے سرے سے سجانے پڑیں لیکن مضمون میں بعض مقامات پر مسائل الجھ بھی گئے ہیں۔ مثلاً (یہاں شکایت سکندر احمد سے نہیں Barbeare douns berry) سے ہے) انہوں نے Creative non-fiction کے لئے چار چیزیں لازمی قرار دی ہیں۔

۱۔ موضوع کا حقیقی دنیا میں دستاویزی حیثیت کے قابل ہونا۔

۲۔ تحقیق پر مبنی اور قابل تصدیق ہونا

۳۔ Scene پر مبنی ہونا۔

۴۔ زبان و بیان کی نوعیت ایسی ہو کہ تحریر کا زبردست فنکاری کا نمونہ معلوم ہونا۔

قطع نظر اس کے کہ تیسری شق میں سین میری سمجھ میں نہیں آیا اور باقی تینوں میں بھی کسی قدر باہمی تضاد کا بھی احساس ہوا۔ یہ شرائط ایسی ضروری ہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ ایک سوال ذہن میں یہ سر اٹھاتا ہے کہ کیا 'دستاویزی حیثیت'' ذہن کو 'بھونڈی ''حقیقت پسندی'' کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ مجھے تو ان چاروں شرائط میں۔ بشرطیہ سین سے مراد منظر نامے کے علاوہ کچھ اور نہ ہوں Creative non-fiction کا صرف قابل تصدیق ہونا ہی اہم معلوم ہوتا ہے کیوں کہ باقی تینوں چیزیں بھی اس کی گرفت میں آجاتی ہیں۔ لیکن معلوم نہیں کہ اس متعلقہ نکتہ پر غور کیا گیا ہے یا نہیں کہ صرف قضیہ

www.taemeernews.com

(Proportion) ہی قابل تصدیق ہی سے (Verifiable) ہوسکتا ہے اور فکشن میں Verifiablity فن پارے کے دوسرے عناصر سے ہم آہنگی ممکن ہوتی ہے، باہر سے نہیں ہونا بس یہ ضروری ہے کہ وہ خارجی دنیا اور اس کے رشتوں کو مسترد نہ کرے۔

سکندر احمد نے نیر مسعود صاحب کی تخلیقات کے کشف کا ذکر کیا ہے۔ میں نے حال ہی میں ان کے افسانوی مجموعے 'گنجفہ' کے سارے افسانے دوسری بار اور ان میں سے چند تیسری بار پڑھے اور ایک آدھ افسانے کے علاوہ مجھے کسی کے بارے میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ انہیں پہلے پڑھ چکا ہوں۔ یہ افسانے کی ایک بڑی خوبی ہوسکتی ہے اور اسے ان کی تخلیقی جہات میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے چھوٹی، بظاہر غیر اہم چیز کو بڑی کر کے دکھانے کی قوت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ خیال بھی ہوا کہ ان افسانوں کو یاد کیسے رکھا جائے گا، کن حوالوں سے ان میں حوالوں کی وہ نوعیت نہیں جو ''بڑے خاندان کے آثار'' اور ''طاؤس چمن کی مینا'' میں ہیں۔ ان افسانوں میں (گنجفہ اور دست شفا' کے علاوہ) خارج کی وہ دنیا جسے حوالوں سے یاد رکھا جائے بہت ہی کم ہے۔ اسے اپنے اندرون میں ڈوبنے اور واقعات کے رشتے بالکل داخلی طور پر قائم کرنے کا عمل بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں میں شناخت کے نکات بھی داخلی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی اس نئی جہت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک بات اور: 'آگ کا دریا' میں شعور کی رو کی موجودگی پر زور دینا اب ایک لاحاصل عمل ہے۔ حال ہی میں ایک مضمون میں 'آگ کا دریا' میں شعور کی رو کے عمل دخل پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ فرض کیجئے کہ قرۃ العین حیدر نے یہ تکنیک استعمال کی ہے یا یہ کہ ان کا یہ دعوا غلط ہے کہ وہ 'آگ کا دریا' لکھتے وقت اس طریق کار سے واقف بھی نہ تھیں تو کیا اس سے اس ناول کی قدر و قیمت کم یا زیادہ ہوجائے گی؟

شعور کی رو کی تکنیک کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی شاید مفید ہو کہ فکشن میں اس طریق کار کا استعمال دراصل شعور کی رو کی نقل یا زبان کو اس کے مطابق بنانے کی جانی بوجھی کوشش کا نتیجہ ہے اور نقل کے اس عمل میں اصل غائب ہوجاتی ہے۔ بغرض محال کوئی ایسا آلہ دریافت ہوجائے جو شعور کی رو کو اپنی گرفت میں لے لے تو ہوگا یہ کہ جہاں آلہ فٹ کیا، شعور ہی شعور رہ جائے گا اور رو لاپتہ ہوجائے گی۔

اور بھائی 'یہ زائد از راوی' اور 'زائد از قاری' کی اصطلاح سے ذہن Super narrator اور super reader کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں ان کے لئے مہاراوی اور مہا قاری زیادہ مناسب ہوگا، اگرچہ ان سے تخلیق کی قدر شناسی کے عمل میں شاید ہی فرق پڑے۔ پھر یہ بھی تو سوچنا

www.taemeernews.com

ہے کہ super-narrator کی شناخت تو ممکن ہے Super reader کو کیسے تلاش کیا جائے گا۔ سکندر احمد کا مضمون پڑھ کر جو دو ایک باتیں ذہن میں آئی لکھ دیں۔ اس سلسلے میں کوئی بحث چل پڑی تو میں اس کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ ● عابد سہیل، لکھنؤ

● ذہن جدید میں ہندی اور اردو تھیٹر کے تعلق سے ہمیشہ ہی قابل لحاظ مواد شامل ہوتا ہے۔ شمارہ ۵۲ اور ۵۳ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہیں۔ اس بار کے افسانوں میں ہر افسانہ اپنی ایک الگ تخلیقی زبان رکھتا ہے۔ مختصر افسانہ ڈرامے سے بے حد قریب ہوتا ہے چنانچہ کبوتر بازی (مدن مراری لال) زوال جسم سے پہلے (رضوان الحق) اور بڑے پاپا (جاوید صدیقی) ایسی تحریریں ہیں جن میں اسٹیج کئے جانے کے بھرپور امکانات موجود ہیں۔

یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ گذشتہ چند سالوں میں پریم چند، منٹو، عصمت چغتائی، ہرشنکر پرسائی، پطرس، رضیہ سجاد ظہیر، وغیرہ کی کہانیوں رخاکوں کو نصیر الدین شاہ، نادرہ ظہیر ببر، مجیب خاں، اور دوسرے رنگ کرمی اسٹیج کر رہے ہیں جن میں داستان گوئی، کتھا کتھن اور Adaptation کی تکنیک کو کامیابی سے برتا گیا ہے۔ تینوں خودنوشت وفاتیے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ نثر نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ اگر اس قبیل کی تحریروں کی Modalites طے کر لی جائیں تو انشائیہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ ویسے کیونکہ یہ وفاتیے جیتے جی لکھے گئے ہیں، ہم انہیں 'سمادھیے' بھی کہہ سکتے ہیں۔ آگ کا دریا کے حوالے سے قرۃ العین حیدر پر سکندر احمد کا مضمون ان معنوں میں بے فیض ہے کہ وہ قاری یا سپر قاری کو تہذیبی، تاریخی، ثقافتی، یا فلسفیانہ — کسی بھی سطح پر ناول پڑھنے کی ترغیب دلانے سے قاصر ہے۔ قرۃ العینیت کی اصطلاح بھی کچھ جچی نہیں۔ حبیب تنویر کو کچھ سال پہلے ممبئی کے نہرو سینٹر میں پرفارم کرتے دیکھا تھا۔ ۸۰ سال کی عمر میں بھی ان کی Stage presence بے پناہ تھی۔ انہوں نے ڈرامے کے سارے elements کو لوک شیلی میں گوندھ کر جس سہتا سے پیش کیا، وہ انہی کا حصہ ہے۔ ہندستانی تھیٹر کی تاریخ میں وہ بجا طور پر ایک لیجنڈ کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے۔ صدیق عالم کے افسانوں (لیمپ جلانے والے) پر ظہیر انور نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

عالمی ادب پر اپ ڈیٹ، تراشے، اور ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ بے حد informative ہے۔

شاعری بھی حسب ذائقہ ہے۔ آپ کے مختصر نوٹس کے ساتھ جوش اور فراق کی رباعیوں کے تقابلی مطالعے نے اور ہی لطف دیا۔

مائیکل جیکسن کی موت نے کئی عالمی سطح کے فن کاروں کی موت کی خبر کو دھندلا دیا۔ امید ہے ذہن جدید میں استاد علی اکبر خاں، گنگو بائی ہنگل، طیب مہتہ کے فن اور شخصیت کے بارے میں آئندہ پڑھنے کو ملے گا۔ یوسف ناظم کی شفقتیں بھی یاد آتی ہیں۔ ● عطاء الرحمٰن طارق، ممبئی

www.taemeernews.com

اردو اکادمی دہلی

(دہلی سرکار)

کلاسیکی ادبا، و شعرا، کے مونوگراف

سادہ اور شگفتہ اسلوب میں دہلی کے ادب عالیہ کے مندرجہ ذیل نمائندہ ادیبوں اور سخنوروں کے بارے میں مونوگراف کی تیاری عمل میں آچکی ہے۔ یہ ان باشعور اور خوش ذوق طلبا، کے لیے کارآمد ہیں جو ادب عالیہ کے مطالعہ کا شوق اور جذبہ رکھتے ہیں، لیکن ضخیم اور قیمتی کتابوں کے متحمل نہیں ہیں۔ ہر مونوگراف کا تقریباً دو تہائی حصہ ادیب یا شاعر کی زندگی کے مستند حالات، تصانیف اور تصنیفی زندگی کے محرکات پر مشتمل ہے اور تقریباً ایک تہائی حصہ میں اس کی تخلیقات کا ایک جامع انتخاب شامل ہے۔

شخصیت	مصنف	صفحات	قیمت
سرسید احمد خاں	پروفیسر افتخار عالم خاں	۱۲۰	۳۰ روپے
شیخ ظہور الدین حاتم	پروفیسر عبدالحق	۱۲۰	۳۰ روپے
شیخ محمد ابراہیم ذوق	مخمور سعیدی	۱۳۲	۳۰ روپے
محمد حسین آزاد	پروفیسر عتیق اللہ	۱۸۰	۵۰ روپے
مرزا غالب (شاعری)	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۱۲۸	۳۰ روپے
میر امّن	پروفیسر ابن کنول	۱۵۲	۴۰ روپے
شاہ نجم الدین مبارک آبرو	پروفیسر خالد محمود	۱۲۸	۳۰ روپے
میر ناصر علی دہلوی	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	۱۲۸	۳۰ روپے
مرزا غالب (مکتوب نگاری)	ڈاکٹر خالد اشرف	۱۲۸	۳۰ روپے
خواجہ الطاف حسین حالی	ڈاکٹر شہزاد انجم	۱۵۶	۴۰ روپے
مومن خاں مومن	ڈاکٹر توقیر احمد خاں	۱۲۰	۳۰ روپے
قائم چاند پوری	ڈاکٹر خالد علوی	۲۶۴	۱۰۰ روپے
[illegible] محمد رفیع سودا	ڈاکٹر مطیع احمد	[illegible]	۵۰ روپے
میر اثر	ڈاکٹر مولا بخش	۱۱۲	۳۰ روپے
بہادر شاہ ظفر	ڈاکٹر نگار عظیم	۱۲۰	۳۰ روپے
[illegible] دہلوی	ڈاکٹر کوثر مظہری	۱۲۸	۳۰ روپے
ڈپٹی نذیر احمد	ڈاکٹر جمیل اختر	۱۹۲	۵۰ روپے

رابطہ: اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
Phone : 23865436, 23863858, 23863566, 23863697

www.taemeernews.com

نوٹ بک

سلسلۂ روز شب

● پچھلے دنوں پروفیسر شکیل الرحمٰن اور شاعر بلراج کومل کے گھروں مین ان کی غیر موجودگی میں چوروں نے ایسی لوٹ مار کی کہ سب کچھ لے گئے یوں سمجھئے دونوں ادیبوں کی زندگی بھر کی کمائی تھوڑے سے وقفے میں لوٹ لی گئی کہ گھروں میں کچھ بھی نہ بچا اس عمر میں بے سروسامانی کے اس سانحے کو ان پیارے دوستوں نے نہایت پامردی اور ہمت سے برداشت کیا جو قابل تحسین ہے۔

● اس روز محمود ہاشمی کے دفنانے کے موقع پر بلراج مین را کو دیکھ کر جی تو خوش ہوا مگر دبلا پتلا مین را بار بار اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتا ہوا بڑی حد تک لب بستہ رہا جب حافظے میں ابھرنے والے محمود ہاشمی کے ان گنت نہ بھلائے جانے والے پیکر، مین را کی آنکھوں میں تیرتے تیرتے تھم گئے تو مین را اپنی کمزور آواز میں کہہ اٹھا ''محمود کو بھولنا ممکن نہیں — یہ ظالم ایک دریچے سے نہیں ناسٹلجیا کی نہ جانے کتنی کھڑکیوں سے جھانکتا ہوا مجھ میں ہل چل مچا دیتا ہے'' اردو کے افسانوی ادب کو 'مقتل' جیسا شاندار افسانوی مجموعہ دینے والے مین را نے بڑے صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ تنفس کی بیماری پر اس بار بھی قابو پالیا ہے دعا ہے کہ وہ پھر ادبی کارزار میں اپنے ممتاز باغی امیج کے ساتھ پھر سے شریک ہو جائے۔ زندہ باد مین را۔

● نیر مسعود نے جب سرسوتی سمان حاصل کیا تھا تو وہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے بیماری نے انکے جسم سے حرکت و حرارت اس حد تو چھینی کہ خارجی سرگرمیوں سے ان کا رشتہ کٹ گیا مگر وہ ان سے ان کا تخلیقی ذہن نہ چھین سکی اس عرصے میں وہ کسی نہ کسی طرح جسم کو اذیت میں ڈال کر کہانیاں لکھتے رہے اب انہوں نے ادھر کے برسوں میں لکھے اپنے افسانوں کو 'گنجفہ' کے نام سے بڑے دلکش ڈھنگ سے چھاپ دیا ہے امید ہے کہ ہندستان میں شائع ہونے والا ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ پسند کیا جائے گا۔

● اقبال متین نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'اجلی پرچھائیاں' سے جو ادبی پہچان بنائی تھی وہ کسی مقام پر نہ رُکی اور نہ تھمی وہ برابر لکھتے رہے عمر کی کہنگی اور کئی رنگ کی بیماریوں نے انھیں چلنے پھرنے سے بڑی حد تک روک دیا وہ سہارا لئے بغیر نہیں چل سکتے مگر اسّی برس سے اوپر عمر پانے والے اقبال متین کے حافظے میں ادبی احوال اور سروکار صاف و شفاف لہروں کی صورت ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں۔

● مرتب

www.taemeernews.com

سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن

(وزارت صحت وخاندانی بہبود، حکومت ہند)

جواہر آیوش بھون ۶۵۔ ۶۱، انسٹی ٹیوشنل ایریا، روبرو، ڈی بلاک، جنک پوری، نئی۔ ۱۱۰۰۵۸

فون: 28521981, 28525715، فیکس: 28522965، ای میل: unanimedicine@gmail.com

اہل علم حضرات سے اپیل

طب یونانی ہمیشہ سے مشرقی علوم کا ایک اہم حصہ رہی ہے جس کے فروغ وارتقاء میں عرب وایرانی طبیبوں اور فلسفیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ طب یونانی کا قدیم لٹریچر عربی اور فارسی زبانوں میں محفوظ ہے۔ یہ سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں پھیلا ہوا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف سطحوں پر یہ کوشش کی جاتی رہی ہیں کہ طبی مخطوطات ونادر کتابوں کے بارے میں اطلاعات اور اعداد وشمار دستیاب ہوں۔ اس کام میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ مشہور کتب خانوں کے کیٹلاگ میں طب وسائنس کے ذیل میں طبی مخطوطات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن غیر معروف کتب خانوں، مدارس اور ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات کے باقاعدہ اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان سے استفادہ مشکل ہے۔ ان مخطوطات کی نشان دہی اور دستیابی کے علاوہ جدید طریقوں سے ان کا تحفظ بھی بہت ضروری ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر حکومت ہند نے شعبۂ آیوش، وزارت صحت وخاندان بہبود کے زیر نگرانی اس قسم کے مخطوطات کے سروے اور ڈجی ٹائزیشن کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا ہے کہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی جانب سے قومی سطح پر اس کام کے لیے تحریک شروع کی جائے۔ معروف کتب خانوں میں موجود مخطوطات بہت حد تک محفوظ ہیں اور ان تک رسائی بھی نسبتاً آسان ہے لیکن غیر معروف کتب خانوں، مدارس، خانقاہوں اور ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات تک پہنچنے کے لیے ہمیں آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے کونسل آپ سے درخواست کرتی ہے کہ درج ذیل معلومات فراہم فرمائیں۔

☆ ایسے سرکاری یا غیر سرکاری کتب خانوں، مدارس وخانقاہوں اور ذاتی ذخیروں کی نشان دہی فرمائیں جہاں طبی مخطوطات موجود ہیں۔ اگر مخطوطات کی لسٹ فراہم ہو سکے تو بہت بہتر ہے۔

☆ اگر کسی جگہ مخطوطات کا ان کی اصل صورت اور Digitized شکل میں تحفظ ہوا ہے تو اس سے متعلق تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔

☆ مخطوطات کے شائع شدہ کیٹلاگ کی تفصیلات فراہم فرمائیں۔

☆ طبی مخطوطات ونایاب کتب کی نشان دہی اور دستیابی سے متعلق مفید مشوروں سے نوازیں۔

طب یونانی اور مشرقی علوم کی بازیافت میں آپ کے گراں قدر تعاون کے لیے کونسل ہمیشہ شکر گزار رہے گی۔

طبی مخطوطات کی بازیافت کے موضوع پر ایک ورکشاپ عنقریب نئی دہلی میں منعقد کی جائے گی جس میں ماہرین فن موضوع کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کریں گے۔ اس ورکشاپ کا مقصد مخطوطات کی مہم کے لیے ایک جامع خاکہ تیار کرنا ہے۔ قارئین میں سے جن حضرات کے پاس اس حوالہ سے مفید معلومات ہوں، کونسل ورکشاپ میں ان کو خوش آمدید کہتی ہے۔ ورکشاپ کے انعقاد کی تاریخ کا اعلان جلد ہی کیا جائے گا۔

خادم طب

ڈاکٹر محمد خالد صدیقی

ڈائرکٹر جنرل

www.taemeernews.com

ساہتیہ اکادمی کی قابلِ مطالعہ کتابیں

نئی کتابیں

اور اس وقت حصہ اول	(بنگالی ناول)	مصنف: سنیل گنگوپادھیائے/ترجمہ: شبیر احمد	350روپے
ہندوستانی افسانے		ایڈیٹر: ای وی راما کرشنن چیف ایڈیٹر: مغنی تبسم	250روپے
ہینس اینڈرسن کی کہانیاں (دو جلدوں میں)		ترجمہ: ایس اے رحمٰن	300روپے
خیابانِ خلیل		نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل مرتب: مخمور سعیدی	80روپے
درد کی حد سے پرے		(انتخاب کام اختر الایمان) مرتب: بیدار بخت	150روپے
کلیات جذبی		شاعری معین احسن جذبی	150روپے
میراجی		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) شافع قدوائی	25روپے
آل احمد سرور		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) امتیاز احمد	25روپے
سجاد ظہیر		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) قمر رئیس	25روپے
سید احتشام حسین		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) شہزاد انجم	40روپے
عبدالعلیم		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) عابد سہیل	25روپے
رشید جہاں		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) ارتضیٰ کریم	40روپے
اسرار الحق مجاز		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) شارب ردولوی	40روپے
آر کے نارائن		(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز) رنگا راؤ/شافع قدوائی	40روپے
علی سردار جعفری		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
انیس اور دبیر۔ دو صد سالہ سیمینار		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
ولی دکنی۔ تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
فراق گورکھپوری		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	300روپے
آزادی کے بعد اردو فکشن		سیمینار مرتب: ابوالکلام قاسمی	150روپے
بیسویں صدی میں اردو ادب		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے
سجاد ظہیر (ادبی خدمات)		سیمینار مرتب: گوپی چند نارنگ	200روپے

تصانیف مولانا ابوالکلام آزاد

خطبات آزاد		ابوالکلام آزاد	80روپے
تذکرہ	100روپے	ترجمان القرآن (چار جلدوں میں)	600روپے
خطوط ابوالکلام آزاد	100روپے	غبارِ خاطر	100روپے

فکشن

کھوئے ہوئے معنی	(پنجابی ناول)	مصنف: نیر نجن سنگھ تسلیم/ترجمہ: منظور حسین	125روپے
تیسرا مہمان	(افسانے)	مصنف: منوج داس/ترجمہ: نامی انصاری	250روپے
جھاڑا جھڑتی (مراٹھی انعام یافتہ)	وشواس پاٹل	ترجمہ: ساجد رشید	250روپے
سانپ اور رسی (انگریزی انعام یافتہ)	راجا راؤ	ترجمہ: بلراج کومل	180روپے
بری سمپکے (انعام یافتہ کنڑ ڈرامہ)	چندر شیکھر کمبار	ترجمہ: ماہر منصور	75روپے

● رابطہ: ساہتیہ اکادمی سیلز آفس، 'سواتی' مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

فون 23745297 ،223364207 فیکس: 23364207، ای میل: sahityaakademisales@vsnl net

www.taemeernews.com

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کی تازہ ترین مطبوعات

عبدالعلیم: منتخب تحریریں
مرتبہ: عابد سہیل

ڈاکٹر عبدالعلیم کا شمار ان معدودے چند دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے برصغیر کے لوگوں کو فکر کی ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ 1934 میں انھوں نے سجاد ظہیر، پرکاش نرائن اور نمبودری پاد کی معیت میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور 1936 میں سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین اور حکومت ہند کے مشیر اردو بھی تھے۔

ISBN 978-81-237-5311-9 قیمت: 95.00

نظیر اکبرآبادی (منتخب شاعری)
مرتبہ: ابن کنول

شاعری میں نظیر ایک خاص طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ نظیر ورڈ سورتھ کی طرح فطرت کے شاعر تھے۔ نظیر نے عام آدمی کے احساسات و جذبات کی عکاسی کر کے شاعری کو مقصدیت عطا کی اور انھوں نے شاعری کو زندگی سے قریب کر دیا۔ اس انتخاب کے مرتب پروفیسر ابن کنول اردو کے نامور نقاد، محقق اور افسانہ نگار ہیں۔

ISBN 978-81-237-5352-2 قیمت: 60.00

کالی رات (فسادات کے افسانے: ایک انتخاب)
مرتب: زبیر رضوی

ہندوستان کی تقسیم اور پانچ ہزار برسوں سے زیادہ کی تہذیب کے وارث ہندوستان میں نوآبادیات کا خاتمہ اور برصغیر کے آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی تقسیم کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا ہے اس نے انسانی جانوں پر بڑے گہرے زخم چھوڑے۔ زیر نظر انتخاب میں ملک کی تقسیم، اس کی آزادی اور پانچ دریاؤں کی سرزمین پر خون کے چھٹے دریا کی طوفان خیزی نے ادیبوں کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ISBN 978-81-237-5353-9 قیمت: 120.00

میرے جیون کی کچھ یادیں
زیڈ۔ اے۔ احمد

ترجمہ: شمس اقبال

''ڈاکٹر احمد کی یہ سوانح ایک عظیم کمیونسٹ لیڈر کی یادوں کا ایسا سفرنامہ ہے، جو غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور جغرافیہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کر دیتی ہے۔'' اے۔ بی۔ بردھن

قیمت: 110.00

ابوالکلام آزاد: نادر تحریریں
مرتب: محمد شاہد حسین

مولانا ابوالکلام آزاد ایک متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ یہ تنوع ان کی تحریروں میں بھی ہر جگہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ زیر نظر انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ موضوعات کی رنگا رنگی یہاں بھی باقی رہے اور ان سے مولانا کی تخلیقی صلاحیت اور علمی و مذہبی و سیاسی بصیرت کا اندازہ بھی ہو جائے۔

ISBN 978-81-237-5387-4 قیمت: 100.00

ڈبرے پر سورج کا بم
مترجم: اظہار عثمانی مرتب: چندرکانت دیوتالے

ہندی کے عظیم قلم کار رکمنی بودھ کی نمائندہ نثر کا مجموعہ ہے۔

ISBN 978-81-237-5525-0 قیمت: 130.00

کملیشور کی نمائندہ کہانیاں
مترجم: ایس، اے، رحمٰن

ہندی کے عظیم قلم کار کملیشور کی نمائندہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

ISBN 978-81-237-5570-0 قیمت: 130.00

فرقہ پرستی: ایک مطالعہ
وپن چندرا

ترجمہ: شمس اقبال

ہندوستان اور ہندوستانیوں کو درپیش فرقہ پرستی آج سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہمارے جمہوری ڈھانچے اور مقامی اتحاد کو فرقہ پرستوں کی جانب سے سنگین خطرہ ہے۔ اس کتاب میں فرقہ پرستی کے آغاز و ارتقا کے مختلف پہلوؤں کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے یہ جائزہ پیش کیا گیا ہے کہ فرقہ پرستی بنیادی طور پر ایک اصول اور ایک طرز فکر ہے۔ لہٰذا اس سے اسی بنیاد پر نپٹنا ہوگا۔

ISBN 978-81-237-2582-3 قیمت: 45.00

سارے جہاں سے اچھا... اقبال کی منتخب شاعری
مرتب: عبدالحق

علامہ اقبال حکیم، فلسفی، مصلح اور دانائے راز تھے۔ ان کی شاعری پر ان کے اصلاحی، انقلابی اور تجدیدی اثرات اور فلسفیانہ خیالات چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری الہامی ہے اور ان کا پیغام آفاقی و عالمگیر ہے جو دنیا کے ہر ملک و قوم اور عقیدہ و مذہب کو ماننے والے کے لئے ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی اہم نظموں اور چند غزلوں کا انتخاب ہے۔

قیمت: 65.00

مزید جانکاری کے لئے لکھیں: منیجر (سیلز اینڈ مارکیٹنگ)

National Book Trust, India

Nehru Bhawan, 5 - Institutional Area, Phase II Vasant Kunj

New Delhi-110070 Email nbtindia@ndb vsnl.net.in Website www.nbtindia.org in

www.taemeernews.com

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

۱۔	دیوانِ غالب (اُردو)		اسداللہ خاں غالب	۱۰۰/روپے
۲۔	دیوانِ غالب (اُردو) ڈیلکس		اسداللہ خاں غالب	۱۵۰/روپے
۳۔	دیوانِ غالب (ہندی) پاکٹ	مرتبہ :	نور نبی عباسی	۳۵/روپے
۴۔	دیوانِ غالب (ہندی) ڈیلکس	مرتبہ :	نور نبی عباسی	۱۰۰/روپے
۵۔	تماشہ میرے آگے	مصنف:	جناب زبیر رضوی	۲۰۰روپے
۶۔	خطوطِ غالب (پانچ جلدوں میں)	مرتبہ:	ڈاکٹر خلیق انجم	۸۳۰روپے
۷۔	انیس و دبیر	مصنف:	پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی	۳۰۰روپے
۸۔	یادگارِ غالب (اردو)	مصنف:	الطاف حسین حالی	۲۰۰روپے
۹۔	فہمیمِ غالب	مصنف:	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	۲۵۰روپے
۱۰۔	غالب پر چند مقالے	مصنف:	پروفیسر نذیر احمد	۶۰روپے
۱۱۔	سید احتشام حسین	مرتبہ	شاہد ماہلی	۴۰روپے
۱۲۔	نقش ہائے رنگ رنگ	مصنف:	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	۱۵۰روپے
۱۳۔	تلاشِ غالب	مصنف:	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۰۰روپے
۱۴۔	افکارِ غالب	مرتبہ:	خلیفہ عبدالحکیم	۲۰۰روپے
۱۵۔	ذوق دہلوی	مرتبہ:	شاہد ماہلی	۱۰۰روپے
۱۶۔	غالب اور فنونِ لطیفہ	مصنف:	زبیر رضوی	۱۲۰روپے
۱۷۔	بہادر شاہ ظفر	مرتبہ:	پروفیسر نذیر احمد	۱۰۰روپے
۱۸۔	نقشِ نیم رخ	مصنف:	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۱۲۰روپے
۱۹۔	غالب (انگلش)	مصنف:	سید عبداللطیف	۱۰۰روپے
۲۰۔	غالب (اردو)	مصنف:	سید عبداللطیف	۱۰۰روپے
۲۱۔	دیوان غالب (انگلش)	مرتبہ:	ثروت رحمان	۷۰۰روپے
۲۲۔	غالب جدید تنقیدی تناظرات	مصنف:	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	۲۰۰روپے
۲۳۔	غالب کی تنقیدی حسیت	مصنف:	پروفیسر شمیم حنفی	۲۰۰روپے
۲۴۔	غالب کی چند فارسی تصنیف	مرتبہ	پروفیسر حنیف نقوی	۲۰۰روپے
۲۵۔	غالب کا سفرِ کلکتہ	مصنف:	ڈاکٹر خلیق انجم	۳۰۰روپے
۲۶۔	کلیات غالب فارسی ویلوم۔۱	مصنف:	ڈاکٹر تقی عابدی	۶۰۰روپے
۲۷۔	کلیات غالب فارسی ویلوم۔۲	مصنف:	ڈاکٹر تقی عابدی	۴۰۰روپے
۲۸۔	تمنا کہیں جسے	مصنف:	پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۰۰روپے
۲۹۔	غالب اور شاہانِ تیموریہ	مصنف:	ڈاکٹر خلیق انجم	۲۵۰روپے

ملنے کا پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

ناشر پروفیسر عتیق احمد صدیقی ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے مرزا پرنٹر خاری باؤلی دہلی سے چھپوا کر ۱۷۹/۸۹ ذاکر نگر نئی دہلی۔۲۵ سے شائع کیا

www.ghalibinstitute.com Email: ghalib@vsnl.net

www.taemeernews.com

राष्ट्रीय नाट्य विद्यालय

के महत्त्वपूर्ण प्रकाशन

नये प्रकाशन

प्रवासी की कलम से : बालेश्वर अग्रवाल	अनु. प्रतिभा अग्रवाल	300.00
प्रभावी नाटक और रंगमंच की एक सदी	सतीश कुमार वर्मा	125.00
नमिचन्द्र जैन	भट्टाराक्षस	125.00
रंग दस्तावेज : सौ साल (दो खंडों में)	सं. महेश आनंद	2500.00
उर्दू थिएटर कल और आज	सं. मख़मूर सईदी, अनीस आज़मी	250.00
रंग रचाव	भारत रत्न भार्गव	250.00
नुक्कड़ नाटक : रचना और प्रस्तुति	प्रसन्ना	175.00
रंग भूमिकाएं	भट्टाराक्षस	150.00
भारतीय रंग कोश भाग-2	प्रतिभा अग्रवाल	400.00
परम्पराशील नाट्य	जगदीशचंद्र माथुर	160.00
गिरीश प्रसाद	डॉ. शरद नागर	200.00
मोहन उप्रेती : द मैन एंड हिज़ आर्ट	दीवान सिंह बजेली	300.00

विविध

कहानी का रंगमंच	सं. महेश आनंद	300.00
अंधा युग : पाठ और प्रदर्शन	जयदेव तनेजा	280.00
जयशंकर प्रसाद : रंगदृष्टि, भाग-1	महेश आनंद	350.00
जयशंकर प्रसाद : रंगदृष्टि, भाग-2	महेश आनंद	750.00
रंगभाषा	जितेंद्र रघुवंशी	300.00
पुर्जों का कथन	माओनी मित्र	150.00
सामाजिक स्तानिस्लावस्की	डॉ. सुरेश अवस्थी	400.00
भूमिका की संरचना स्तानिस्लावस्की	डॉ. विश्वनाथ मिश्र	950.00
चरित्र की रचना-प्रक्रिया स्तानिस्लावस्की	डॉ. विश्वनाथ मिश्र	300.00
अभिनेता की तैयारी	डॉ. विश्वनाथ मिश्र	300.00
बनाव चरित्र	नारायण प्रसाद 'बेताब'	95.00
कुछ आंसू कुछ फूल	जयशंकर सुंदरी/ दिनेश खन्ना	225.00
नाट्य विमर्श (मोहन राकेश)	सं. जयदेव तनेजा	195.00
अभिनय चिंतन	दिनेश खन्ना	350.00
रंगवार्ता	सं. सुरेश शर्मा	350.00
रंगमंच के सरताज पृथ्वीराज	योगराज टंडन	250.00
ग्रीक नाट्य कला कोश	डॉ. कमल नसीम	250.0
मेरा नाटक काल	कविरत्न पं. राधेश्याम कथावाचक	225.00
रंग व्यापार : कुछ टिप्पणियां	एच.सी. शर्मा	95.00
भारतीय रंग कोश, भाग-1	सं. प्रतिभा अग्रवाल	500.00
भारत रंग महोत्सव : एक परिदृश्य	सं. चंदन तिवारी	1000.00

नाटक

अंधा युग (गो. पु. देशपांडे)	अनु. वसंत देव	125.00
विक्रम सैंधव (शेक्सपीयर)	अनु. अरविंद कुमार	150.00
सत्ते (गो. पु. देशपांडे)	अनु. ज्योति सुभाष	125.00
मृच्छकटिकम् (शूद्रक)	अनु. मोहन राकेश	225.00
महाकवि कालिदास कृत शाकुंतल	अनु. मोहन राकेश	225.0
महाकवि कालिदास कृत विक्रमोर्वशीयम्	अनु. इंदुजा अवस्थी	125.00
बेगम बर्वे (सतीश आलेकर)	अनु. वसंत देव	125.00
दादी की मौत (जार्ज ब्युशनर)	अनु. जे.एन. कौशल	125.00
हिम्मतमाई (बर्टोल्ट ब्रेख्ट)	अनु. नीलाभ	150.00
एक शून्य बाजीराव (विं. वा. खानोलकर)	अनु. कमलाकर सोनटक्के	150.00
आगा हश्र काश्मीरी के चुनिंदा ड्रामे भाग-1	सं. अनीस आज़मी	550.00
आगा हश्र काश्मीरी के चुनिंदा ड्रामे भाग-2	सं. अनीस आज़मी	550.00

रंग व्यक्तित्व

शीला भाटिया	स. जे. एन. कौशल	200.00
रेखा जैन	महेश आनंद	150.00
मनोहर सिंह	जयदेव तनेजा	175.00
बी.एम.शाह	स. जयदेव तनेजा	250.00

पत्रिका

रंग-प्रसंग 2 से 4	सं. प्रयाग शुक्ल	25.00 प्रत्येक
रंग प्रसंग 5 से 36 तक	सं. प्रयाग शुक्ल	50.00 प्रत्येक

रंग प्रसंग त्रैमासिक पत्रिका के अब तक कई विशेष अंक प्रकाशित हो चुके हैं, जिनमें पारसी रंगमंच और पुतलियों, कठपुतलियों, गान रंग-मंच और माइम से संबंधित विशेष अंक उल्लेखनीय हैं।

अधिक जानकारी के लिए कृपया निम्न पते पर संपर्क करें :

विक्रय एवं प्रकाशन विभाग

बहावलपुर हाउस, भगवानदास रोड, नई दिल्ली-110001

दूरभाष : 011-23389402, 23387916, 23382821, एक्सटेंशन-61

E-mail :nsdr@rediffmail.com, Website : www.nsd.gov.in

www.taemeernews.com

مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب کی یاد میں

بڑی زبان کا زندہ رسالہ

سہ ماہی

ذہنِ جدید

ترتیب • زبیر رضوی

ZEHNE JADID **June 2009 to Aug. 2009**
Vol. 19 Post Box : 9789
ISSUE 54 P.O. New Friends Colony New Delhi-25 **INDIA**

A healthy affair...

BHEL pursues social concerns with great commitment and it shows...

BHEL's contribution towards Social Responsibility includes- Adopting villages, Holding free medical and pollution checking camps, Setting up charitable dispensaries and schools for the underprivileged and handicapped children, Contributing to natural calamity Fund and Conservation of natural resources.

BHEL's commitment towards environmental issues can be seen as an integral part of its core business. It has successfully launched products like wind electric generators, solar heating systems, solar photovoltaic systems and battery powered road vehicles.

BHEL

Bharat Heavy Electricals Limited

Regd. Office : BHEL House, Siri Fort, New Delhi - 110049
Website : http://www.bhel.com

Committed to working for a better society.

Powering progress Brightening lives
Touching Every Indian home.